خبر قبیلہ

حصہ اوّل

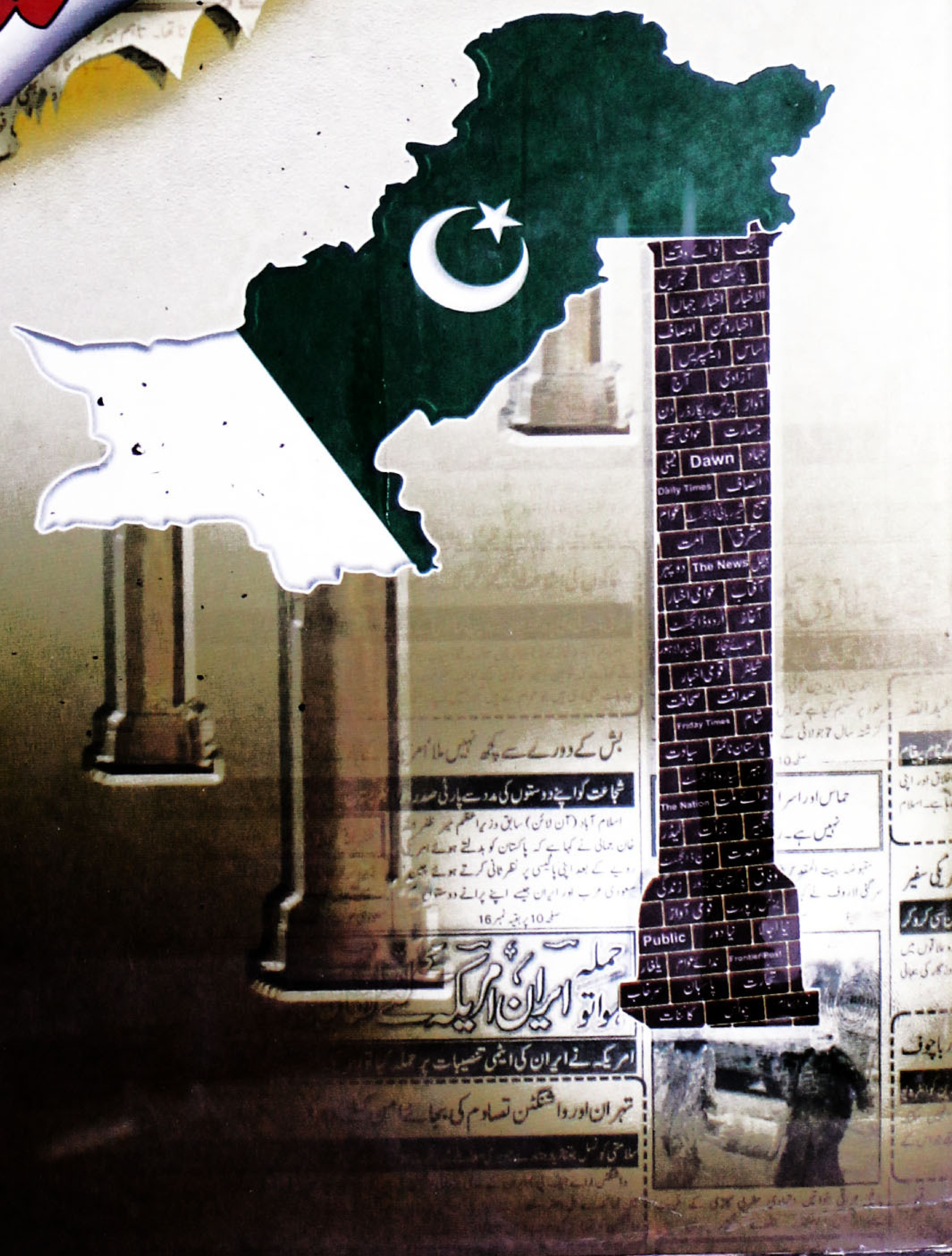

ندیم اُپل

Marfat.com

خبر قبیلہ

انٹرویو نگار

ندیم اُپل

مرتب

علامہ عبدالستار عاصم

ناشر

القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

1۔ایبٹ روڈ۔لاہور، پاکستان

0333-4393422

Marfat.com

﴾ جملہ حقوق محفوظ ہیں ﴿

نام کتاب .... **خبر قبیلہ**

انٹرویوز .... ندیم اُپل

84673

مرتب .... علامہ عبدالستار عاصم

بفیضانِ نظر .... فخر المشائخ صاحبزادہ جناب میاں جمیل احمد شرقپوری نقشبندی مجددی مدظلہ
سجادہ نشین آستانہ عالیہ شرقپور شریف شیخوپورہ

زیر سرپرستی .... جناب رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ چیئرمین رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن پاکستان

پروف ریڈنگ .... صاحبزادہ علامہ محمد طاہر تبسم قادری ناظم اعلیٰ مجلس علماء نظامیہ پاکستان

کمپوزرز .... چوہدری عمران افضل۔ مظفر علی شرف۔ چوہدری ناصر محمود۔ غازی مینارہ۔ علی اسداللہ

ٹائیٹل .... محمد طارق فیضی

ڈیزائننگ .... حافظ عبدالرزاق

سالِ اشاعت .... مئی 2006ء

تعداد: 1000

قیمت: .... 475 روپے / 25 ڈالر / 20 پونڈ

پرنٹر: .... ہنجرا پرنٹنگ پریس، کراچی

ناشر: .... سکندر بلوچ، القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل (بانی اکرام اللہ عادل)

لیگل ایڈوائزر .... رانا شہناز احمد خاں ایڈووکیٹ کالو کے 0333-4286469

فوٹو گرافر .... نعیم عباس (رائیٹر) 0333-4318026

ISBN-969-9007-001
ISBN-978-969-9007-002

پتہ برائے خط و کتابت:

القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

کمرہ نمبر 2,3۔ پی ایف ای بلڈنگ
1۔ ایبٹ روڈ۔ لاہور، پاکستان
0333-4393422

Marfat.com

فہرست

نمبر شمار	شخصیت	عنوان	صفحہ نمبر
1۔	مجید نظامی	آزادیٔ صحافت میری زندگی کا مشن ہے	35
2۔	ضیا شاہد	اپنے اندر کے ضیا شاہد کو مرنے نہیں دیا	49
3۔	مجیب الرحمٰن شامی	''پاکستان'' مجھے ''اللہ میاں'' نے دیا	67
4۔	مصطفیٰ صادق	سیکس اور سنسنی خیزی کی دوڑ میں شریک نہیں ہونا چاہتا	81
5۔	عارف نظامی	ڈمی اخبارات سرکاری چندے پر پلتے ہیں	93
6۔	ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی	عشق کے نتیجہ میں ہی دوسری شادی کی	109
7	علی سفیان آفاقی	فلم کی طرح صحافت میں بھی دو نمبر مافیا کا غلبہ ہے	123
8۔	اشفاق احمد	خاکروب قوم کا سب سے بڑا خادم ہے	137
9۔	احمد ندیم قاسمی	پورا ملک میرے مخالفوں سے بھرا پڑا ہے	143
10۔	عبدالقادر حسن	اچھا کالم نگار حکومت اور ایڈیٹر کو بیوقوف بنا کر اپنی بات کہہ جاتا ہے	155
11۔	ڈاکٹر صفدر محمود	صدر پرویز مشرف محبِ وطن پاکستانی ہیں	173
12۔	عباس اطہر	موجودہ سیاستدانوں کی لاٹ میں کوئی لیڈر نہیں	185
13۔	حسن نثار	خود کو زاہد اور عابد سمجھتا ہوں	197
14۔	عطاء الحق قاسمی	تقسیم ایوارڈ میں ہمیشہ ڈنڈی ماری جاتی ہے	209
15۔	نذیر ناجی	میں ضیاء الحق دور کا پہلا قیدی تھا	219
16۔	ڈاکٹر انور سدید	جب تک کسی ادیب کو لاہور تسلیم نہ کرے اسے ادیب شمار نہیں کیا جاتا	231
17۔	سرفراز سید	صحافی قلم کی حرمت نہ بیچتا تو ملک بڑی ترقی کرتا	247
18۔	امجد اسلام امجد	اپنے خاندان میں واحد پڑھا لکھا شخص ہوں	259
19۔	ڈاکٹر اجمل نیازی	اب ادب کا زمانہ نہیں رہا	275
20۔	عارف محمود اُپل	سیاحتی مقامات کے باسیوں کی حالتِ زار خوبصورت وادیوں پر بدنما دھبہ ہیں	287

☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

اپنی اس پہلی کاوش کا انتساب میڈیا انڈسٹری کے روح رواں، پرنٹ میڈیا کے سائبان، ترقی اردو کے عظیم علمبردار اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ،، اورینٹ ایڈورٹائزنگ ،، کے بانی جناب ایس ایچ ہاشمی (مرحوم) کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی زندگی محنت کرنے والوں کیلئے ایک کھلی کتاب کی مانند تھی آج بھی اگر کسی نے زیرو سے ہیرو بنانا ہے تو وہ جناب ایس ایچ ہاشمی (مرحوم) کی عملی زندگی کا نمونہ کو اپنے لئے مشعل راہ بنا کر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

ایک زمانہ تھا جب صحافت اور صحافی کا کردار ایک غیر جانبدار محتسب جیسا تھا جس کا کام حکومتوں کے غلط کاموں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے ان کے اچھے برے اعمال کی صحیح تصویر پیش کرنا تھا، اس دور کے اخبارات اپنی خبروں اداریوں اور تحریروں کے حوالے سے حکومتی امور اور پالیسوں پر براہ راست اثر انداز ہوا کرتے تھے، تب محض خالی تنقید یا نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی بلکہ امور مملکت میں حکومت کی صحیح سمت میں راہنمائی بھی کی جاتی تھی۔

مولانا ظفر علی خان، مولانا اختر علی خان، ان کے بعد نوائے وقت کے بانی حمید نظامی، آغا شورش کاشمیری، ظہور عالم شہید اور اس دور کے دیگر عظیم صحافیوں نے پابند سلاسل رہنا تو قبول کر لیا مگر حکومتوں کے کسی غلط کام یا اقدام میں ان کے شریک کار نہیں بنے اور اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مثلاً ایک انگریز گورنر نے جب اخبار زمیندار میں مولانا ظفر علی خان کا مضمون شائع ہونے پر اسے بند کیا اور پھر زمیندار کے قارئین نے اس زمانے میں دس ہزار روپے جرمانے کی خطیر رقم جس طرح سے چندہ کی صورت میں اکٹھی کر کے اخبار زمیندار کی بندش کو ختم کروایا اس سے ایک عظیم صحافی کی جرأت مندی اور عوام میں اس کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تاہم یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ پاکستان میں جہاں بدقسمتی سے زیادہ تر فوجی اور غیر نمائندہ حکومتیں رہیں وہاں بعض اخبارات اور ان کے مالکان کا کردار بھی متنازعہ رہا جس پر عوام نے جیل میں جانے والے صحافیوں

Marfat.com

کو جمہوریت نواز اور غیر منتخب فوجی حکومت کی قصیدہ خوانی کرنے والوں کو سرکار کا حاشیہ بردار قرار دیا۔

البتہ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ہاں خواہ فوجی حکومت رہی ہو یا جمہوری ہر دور کے حکمران نے حکومتی امور اور سیاسی معاملات پر "خبر قبیلہ" کے لوگوں سے نہ صرف مشاورت کی بلکہ بعض حکومتوں نے تو کچھ صحافیوں کو وزارتوں کی پیشکش بھی کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کچھ نے ایسی پیشکشیں قبول کیں اور کچھ نے معذرت کر لی، اس سلسلے میں چند ایک مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً روزنامہ وفاق کے چیف ایڈیٹر مصطفٰے صادق کو بھٹو دور میں یہ پیشکش ہوئی کہ وہ حکومت اور سیاستدانوں کے درمیان موجودہ فاصلوں کو ختم کروانے کی کوشش کریں، بقول مصطفٰے صادق کے اپنی کوششوں سے انہوں نے حکومت اور اپوزیشن کو مذاکرات کی ٹیبل پر لا بٹھایا جس کے نتیجہ میں 1973ء کا آئین بنانے کی فضا سازگار ہوئی پھر ضیاء الحق دور میں مصطفٰے صادق کو اطلاعات و نشریات کا وفاقی وزیر بھی بنا دیا گیا۔ اس طرح ارشاد حقانی کو بھی ان کی صحافتی خدمات اور غیر معمولی سیاسی بصیرت رکھنے پر نگران حکومت میں وفاقی وزیر کا قلمدان سونپا گیا ہمارے ایک محترم کالم نگار نذیر ناجی کو یہ عزت ملی کہ انہیں ایک عوامی حکومت کے وزیراعظم کی نشری تقریر لکھنے کو کہا گیا۔ اسی طرح ممتاز ادیب اور کالم نگار عطاء الحق قاسمی کو ایک حکومت میں ناروے کا سفیر مقرر کیا گیا۔ ایک اور انگریزی اخبار سے وابستہ خاتون صحافی ملیحہ لودھی کو امریکہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا البتہ اس کے برعکس خبر قبیلہ کے جن صحافیوں یا اخباری مالکان نے حکومتوں سے ان کی مرضی و منشاء کے مطابق تعاون نہ کیا وہ اکثر و بیشتر زیر عتاب رہے۔

مثلاً 1971ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے عنانِ اقتدار سنبھالی تو انہوں نے اپنے پہلے نشری خطاب میں ہی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر زیڈ اے سلہری اور پریس ٹرسٹ کے چیئرمین حبیب الرحمٰن کو فارغ کر دیا، جنرل ضیاء الحق نے جب اقتدار سنبھالا تو انہوں نے اردو ڈائجسٹ کے الطاف قریشی کو پہلا انٹرویو بڑے خوشگوار موڈ میں دیا مگر چند روز بعد جب قریشی صاحب نے حسبِ عادت جنرل صاحب کو اپنے ایک مضمون میں لتاڑا تو قریشی صاحب کو کوٹ لکھپت جیل کی ہوا کھانا پڑی۔

اس سے پہلے قدرت اللہ شہاب جو خود بھی ایک اچھے ادیب تھے انہوں نے ایوب حکومت کی ہدایت پر روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی نوکری اور بقا کی خاطر ایوب حکومت کا ساتھ

Marfat.com

دیں مگر جب قاسمی صاحب نے معذرت کی تو نہ صرف احمد ندیم قاسمی کو امروز کی چیف ایڈیٹری سے ہاتھ دھونا پڑے بلکہ بونس کے طور پر انہیں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔

ان چند ایک واقعات سے ایک بات واضح ہے کہ صحافیوں کی اکثریت نے کبھی آمریت سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ ضمیر کی آواز پر لکھا، یہ واقعات اس امر کا بھی ثبوت ہیں کہ صحافتی رجحانات حکومتی پالیسیوں پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں، یہ واقعہ بھی آن دی ریکارڈ ہے کہ نواز شریف دور میں ایک بڑے اخبار نے جب یہ لیڈ لگائی کہ حکومت ڈیفالٹر ہوگئی ہے، تو یہ خبر چھاپنے کی پاداش میں نہ صرف وہ اخبار زیر عتاب آیا بلکہ کاغذ کا سرکاری کوٹہ ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس اخبار کے آڈٹ اور انکوائریاں بھی شروع ہوگئیں۔

بہر طور ان حالات و واقعات میں ایک بات طے ہے کہ صحافت ریاست کا چوتھا ستون ہے اور یہ جاننے کے لئے کہ ریاست کا یہ چوتھا ستون عہد حاضر میں کس قدر مضبوط ہے ملک کے 20 نامور صحافیوں اور کالم نگاروں کے تفصیلی انٹرویوز کو ’’خبر قبیلہ‘‘ کی زینت بنایا گیا ہے تا کہ صحافتی دنیا کی ان اہم ہستیوں کی زبانی قوم یہ جان سکے کہ انہوں نے قلم و قرطاس سے اس ملک و قوم کی کیسے اور کس انداز سے خدمت کی۔

خبر قبیلہ میں جن انٹرویوز کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں زیادہ تر ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، روزنامہ صحافت روزنامہ خبریں، ماہنامہ فنکار اور روزنامہ انصاف میں شائع ہوئے، تاہم ان انٹرویو کے بہت سے حصے جو مذکورہ اخبارات و جرائد کی پالیسی کے پیش نظر شامل نہیں کیے جاسکے تھے کتاب میں اب وہ حذف شدہ حصے بھی شامل ہیں اس کے علاوہ کچھ تازہ ترین انٹرویوز بھی خبر قبیلہ کی زینت ہیں، خبر قبیلہ کے آخری مہمان عارف محمود اُپل ہیں اس شخص کا انٹرویو خبر قبیلہ میں شامل کرنے کا میرے پاس واحد جواز یہ ہے کہ وہ گذشتہ بیس برس سے صرف پاکستان کے شمالی، سیاحتی اور تاریخی مقامات پر لکھ رہا ہے، جو عارف محمود اپل کی وطن سے غیر معمولی محبت کا کھلا ثبوت ہے، اس شخص نے آج تک کبھی اپنی کسی تحریر میں کسی فرد، شخصیت یا ادارے کا ذکر نہیں کیا ہے، اس نے جب بھی بات کی ہے صرف پاکستان کی بات کی ہے لہٰذا میرے خیال میں پاکستان کے اس صحافی بیٹے کا انٹرویو خبر قبیلہ کیلئے ناگزیر تھا تا کہ دوسرے اہل قلم کے دل میں بھی وطن کی محبت کو اجاگر کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

یہاں میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب انٹرویوز پر مبنی کتابی مجموعہ شائع کرنے کا حتمی فیصلہ ہوا تب ابھی تک کتاب کا نام فائنل نہیں ہوا تھا، اس کیلئے بہت سے ناموں پر باقاعدہ صحافتی اور ادبی دوستوں

Marfat.com

سے اچھا خاصا بحث مباحثہ ہوا اور کتاب کا نام قلم قبیلہ فائنل ہوا مگر میرے مہربان دوست اور بڑے بھائی جناب ابصار عبدالعلی نے یہ نقطہ اٹھایا کہ قلم قبیلہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید اس میں ادیبوں شاعروں کی بات ہے اس لئے اگر کتاب کا نام قلم قبیلہ کی بجائے خبر قبیلہ رکھ دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، انکی یہ رائے اتنی مناسب اور تجویز اتنی معقول تھی کہ اس سے آگے خیالوں کے مزید گھوڑے نہیں دوڑائے جاسکتے تھے لہٰذا اس طرح سے کتاب کا نام خبر قبیلہ طے پایا۔

خبر قبیلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میرے ساتھی دوست علامہ عبدالستار عاصم کا بہت حصہ ہے جنہوں نے مجھے نہ صرف اس کام کی طرف مائل کیا بلکہ باہمی صلاح مشورے سے اسے تکمیل کے آخری مراحل تک بھی پہنچایا۔اس کے علاوہ کتاب کی تیاری میں جن دوستوں کی فنی معاونت حاصل رہی ان میں ڈیزائنر حافظ عبدالرزاق، محمد طارق فیضی، علامہ محمد منشاء تابش قصوری، صاحبزادہ علامہ محمد طاہر تبسم قادری، صدیق تاثیر، ظہور حسین آصفی ۔ انوار قمر ۔ چوہدری عباس ججرا [illegible]، رانا شبیر احمد شبیر، جمیل اختر چودھری، اے اے انور علیمی ایڈووکیٹ، ملک محمد بوٹا، صاحبزادہ سید سحبان گیلانی، آرٹ ایڈیٹر اکرام اللہ عادل شامل ہیں۔اس کے علاوہ محمد عظیم نوشاہی، احمد یار جنجوعہ، رابعہ عظمت، حافظ محمد امین اور طارق بشیر خان کے قیمتی مشورے بھی کتاب کی تیاری میں شامل حال رہے، جن پر میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

خبر قبیلہ میں شامل تین انٹرویوز کے موقع پر میرے ساتھ میرے معاون ندیم رضا بھی تھے جنہوں نے مجیب الرحمان شامی، نذیر ناجی اور عباس اطہر سے مکالمہ کے دوران اپنی طرف سے بھی چند سوالات کیے، مجھے اپنے معاون طاہر نصیر چودھری کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور مجھے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔

بھرپور کوشش اور توجہ کے باوجود مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ خبر قبیلہ (جلد اول) کی اشاعت وطباعت میں یقیناً کچھ غلطیاں، خامیاں اور کمزوریاں رہ گئی ہونگی جنہیں میرے معزز قارئین بڑی فراخدلی سے درگذر فرمائیں گے، تاہم خبر قبیلہ (جلد اول) ہماری منزل نہیں بلکہ نشان منزل ہے، خبر قبیلہ کی دوسری جلد پر بھی کام تیزی سے جاری ہے جس میں صحافتی دنیا کی ان تمام معتبر شخصیات کے انٹرویوز شامل ہونگے جو جلد اول میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں جس کیلئے مجھے اپنے دوستوں کی رہنمائی درکار ہے۔

Marfat.com

"خبر قبیلہ" لکھنے والوں پر لکھی گئی ہے۔ یہ واقعی میرے لئے ایک مشکل اور آزمائش کن مرحلہ تھا۔ ان شخصیات کے ایک دوسرے کے بارے میں نظریات کچھ بھی ہوں مگر میرا ایمان ہے کہ اس قبیلے کے تمام افراد محبّ وطن اور قومی جذبے سے سرشار ہیں، اس قبیلے نے ہمیشہ پاکستان کی بقا، سلامتی، آزادی اور خودمختاری کو بُری نظر سے دیکھنے والوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

"خبر قبیلہ" پاکستان کے نظریاتی دشمنوں کا باغی قبیلہ ہے، ان کا قلم ملک کے بدخواہوں کے لئے تیر کمان اور اس سے محبت کرنے والوں کے لئے امان ہے۔

میں اپنی بات ان الفاظ پر ختم کرنا چاہوں گا کہ "خبر قبیلہ" کے یہ 20 افراد جن کے انٹرویوز پہلی جلد میں شامل کئے گئے ہیں، پاکستان کی نظریاتی اساس کی سلامتی اور بقا کی ضمانت ہیں، میرے اس دعوے کی سچائی آپ کو ان کے انٹرویوز پڑھ کر محسوس ہوگی۔

ندیم اُپل

25 اپریل 2006

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

ندیم اُپل کو میں تب سے جانتا ہوں جب اسے کوئی نہیں جانتا تھا اب اسے سب جاننے لگے ہیں مگر میرا اور اس کا رابطہ کبھی کبھی ہوتا ہے، اگر محنت میں عظمت کی عملی شکل دیکھنی ہو تو ندیم اُپل سے ملئے۔

کہانی، ترجمہ، فیچر، مضمون الغرض کون سی ایسی صنف ہے جس میں ندیم اُپل نے خود کو نہ منوایا ہو اب وہ ''خبر قبیلہ'' کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے اور خوب آیا ہے میں اسے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس نے انٹرویو کو بھی خوبصورت اور دلچسپ شکل دے کر انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

طارق اسماعیل ساگر

14 مارچ 2006ء

Marfat.com

ندیم اُپل نے سینئر صحافیوں اور کالم نویسوں کے ساتھ مکالمہ کرنے کی روایت کو اچھے انداز میں آگے بھی بڑھایا ہے صحافت بہت سنجیدہ پیشہ ہے یہ وصف انبیائے کرام سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے عربی میں نبی کے لغوی معنی خبر دینے والے کے ہیں اسی طرح رسول کا مطلب رسالہ یعنی اطلاع پہنچانے والا ہے انبیائے کرام پر اترنے والی الہامی کتابوں کو صحیفے کہا جاتا ہے صحافت کا لفظ بھی اسی سے اخذ کیا گیا ہے کہ یوں صحافت کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے انبیاء کرام کی عظیم روایات کے امین ہیں یہ بہت بڑا قابل فخر اعزاز ہے اسے اسی زاویے سے دیکھا جانا چاہیئے اس سلسلے میں ایک اور بات بھی بہت اہم ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے لوگوں سے اپنے بارے رائے پوچھی تھی اور لوگوں نے کہا تھا کہ ہم تمہیں صادق اور امین سمجھتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ہمیشہ دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے اس تصدیق کے بعد ہی آنحضور ﷺ نے نبی ہونے کا اعلان کیا تھا یہ مثال صحافت کا بنیادی اصول طے کر دیتی ہے کہ ہر صحافی کیلئے سچ بولنا سچ لکھنا اور دیانت داری کی اقدار پر قائم رہنا ضروری ہے مجھے صحافت کے شعبہ سے وابستہ ہوئے 40 برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے اس دوران ملکی سیاست کے علاوہ صحافت کے شعبے میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی ہماری صحافت کا معیار اصولوں/صداقت کی پاسداری کا قابلِ ستائش مظاہرہ نہیں کر سکی قیام پاکستان سے پہلے ہماری صحافت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے اپنے مسلک کے حق میں اور مخالف فریق کے خلاف یک طرفہ پراپیگنڈے کی صحافت تھی جس کی اس وقت ضرورت بھی تھی تاہم قیام پاکستان کے بعد صحافت کو اپنے اعلیٰ اصولوں کی ڈگر پر آجانا چاہیئے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا ہمارے بیشتر

Marfat.com

صحافیوں نے قیام پاکستان کے بعد قوم کی فکری، سماجی رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیا مگر کچھ سینئر صحافیوں کا کردار قابلِ رشک دکھائی نہیں دیتا مثلاً یہ کہ جب 1950ء کے اوائل میں گورنر جنرل غلام محمد نے ملک کی پہلی آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا تو ہمارے صحافیوں کو اس آمرانہ اور ملکی سیاسی نظام کیلئے تباہ کن اقدام کی مذمت کرنی چاہیئے تھی مگر اس کے برعکس انتہائی بائیں بازو والے صحافی مظہر علی خاں اور انتہائی دائیں بازو والے زیڈ اے سلہری نے اپنے اپنے اخبارات پاکستان ٹائمز اور ٹائمز آف کراچی میں یکساں قسم کے اداریے لکھے تھے جن میں گورنر جنرل کے اقدام کی پرزور حمایت اور ستائش کی گئی تھی اس سے اندرون و بیرون ملک تاثر پھیلا تھا کہ پاکستان کے عوام گورنر جنرل کے ساتھ ہیں میری رائے ہے کہ یہ دونوں محترم صحافی اس روز تالیاں بجانے کی بجائے ایک شخص کے ہاتھوں اسمبلی توڑے جانے کی بھرپور مذمت کرتے تو شاید بعد میں اتنی آسانی کے ساتھ اسمبلیاں نہ ٹوٹا کرتیں میں نے صرف ایک مثال دی ہے اور بھی بہت سی مثالیں ہیں صحافت کو ملک کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے اس لئے اس کی ذمہ داریوں اور جوابدہی کا پیمانہ دوسرے پیشوں سے کہیں زیادہ معتبر ہونا چاہیئے اور یہ معیار بعض باعزم اور بے خوف ساتھیوں نے عمدگی کے ساتھ برقرار بھی رکھا ہے میں انہیں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں ندیم اُپل عہد حاضر کے چند نامور صحافی حضرات کے ساتھ مکالمہ کر کے اس کی روداد کتابی شکل میں چھپا رہے ہیں میں ان کیلئے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔

سرفراز سید

2/4/2006

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ندیم اُپل ! میدان صحافت کا ایک معروف نام ہیں، نہایت محنتی اور مخلص انسان ہیں مجھے ان کے ساتھ کچھ عرصہ کام کرنے کا شرف حاصل ہے اور یہ عرصہ میرے لئے ایک فخر سے کم نہیں۔ میں نے اس دوران ان سے بہت کچھ سیکھا میں انہیں اسی باعث استاذِ محترم کہتا ہوں میرے کالم کا نام ''نکتہ اعتراض'' بھی انہی کا دیا ہوا ہے ندیم اُپل میگزین کی دنیا میں شاید وہ واحد نام ہے جو اکیلے ایک پورے شعبے کا کام کرنا جانتا ہے روزنامہ صحافت کے حوالے سے کسی بھی اخبار کے شعبہ میں کئی کئی افراد مل کر ہفتہ وار میگزین تیار کرتے ہیں مگر میں چشم دید گواہ ہوں کہ ندیم اُپل نہ صرف اکیلے ہفت روزہ میگزین تیار کرتے ہیں بلکہ روزانہ ایڈیٹوریل پیج بھی تیار کرتے ہیں۔ اداریہ، مضامین، رپورٹس سب خود لکھتے ہیں، پروف ریڈنگ وغیرہ بھی سب خود کرتے ہیں۔ اس دوران وہ بعض ڈائجسٹوں کیلئے کہانیاں بھی لکھتے اور معروف شخصیات سے انٹرویو بھی کرتے ہیں۔ مکالمہ نگاری (انٹرویو) کرنے کے فن سے کماحقہٗ آگاہ ہیں، مکالمہ کرنا اور مکالمہ لکھنا وہ اچھی طرح جانتے ہیں زیرِ نظر کتاب ان کے مکالموں پر مشتمل ہے جو انہوں نے صحافت کی قد آور شخصیات سے کئے۔

قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے دوران بخوبی دیکھیں گے کہ کس طرح ان (مذکورہ) شخصیات کے ظاہر و باطن کو صفحہ و قرطاس تک سمیٹ لائے ہیں انہوں نے معروف صحافتی شخصیات کے اندر سے بہت کچھ کشید کر دکھایا ہے۔

Marfat.com

ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے باعث ہم ان معروف شخصیات سے پہلی بار آشنائی حاصل کر رہے ہیں جو عرصہ دراز سے ہمارے میڈیا پر چھائی ہیں بلکہ وہ شخصیات صحافت کی وجہ سے قومی سیاست اور ثقافت پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہی ہیں اور کر رہی ہیں چیف ایڈیٹرز اور کالم نگاروں سے ندیم اُپل نے انٹرویوز کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ قدآور صحافتی شخصیات نے ایک عام آدمی سے مؤثر ترین مقام تک رسائی کس طرح حاصل کی ان شخصیات کے نظریات کیا ہیں؟ میدانِ کار کیا ہے؟

اس کتاب میں مکالمہ کرتی معروف شخصیات کے صرف حالات سے ہی آگاہی نہیں ہوتی بلکہ ان کی نفسیات، رجحانات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے (بلکہ بعض کی تو اصل سرشت) بھی واضح ہو جاتی ہے، بلاشبہ یہ کتاب صحافت کے طلبہ اور شعبہ صحافت سے متعلق تمام افراد کیلئے ایک تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے اس بہترین کاوش پر جناب ندیم اُپل کو مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی زنبیل سے اس طرح کے اور کئی تحفے نکال دکھائیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

رانا محمد شفیق خاں پسروری

14/3/2006

Marfat.com

انٹرویو نگار کو صحافت کے پیشہ میں وہی حیثیت حاصل ہے جو تصویر سازی کے شعبے میں پورٹریٹ میکر کی ہے اچھا پورٹریٹ وہی ہوتا ہے جس میں شخصیت کا مجموعی عکس یعنی باطن کا ظاہر بھی نظر آئے یہی اچھے انٹرویو کی تعریف ہے۔

انٹرویو پڑھنے، سننے اور دیکھنے کیلئے کیا جاتا ہے جس کے قاری سامع اور ناظر تک پہنچنے کے تین عمومی ذرائع ہیں اخبار، ریڈیو، اور ٹیلی ویژن ان تینوں صورتوں میں پہلی صورت نسبتاً دو آتشہ مشقت کا تقاضا کرتی ہے اور روبرو مکالمہ کے مرحلہ سے گزر کر تحریر بھی کیا جاتا ہے جو اپنی جگہ اعلیٰ صحافتی اہلیت اور سلیقے کا طلب گار ہوتا ہے مزید یہ کہ اس انٹرویو میں قاری موجود نہیں ہوتا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر لائیو انٹرویو میں سامع اور ناظر ٹیلی فون کے ذریعہ سوال پوچھ لیتا ہے مگر اخباری انٹرویو میں یہ سہولت موجود نہیں۔ لہٰذا انٹرویو نگار کو یہ ذمہ داری بھی پوری کرنا پڑتی ہے کہ اس کے قاری کو عدم موجودگی کا احساس نہ ہونے پائے یہ اس وقت ممکن ہے کہ انٹرویو نگار شخصیت سے متعلق قارئین کے ذہنوں سے خام مال لیکر اپنے سوال مرتب کریں جو پیشگی تیاری (HOME WORK) کا اہم حصہ ہے یہی جامع انٹرویو کی کلید ہے جو ''خبر قبیلہ'' کے انٹرویوز پڑھ کر نمایاں احساس ہوتا ہے کہ جناب ندیم اُپل مہمان شخصیت کو کتاب کا درجہ دیتے ہیں اور انٹرویو کو امتحان سمجھتے ہیں لہٰذا وہ کتاب کے مکمل مطالعہ کے بغیر کمرہ امتحان میں نہیں جاتے وہ بات سے بات نکالنے کی تن آسانی پر انحصار کرتے ہوئے

Marfat.com

خالی ذہن کے ساتھ انٹرویو کرنے نہیں جاتے۔ لہٰذا خالی ہاتھ نہیں لوٹتے اور قاری کی سوچ سے کشید کیے ہوئے سوالات کی اساس پر وہ مہمان شخصیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سلیقہ سے چبھتے ہوئے سوالات بھی پوچھ لیتے ہیں کہ شخصیت غصہ کی بجائے لائین پر آجاتی ہے اور وہ جواب بھی دے جاتی ہے جو نہ دینے کا اس نے مصمم ارادہ کر رکھا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر انٹرویو نگاری فن سے بلند ہو کر فن لطیف کے درجہ پر فائز ہو جاتی ہے جناب ندیم اُپل سے ہماری ملاقات اسی اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہے۔

جناب ندیم اُپل یوں تو صحافت کے تمام شعبوں میں اپنی اہلیت منوا چکے ہیں لیکن انٹرویو نگاری انکی پہچان نظر آتی ہے۔ جس کے ہر زاویہ، ہر پہلو اور ہر جہت پر انکی گہری گرفت ہے اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ندیم اُپل صاحب شخصیت کی ذات اور نفسیات کے گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے جب اس کے روبرو پہنچتے ہیں تو جم کر سوال کرنے کے حوصلہ سے مالا مال ہوتے ہیں کسی بھی انٹرویو نگار کیلئے یہ صورت حال کامیابی کی علامت ہوتی ہے اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انٹرویو نگار سوال کرتے ہوئے مخاطب شخصیت کو عمداً اشتعال دلاتے ہیں ان کی توقع ہوتی ہے کہ کسی طرح انہیں صحیح جواب مل جائے لیکن غصہ کے عالم میں صحیح فیصلے اور صحیح جواب کی توقع انسانی نفسیات سے عدم واقفیت کی علامت ہے جو گفتگو میں انتشار اور منفی ردعمل پیدا کرتی ہے اگر انٹرویو نگار سوال اپنی چوائس سے کرتا ہے جس کا اسے حق ہے تو پھر جواب میں اُسے مہمان شخصیت کی مرضی کے حق کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے انٹرویو سننے والے اور پڑھنے والے انٹرویو دینے والی شخصیت کے جواب میں ہچکچاہٹ اور الفاظ کے موزوں استعمال سے خود یہ اندازہ لگانے کا شعور رکھتے ہیں کہ مہمان شخصیت کچھ چھپا رہی ہے یا گول مول بات کر کے حقائق سے گریز کر رہی ہے لہٰذا بات گھوم پھر کر سوال کرنے کے فن اور قرینہ پر آکر رکتی ہے کہ سوال کیا اور کس طرح کیا گیا ہے اگر انٹرویو نگار کے سوالوں سے مہمان شخصیت کو اندازہ ہو جائے کہ وہ اس کی شخصیت کے بارے میں سب کچھ یا بہت کچھ جانتا ہے تو وہ توقع سے زیادہ صحیح اور مفصل جواب دیتا ہے گویا علم سے ہی علم کشید کیا جا سکتا ہے اس کی مناسب ترین مثال اوریانا فلاچی جیسی عالمی سطح کی ممتاز اور ثقہ انٹرویو نگار ہے جو اپنے مہمان سے اس وقت گفتگو کا آغاز کرتی ہے کہ جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسے مہمان کے بارے میں زیادہ علم ہو چکا ہے جسے وہ مہمان کی زبان سے پڑھنے والوں تک پہنچا کر معتبر بنانا چاہتی ہے۔

جناب ندیم اُپل سوال کرنے کے فن پر لائقِ تحسین دسترس رکھتے ہیں وہ انٹرویو کے سفر پر مطلوبہ زادِ راہ

Marfat.com

کے بغیر نہیں نکلتے اسی لئے وہ ایک کامیاب انٹرویو نگار ہیں وہ اپنے سوالات عام قاری کے ذہن کی وادی سے چُننے کا جتن سلیقہ سے کرتے ہیں وہ انٹرویو کے سفر پر مطلوبہ زادِراہ کے بغیر نہیں نکلتے اس لئے مہمان ان پر کھل جاتا ہے جناب ندیم اُپل ''خبر قبیلہ'' کے دامن میں جتنے انٹرویو کی سوغات لیکر قاری تک کتابی صورت میں پہنچے ہیں اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ان کے پاس ان ستاروں سے آگے کے اور بھی جہاں موجود ہونگے۔

زیرِ نظر مجموعے میں دونوعیتوں کے انٹرویو شامل ہیں ایک وہ جوان محترم صحافیوں کے ہیں جو اخبار کے مالک بھی ہیں اور دوسرے وہ جن کا حوالہ کالم نگاری ہے اوّل الذکر میں وہ صحافی ہیں جن کی جدوجہد سے پاکستان کی اخباری صنعت کو توانائی ملی اور ثانی الذکر میں وہ اہلِ صحافت شامل ہیں جو سیاسی، معاشرتی اور معاشی دانش کی اساس پر قاری کو فکری مواد فراہم کرتے ہیں دونوں نوعیتوں کے انٹرویو شخصیات کی ذاتی زندگی صحافت کے خارزار میں عملی جدوجہد، ان کے سیاسی نظریات، فکری سمت، ملکی اور عالمی حالات پر انکی سوچ، زندگی کے تجربات اور مشاہدات کے بارے میں وسیع معلومات فراہم کرتے ہیں۔

جناب ندیم اُپل اچھے صحافی اور ثقہ انٹرویو نگار ہیں ''خبر قبیلہ'' کی صورت میں انکی کاوش اپنے مندرجات کی اساس پر اتنا دم خم رکھتی ہے کہ صحافت کی تاریخ میں اسے حوالے کی کتاب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

ابصار عبدالعلی

2/4/2006

Marfat.com

پاکستانی صحافت میں دیانت داری کی امثال خال خال ہی ہیں لیکن اتنا کال بھی نہیں کہ صحافیوں کی بھیڑ میں ہم نمایاں صحافیوں کے نام اور کام سے صرفِ نظر کر سکیں۔ صحافت کی دنیا میں ندیم اُپل کا نام معروف بھی ہے اور معتبر بھی۔ خاص طور پر انٹرویوز کے حوالے سے۔

انٹرویو ایک آرٹ ہے لیکن صرف وہ محض آرٹ نہیں۔ انٹرویو کے مضمون سے انٹرویو کرنے والے کا سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی شعور بھی جھلکنا چاہیے، جیسا کہ اوریانا فلاچی کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور سوالات اُبھارتے ہوئے کم از کم اُس سطح کو پانے کی جستجو کرنا ضروری ہے جو ماضی کے طالب علم راہنما اور حال کے ''ورلڈ سوشل فورم'' کے رُوحِ رواں طارق علی کے ہاں جھلکتا ہے۔

''خبر قبیلہ'' ندیم اُپل کی صحافتی زندگی سے حاصل کردہ شعور کا حاصل ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب ندیم اُپل تجزیہ کاری کی سطح پر ''فوکویاما'' اور ''سیموئل پی ہملٹن'' سے کارے کردن کی تمنا کریں گے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

23 اپریل 2006ء

Marfat.com

قارئین محترم! پامسٹری میرا عشق ہے اس تلاش و جستجو کے سفر میں مجھے لاکھوں افراد سے ملنے کا شرف حاصل ہوا مجھے ہمیشہ خواہش رہی کہ لوگوں کو ان کے ہاتھ اور لکیروں کے خدوخال کے حوالے سے جانوں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے لیکن اسی جان کاری کے عمل نے میرے اندر بھی ایک حسرت پیدا کردی کہ مجھے کوئی پوچھے کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

اسی دوران مجھے اہم شخصیات اور ہر شعبہ زندگی کے لوگوں کے ساتھ اوران کی کہانی اور اندر پائی جانیوالی SUCCESS کی تمنا بھی جاننے کے مواقع میسر آئے۔

روزنامہ انصاف سے مجھے ایڈیٹر انچیف محترم جنید سلیم کا فون آیا۔۔۔۔ملاقات ہوئی اور دورانِ گفتگو کامیابی و ناکامی کی روداد بغیر پوچھے بتاتا گیا میری روئیداد سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ شائع کی جائے۔۔؟

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔۔۔۔ایسا کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔

جنید سلیم صاحب نے میگزین ایڈیٹر جناب ندیم اُپل صاحب سے کہا کہ انہیں سنیں اور شائع کریں روزنامہ انصاف کے سنڈے میگزین میں میری کہانی میری زبانی کے 45EPISODES شائع ہوئے۔

میں نے ذہن کے دریچے کھولے اور کہانی ندیم اُپل کو سنانا شروع کردی یہ وہ تلخ یادیں اور حقائق تھے جن کو میں نے شعور کے ایک مخصوص خانے میں بند کردیا تھا اور تالا لگا کر چابی دریا میں پھینک دی تھی۔ندیم اُپل کا انٹرویو کرنے اور کہانی کے درمیان سوال پوچھنے کا انداز اس قدر غیر معمولی تھا کہ انہوں نے بڑی مہارت اور کامیابی کے ساتھ وہ دروازہ بھی کھلوایا جس کے اندر جھانک کر مجھے خود بھی خوف آتا تھا اور پھر حیرت انگیز بات

Marfat.com

تھی کہ وہ اندر کا انسان جو باہر کے انسان سے چھپ کر اس کے اندر ہی پناہ لئے ہوئے تھا رفتہ رفتہ ہلکی بارش کی طرح باہر آنا شروع ہو گیا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرے کونے کھدروں اور دراڑوں میں پڑی ہوئی اینگزائٹی دور ہو گئی۔

شاید کچھ کہنے کے بعد انسان کے اندر یہ سلسلہ بھی موجود ہے کہ وہ ری چارج ہو جاتا ہے اور اس کے اندر پایا جانیوالا توڑ پھوڑ کا عمل بھی رک جاتا ہے مجھے لگتا ہے کہ قدرت نے وجود کے اندر مستقل قیام کیلئے بڑائی اور برائی کے لئے جگہ نہیں رکھی وہ باہر نکالنا ہی پڑتی ہے۔ میں جس طرح لحہ بہ لحہ کامیابی وجدوجہد کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتا گیا اسی طرح سے بدن میں پائی جانے والی تھکن بھی رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی اس کی جگہ نئی تمناؤں، نئی خواہشات نے لینا شروع کر دی اور پھر۔۔۔!

بڑی عمر کا نوجوان دوبارہ ایک نئی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے اور ایک نئی داستان رقم کرنے کیلئے میدان عمل میں آنکلتا ہے۔ یہ سارا کریڈٹ ندیم اُپل کو جاتا ہے جو ایک تھکے ہوئے انسان کو بڑھاپے کی دہلیز سے واپس لے آیا۔

جناب ندیم اُپل کی کتاب ،،خبر قبیلہ،، میں عظیم جدوجہد کرنے والوں کی کہانیاں پڑھنے کے بعد میرے اندر مزید آگے بڑھنے کا عزم پیدا ہوا دراصل جب ندیم اُپل جیسے عظیم صحافی کسی بھی SUCCESS سٹوری کو اس کے خالص پن میں شائع کرتا ہے وہ کہنے اور پڑھنے والے کے درمیان سچ کا رشتہ استوار کر رہا ہوتا ہے وہاں دونوں کے درمیان ایک نئے عزم کی روح بھی پھونکتا ہے میں سمجھتا ہوں یہ کتاب نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ ہوگی۔ جو کسی سے کہنا نہیں چاہتے مگر پڑھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں کیا کرنا ہے۔

صادق محمود ملک آسٹرو پامسٹ
25 مارچ 2006

84673

Marfat.com

بقراط نے اپنے شاگردوں کو ایک نصیحت کی تھی کہ تمہیں ہر اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ جس کے علم کے بغیر تم شرمندگی سے دوچار ہو سکتے ہو عہد حاضر میں اگر کسی نے بقراط کی باتوں پر عمل پیرا کسی اہل علم یا اہل قلم کو دیکھنا ہو تو وہ ندیم اُپل کو دیکھ لے۔ ندیم اُپل نے آج سے 35 سال قبل یعنی 1971ء میں صحافت کی وادی میں قدم رکھا انکا پہلا کالم روزنامہ مساوات میں شائع ہوا پھر تمام بڑے بڑے اخبارات میں ان کے تہلکہ مچا دینے والے فیچر شائع ہوئے۔ وہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک ندیم اُپل کے قلم سے 15 لاکھ الفاظ تحریر ہو چکے ہیں۔ ان کا دنیا کے ان بڑے بڑے عامل صحافیوں میں شمار ہوتا ہے جو مسلسل دن رات لکھ رہے ہیں اس حوالے سے ان کا نام عالمی سطح پر (گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ) میں آنا چاہیئے۔ ندیم اُپل! جب تک روزانہ چار پانچ کالم یا فیچر تحریر نہیں کر لیتے انہیں نیند نہیں آتی موصوف ہر دم جستجو میں رہتے ہیں نئی نئی چیزیں لکھنے تلاش کرنے اور تخلیق کرنیکا انہیں جنون کی حد تک شوق ہے اور وہ ہماری تقریباً نصف صدی کی صحافتی ملکی تاریخ کی چلتی پھرتی لائبریری ہیں۔

بہر حال ان کی مذکورہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کتاب کو معروف نوجوان محقق دانشور، ادیب، مؤرخ وصحافی برادرم عزیز صاحبزادہ علامہ عبدالستار عاصم مرتب کر رہے ہیں اس کتاب کی ترتیب سے علامہ صاحب کے ذوق اور علم صحافت کی گہرائی کا اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔

چودھری ذوالفقار احمد راحت
جنرل سیکرٹری ساؤتھ ایشین
یونین آف جرنلسٹس (انٹرنیشنل)
14 اپریل 2006ء

Marfat.com

صحافی، معاشرے کا سب سے باخبر قبیلہ ہوتا ہے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اور اسکے کیا اثرات مرتب ہونگے؟ معاشرے کو اس سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری انہوں نے خود ہی قبول کر رکھی ہے اور اس آگاہی کیلئے خبروں کے ساتھ ساتھ فیچر، تجزیئے، کالم اور انٹرویوز سے کام لیا جاتا ہے اب پہلی بار یہ ہوا ہے کہ ندیم اُپل صاحب نے دنیائے صحافت کے بیس نامور اشخاص کے انٹرویو کیئے ہیں جو نہ صرف نجی زندگی بلکہ قومی تاریخ کے اہم رازوں سے پردہ اٹھا رہے ہیں ان بیس لوگوں میں اخبارات کے مالکان، کارکن صحافی مکالمہ نویس اور ادیب بھی شامل ہیں جن کا صحافت سے براہ راست تعلق ہے ان میں جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے والے مجید نظامی، ہر ظالم کے سامنے سینہ سپر ہونے والے ضیا شاہد، بڑے جذباتی انداز میں سچ بولنے والے حسن نثار، تلخ حقائق کو شگفتہ انداز میں بیان کرنے والے عطاء الحق قاسمی، خاکروب کو ملک کا سب سے بڑا خادم سمجھنے والے اشفاق احمد، ملک کے سب سے بڑے اور معتبر مگر سب سے ناراض، ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی، اور اسی قبیل کے دیگر احباب شامل ہیں ان کے انٹرویوز قومی تاریخ کا ایک نہایت ہی قیمتی اثاثہ ہیں۔

''خبر قبیلہ'' کے نام سے ان انٹرویوز کو مرتب کر کے علامہ عبدالستار عاصم نے نہ صرف ایک قومی فریضہ سرانجام دیا ہے بلکہ ہماری قومی تاریخ پر احسان کیا ہے۔ مستقبل کے محقق اور مؤرخوں کیلئے ''خبر قبیلہ'' ایک مستند دستاویز ہوگی۔ میں کھلے دل سے خبر قبیلہ کا سواگت کرتا ہوں اور علامہ عبدالستار عاصم کو اتنا بڑا کام کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر محمد اکرم سعید
گورنمنٹ کالج شیخوپورہ
9اپریل2006ء

Marfat.com

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ درویش وہ ہے جو کسی چیز کا طمع نہ کرے اور جب کوئی بے طلب لائے تو منع نہ کرے اور جب لے لے تو جمع نہ کرے۔

پاکستان میں لیڈنگ صحافیوں میں درویشی کے اس مقامِ ناز پر ایک ہی صحافی ایسا نظر آتا ہے جس کا نام مجید نظامی ہے انہوں نے نوائے وقت کے تمام اثاثے ملکِ عزیز کے نام وقف کر کے نہ صرف اپنے درویش طبع ہونے کا کامل ثبوت دیا ہے بلکہ اس امر سے انکی پاکستان کے ساتھ محبت بھی واضح ہو گئی ہے اسی قبیل کے 19 دیگر نامور اہل صحافت کے حالات زندگی اور انکے انٹرویو کر کے ''خبر قبیلہ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کرنے والے جناب ندیم اُپل اور جناب علامہ عبدالستار عاصم نے قلم، اہل قلم اور صحافت کی عظیم خدمت کی ہے اس کتاب کو بغور پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب فقط ریفرنس بک ہی نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس میں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بھی بہت مواد ہے ہمارے معاشرے اور معاشرے کے رہنماؤں کے متعلق حقائق سے بڑی عمدگی اور بے ساختگی سے پردہ کشائی کی گئی ہے اپنے عنوان کے حوالے سے یہ ایک مکمل اور جامع کتاب ہے۔

میں جناب ندیم اُپل صاحب اور صاحبزادہ علامہ عبدالستار کو ہدیہ تبرک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ,,خبر قبیلہ،، کو منظر عام پر لا کر انجام دیا جو یقیناً ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

عرفان احمد خان

یکم اپریل 2006ء

Marfat.com

ملک عزیز کی ترقی واستحکام اور وقار کیلئے عام پاکستانی کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کیلئے جتنا کام اہلِ قلم نے کیا ہے پاکستان کی تاریخ میں اتنا کام نہ کسی سیاست دان نے کیا ہے، نہ سرمایہ دار نے اور نہ جاگیردار نے بلکہ ان تمام مقتدر طبقوں نے عام آدمی سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لینے کی کوشش کی ہے۔ اہل قلم ہی اس ملک میں قابلِ فخر لوگ ہیں کہ خود اپنی ذاتی زندگی اور اپنی اولاد کے مستقبل کو خطرے میں ڈال کر ملک وقوم کی بہتری کیلئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں، مثبت آراء اور مبنی برحقائق اور تنقید کے ذریعے لٹیروں کی مذمت اور مظلوموں کی حمایت کرنے والے یہ اہلِ قلم دراصل حسینی قبیلہ کے لوگ ہیں۔

جناب ندیم اُپل نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ملک کے ممتاز ترین صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویو کو "خبر قبیلہ" کے نام سے مرتب کر کے عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے بلاشبہ انکی یہ مایہ ناز تصنیف آئندہ تاریخ میں ریفرنس اور حقائق کا منبع ثابت ہوگی، کتاب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ میرے ملک کے قلم کاروں نے خفیہ رازوں کو بے نقاب کیا ہے جو یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ کتاب اس قدر معلوماتی اور علمی ہے کہ اسے صدارتی ایوارڈ کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہئے اور اس کتاب کا دیگر زبانوں خصوصاً انگلش زبان میں ترجمہ ہونا گلوبل حالات کا تقاضا ہے۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب ندیم اُپل اور جناب عزیزم علامہ عبدالستار عاصم کو مزید ایسے تاریخی ادبی کارنامے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

رانا عامر الرحمٰن محمود ایڈووکیٹ
چیئرمین رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن (پاکستان)
3B رفیقی روڈ سول لائنز شیخوپورہ (پنجاب) پاکستان
6 اپریل 2006ء

Marfat.com

رانا عامر

سرپرست: القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل ☆ مرکزی چیئرمین: رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن پاکستان

Marfat.com

Marfat.com

اپنے بین البراعظمی، بین الاقوامی حالات اور جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے آئندہ ایک صدی تک پاکستان ہر قسم کے حربی اور بین الاقوامی سیاسی خطرے سے محفوظ تر ہے امریکہ حتیٰ کہ انڈیا آئندہ 50 سال تک پاکستان کی سالمیت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ راز صرف باخبر لوگوں کیلئے ہے اس حوالہ سے حقائق جناب ندیم اُپل اور جناب علامہ عبدالستار عاصم کی کتاب ''خبر قبیلہ'' میں کہیں ایک سطر میں پوشیدہ ہیں یہ حقائق جاننے کیلئے اس کتاب کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔

دعا گو

صاحبزادہ پیر سید حافظ افضال حسین شاہ محمدی سیفی

سجادہ نشین آستانہ عالیہ ریحان شریف

21 اپریل 2006ء

Marfat.com

علامہ عبدالستار عاصم بڑے زود نویس مگر صاحب طرز ادیب ہیں بہت ہی مختصر عرصے میں انہوں نے میاں محمد شریف کی رحلت کے موقع پر ''ذرہ سے آفتاب'' فخر المشائخ الحاج قبلہ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری مدظلہ العالی سجادہ نشین آستانہ عالیہ شرقپور شریف کی شخصیت پر ''انوار جمیل'' اور حضرت مولانا عبدالکریم ابدالوی رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کے موقع پر ''محدث ابدالوی'' رحمتہ اللہ علیہ اور آنحضرت ﷺ کے ناموں کی نسبت سے اسماء النبی ﷺ تحریر کر کے علمی و ادبی حلقوں کو متحیر کر دیا ہے۔ یہ تصانیف علامہ عبدالستار عاصم کے وہ کارہائے نمایاں ہیں کہ جنہیں علمی و ادبی اور قومی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ علامہ عبدالستار عاصم اب ''خبر قبیلہ'' نام سے نئی کتاب مرتب فرما رہے ہیں جس میں دنیائے صحافت کی بیس بہت ہی اہم اور نامور شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں یہ انٹرویوز جناب ندیم اُپل صاحب نے کئے ہیں مگر علامہ عبدالستار عاصم نے انہیں مرتب فرمایا ہے اس کی ترتیب انتہائی محنت اور عرق ریزی کا کام ہے اس میں بہت احتیاط اور ذمہ داری کو نبھانا ہوتا ہے۔ علامہ عبدالستار عاصم نے اپنے اس فرض کو بہت احسن انداز سے سرانجام دیا ہے۔ ہر وہ شخص جسے صحافت اور ادب سے دلچسپی ہے ''خبر قبیلہ'' اس کیلئے ایک بے مثال تحفہ ہے اس کتاب میں نہ صرف پاکستان کی صحافتی تاریخ کے ہر سوال کا جواب ملتا ہے بلکہ دنیائے صحافت کے بہت سے اہم راز بھی بے نقاب ہوئے ہیں۔

جناب مجید نظامی سے لیکر عارف محمود اُپل تک یہ اہم شخصیات ہماری قومی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کی عینی شاہد ہیں ان شخصیات کے یہ انٹرویوز دراصل ہماری قومی تاریخ کا ایک مستند ریکارڈ ہیں۔ ان شخصیات میں کچھ اخبارات کے مالکان ہیں کچھ کالم نگار اور دانشور ہیں جنہوں نے ہماری قومی تاریخ کو ہر زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے یہ سب کچھ ''خبر قبیلہ'' میں قارئین کو ایک ساتھ ملے گا بحر کیف عبدالستار عاصم نے بہت اہم ذمہ داری نبھا کر اپنی حب الوطنی اور قوم دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

''خبر قبیلہ'' کو ایک مستند قومی دستاویز کی صورت میں ہمیشہ اہم مقام حاصل رہے گا اور اسے ایک ریفرنس کتاب کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا۔

بقول شاعر رانا شبیر احمد شبیر

بیس افراد نہیں خبر قبیلہ ہے یہ
علم و دانش کا درخشندہ وسیلہ ہے یہ

محمد امجد رانا صراف

مرکزی چیف آرگنائزر کاروان ملت پاکستان

Marfat.com

پاکستان کی صحافتی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ صحافت کے روشن ستاروں کی کہانی خود ان کی زبانی پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس کا تمام تر کریڈٹ کہنہ مشق سینئر صحافی جناب ندیم اُپل اور القلم فاؤنڈیشن (انٹرنیشنل) کے چیئرمین جناب علامہ عبدالستار عاصم کو جاتا ہے۔

''خبر قبیلہ'' مرتب کر کے بلاشبہ ان دونوں احباب نے صحافتی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب رقم کیا ہے، چونکہ صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے، اس اعتبار سے ملک کے نامور صحافیوں اور کالم نگاروں کے انٹرویوز کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت تھی، تاکہ عوام یہ جان سکیں کہ ریاست کے اس چوتھے ستون پر مستقبل میں کس حد تک انحصار کیا جا سکتا ہے۔

جناب ندیم اُپل نے ''خبر قبیلہ'' لکھ کر صحافت کی دنیا میں اپنا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔

طارق اُپل

20 اپریل 2006ء

Marfat.com

"خبر قبیلہ" میں جہاں ملک کے نامور اور بزرگ صحافیوں کے انٹرویوز اور ان کی جہدِ مسلسل کی سچی اور پُرعزم داستانیں بیان کی گئی ہیں وہاں پاکستان سے محبت کرنے والے نوجوان صحافی اور سیاح جناب عارف محمود اُپل کی قلمی محاذ پر سیر و سیاحت پر مبنی ان کی 20 سالہ بے لوث قومی خدمات کے حوالے سے ان کا انٹرویو شامل کر کے کتاب کے مصنف نے ایک لائقِ تحسین کارنامہ انجام دیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ صحافتی اور عوامی حلقوں کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی "خبر قبیلہ" ایک معلومات افزاء اور تاریخی کتاب ثابت ہوگی۔
میرا ایمان ہے کہ اس سے پہلے صحافیوں کی زندگی پر ایسی مدلل اور منفرد کتاب پہلے کبھی نہیں لکھی گئی۔

صداقت علی ناز

25 اپریل 2006ء

Marfat.com

اپنے شوہر کی 10 سالہ رفاقت کے باوجود میں ابھی تک یہ راز نہیں جان سکی کہ وہ اپنے کام اور مشن سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا اپنے خاندان اور بچوں کو زیادہ چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں دو عشق کامیاب نہیں ہو سکتے مگر میرے شوہر بیک وقت یہ دونوں عشق بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں۔

اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ کا زندہ ثبوت ''خبرقبیلہ'' ہے جسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اپنے مشن اور فیملی کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے قبیلے سے بھی عشق ہے۔''خبرقبیلہ'' جس کی زندہ مثال ہے۔

حفصہ ندیم اُپل

15 اپریل 2006ء

Marfat.com

"خبر قبیلہ" صحافتی برادری کے حوالے سے ایک ریفرنس بک ہے اس سے پہلے ہمارے کتب خانوں میں ایسی کوئی کتاب دستیاب نہ تھی جس سے ہمیں صحافتی دنیا کے شہسواروں کی نجی اور پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں خاطر خواہ آگاہی ہو سکے مگر "خبر قبیلہ" کی اشاعت نے صحافی برادری کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ وہ بھی اپنی ذات کے بارے خبر قبیلہ کو فخریہ طور پر اپنے لئے ایک مستند حوالہ کے طور پر پیش کر سکیں گے۔

ابو لا امتیاز ع۔ س۔ مسلم

کراچی

Marfat.com

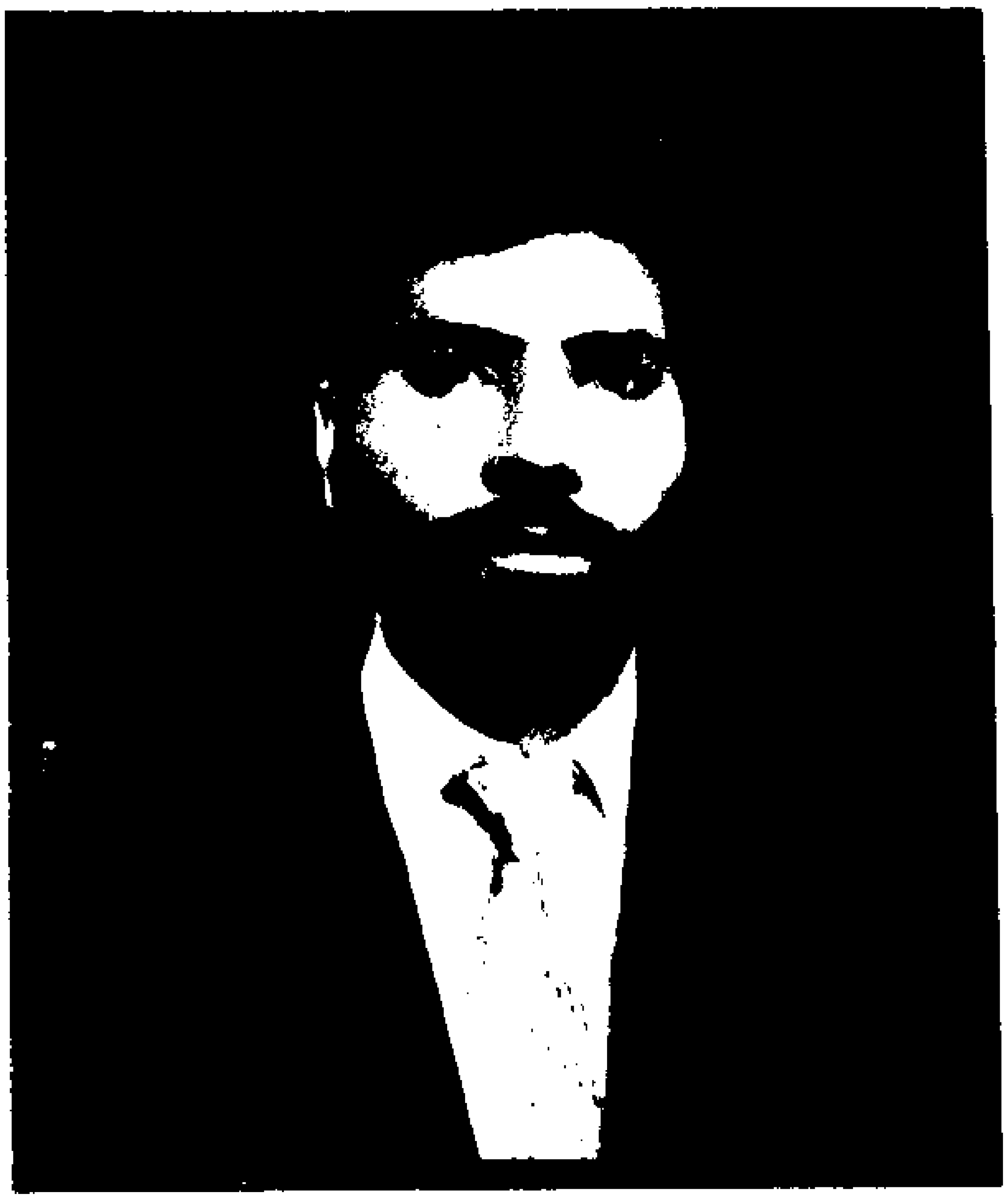

علامہ عبدالستار عاصم کی شخصیت کے برعکس جتنا بھاری بھر کم انکا نام ہے ویسے ہی ان کے بھاری بھر کم کام بھی ہیں بظاہر بزرگوں کے سامنے لڑکے لگتے ہیں مگر وہ ایسے لڑکے ہیں کہ جن کے بارے میں جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ

میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں
پر کام کروں کا بڑے بڑے

علامہ عبدالستار عاصم کے بڑے بڑے کاموں میں ان کی چار قابل ذکر کتابیں ,,انوار جمیل،، ,,محدث ابدالوی،، ,,ذرہ سے آفتاب ،،اور 50 جلد پر مشتمل ,,تاریخ پنجاب ،،,,بااصول رہبر،،,,برصغیر کی سیاست اور پٹیالہ ریاست،،(زیر طبع) ہیں جبکہ تازہ ترین معرکہ خیز کتاب خبر قبیلہ آپ کے ہاتھ میں ہے

علامہ صاحب کی جب مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی تو میں انہیں محض ایک عالم دین، سیرت نگار اور چند دینی کتابوں کا پبلشر سمجھتا تھا مگر جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ بھی ستاروں پر کمند ڈالنے والوں میں سے ہیں۔

Marfat.com

''خبر قبیلہ'' کی اشاعت کا پروگرام اچانک اور بغیر کسی پیشگی منصوبہ بندی کے یوں بنا کہ ایک روز علامہ عبدالستار عاصم میرے دفتر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اُپل صاحب میرے علم کے مطابق آپ اپنی پچیس سالہ صحافتی زندگی میں مختلف قومی اخبارات اور جرائد کیلئے 300 سے زائد انٹرویو زکر چکے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ ،حکایت ،خبریں ،صحافت ،جرأت اور انصاف میں آپ کے ایسے کام کے انٹرویو شائع ہوئے ہیں جنہیں ملک کے تمام ادبی اور صحافت نواز حلقوں تک پہنچنا چاہیئے کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ کے انٹرویوز سے چند منتخب انٹرویوز پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی جائے۔

علامہ صاحب کے اس سوال پر میں بے بسی سے مسکرادیا اصرار کرنے پر میں نے انہیں بتایا کہ بھائی اسے میری نالائقی یا غفلت تصور کریں کہ میں نے آج تک اپنی کسی چھپی ہوئی تحریر یا انٹرویو کو محفوظ نہیں کیا۔ میرا جواب سن کر علامہ صاحب بھی مسکرادیئے اور کہنے لگے کہ اُپل صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں سب کچھ ہوجائے گا۔

کیسے ہوجائے گا...... میں نے پوچھا

اس کا جواب میں آپ کو کل دوں گا ،علامہ صاحب نے اتنا کہا اور اجازت لیکر رخصت ہوئے اور اگلے روز اس لمحے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب علامہ صاحب نے میرے مختلف اخبارات وجرائد میں شائع شدہ انٹرویوز کی کٹنگز لاکر میری ٹیبل پر رکھ دیں میری آنکھوں میں اس لمحے خوشی کے آنسو جھلک اٹھے کہ 14 کروڑ عوام میں چند ایک میرے قدردان بھی ہیں۔

یہ علامہ صاحب کی اسی چاہت کا جواب تھا کہ میں نے ان کی خواہش پر بخوشی انہیں اپنے منتخب انٹرویوز کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت دے دی ۔انٹرویوز کا انتخاب ہم دونوں نے مل کر کیا بہرکیف علامہ عبدالستار عاصم صاحب کی کوشش وجستجو اور میری رہنمائی ''خبر قبیلہ'' کی صورت میں آپ کے سامنے ہے فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ اس کوشش میں ہم دونوں کس حد تک کامیاب رہے۔؟

ندیم اُپل

20 اپریل 2006ء

Marfat.com

خبر قبیلہ

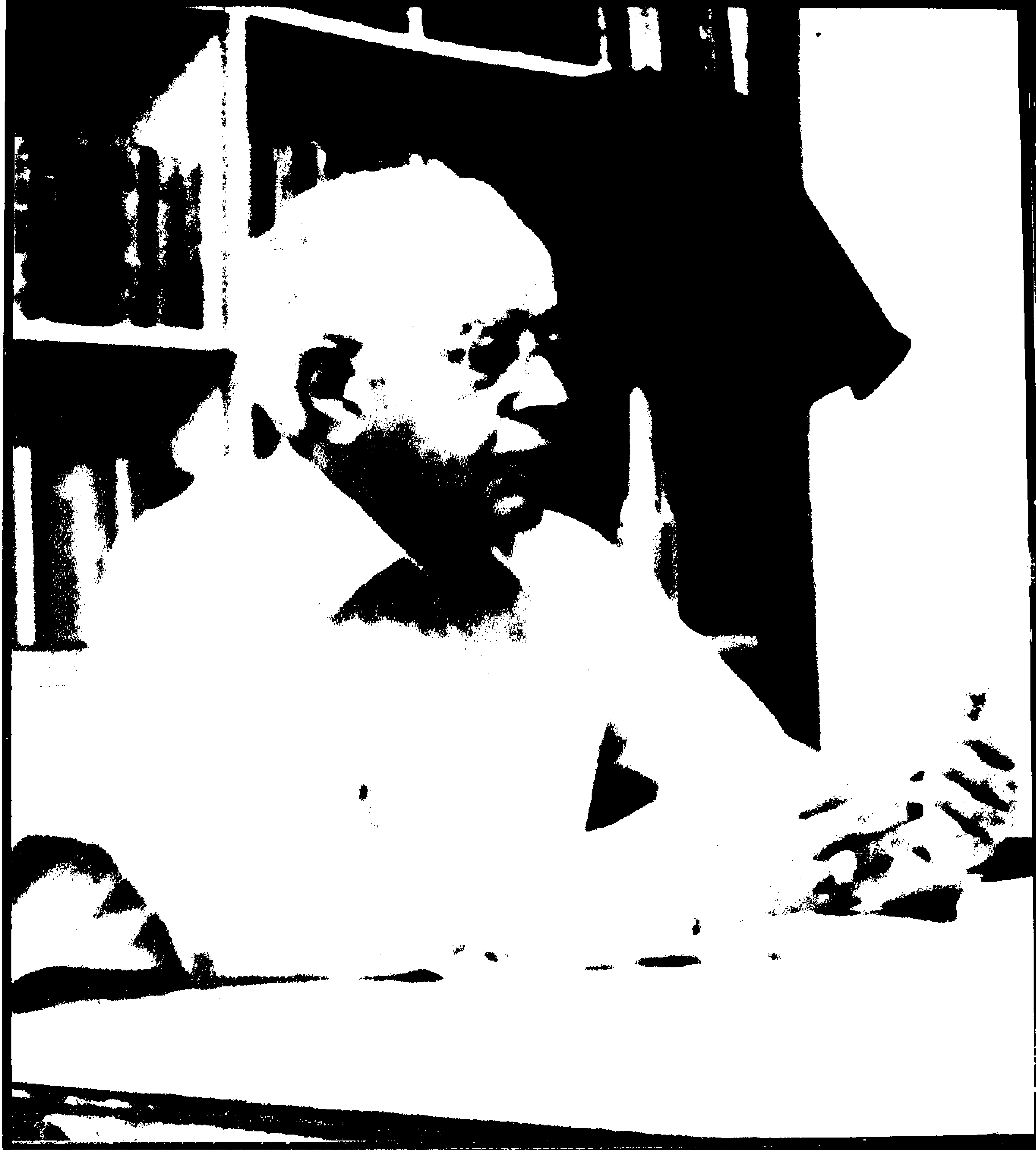

جناب مجید نظامی

Marfat.com

Marfat.com

آزادئ صحافت میری زندگی کا مشن ہے

مجید نظامی

مجید نظامی باوقار صحافت کے ایک عہد کا نام ہے، قلم کی حرمت، الفاظ کا تقدس اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ان کی پہچان ہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا آپ کی شناخت ہے۔ مجید نظامی آزاد اور بیباک صحافت کی دنیا کے ایک ایسے شہسوار ہیں جو کہ گزشتہ نصف صدی سے صحافت کے محاذ پر نظریہ پاکستان کے تحفظ، بقاء اور سلامتی کی جنگ لڑ رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے صحافت کے پیشے کو وطن کی محبت سے مشروط کر کے اسے جہاد کا درجہ دے دیا ہے۔ شاید انہی صفات کی بنیاد پر شہید ملت خان لیاقت علی خان نے آپ کو "مجاہد پاکستان" کے سرٹیفکیٹ سے نوازا تھا۔ یہ بات بھی مجید نظامی کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ وہ تحریک پاکستان سے تکمیل پاکستان تک اپنے عظیم قائدین کے ہراول دستے میں شامل رہے۔ آج بھی ان کا مقام ایک ایسے شجر سایہ دار کی مانند ہے کہ جس کے سائے میں ڈیرے ڈالنے والے خبر قبیلے کی عزت اور صحافت کی آبرو باقی ہے۔ ایک مختصر نشست میں مجید نظامی صاحب سے نظریہ پاکستان اور صحافت کے جدید تقاضوں کے حوالے سے مکالمہ ہوا جو نذر قارئین ہے۔

س: ڈکٹیٹرشپ کے خلاف آواز اٹھانا اور نظریہ پاکستان کے فروغ کے لئے جدوجہد نوائے وقت کا مشن

Marfat.com

رہا ہے مگر آج اس ملک میں آمریت سب سے زیادہ مضبوط ہے جبکہ نظریہ پاکستان کا یہ حال ہے کہ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کہیں اسلام نظر آتا ہے اور نہ جمہوریت۔ آپ اس ساری صورتحال کا ذمہ دار کس کو ٹھہرائیں گے۔

جواب: جہاں تک میرا سوال ہے یا جس سٹیج پر بھی ہم پہنچ چکے ہیں یہ سب ہماری اپنی لائی مصیبتیں ہیں۔ ہم نے جب تحریک پاکستان شروع کی اور پاکستان بنانے کا نعرہ لگایا تو ہم قوم پہلے بن گئے پاکستان بھی اسی لئے بن گیا اگر خدانخواستہ ہم ایک قوم نہ بنتے تو پاکستان کا قیام ناممکن تھا لیکن ہوا یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم ایک قوم کی بجائے آہستہ آہستہ قومیتوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ اسے آپ سندھی کہہ لیں، پنجابی کہہ لیں، پختون کہہ لیں یا بلوچی کہہ لیں۔ دوسری طرف ہمارے سیاستدانوں نے بھی آپس میں لڑائی جھگڑے کر کے فوج کے آنے کا راستہ کھول دیا۔ قیام پاکستان کے بعد صرف ایک سال بعد قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا اور ہم نے دس سال کے اندر اندر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ایوب خان کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقع مل گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک پاکستان کے قیام کو 59 برس ہو چکے ہیں جبکہ اس دوران 27 یا 28 برس تک فوج کی حکمرانی رہی۔ مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایوب خان کا اپنا کوئی سیاسی قبلہ نہیں تھا۔ انہوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد بنیادی جمہوریتوں کا نظام رائج کیا تاکہ ریاست کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا جو تصور تھا کہ پاکستان اسلام کی تجربہ گاہ ہوگی اس کو تہس نہس کیا جا سکے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے یحییٰ خان آئے پھر بھٹو صاحب آئے وہ بھی یونیفارم میں صدر بنے۔ اس کے بعد ضیاء الحق (مرحوم) آئے۔ اب پرویز مشرف ہیں۔ ضیاء الحق نے اپنا شورائی نظام متعارف کروایا وہ بھی ایک طرح سے فوجی نظام حکومت کا دوسرا نام تھا۔ اب پرویز مشرف کی حکومت ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا نظام لائی ہے۔ خدا نہ کرے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظام مجھے چلتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں مگر مشاہدے کی چیز ہے کہ گزشتہ تین چار سال میں کیا ہوا ہے اور آج کیا ہو رہا ہے۔ جمالی صاحب کو لایا گیا جس طرح انہیں لایا گیا اور جس طرح انہیں رخصت کیا گیا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ پھر چودھری شجاعت صاحب 45 روز کے لئے لائے گئے۔ ان کے ساتھ شوکت عزیز بھی منتخب ہو گئے، پھر بعد میں وزیراعظم بھی بنا دیئے گئے، بہر کیف یہ کوئی دائمی نظام ہے نہ ہی یہ جمہوریت ہے۔ جہاں تک آپ نے اسلام اور نظریہ پاکستان کا ذکر کیا ہے وہ تو آپ کو دور دور نظر نہیں آئے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ قصور ہمارا بھی ہے۔ سیاستدانوں کا بھی ہے اور فوج کا بھی ہے۔ فوج کے لئے تو میں ''چسکا'' کا لفظ استعمال کروں گا۔ اسے بھی حکومت کا چسکا پڑ چکا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کی وجہ سے فوج ہماری ایک ناگزیر

Marfat.com

ضرورت ہے۔آپ دیکھیں ابھی کل ہی انہوں نے میزائل کا تجربہ کیا ہے۔ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ تجربہ کس کے لئے ہے۔یقیناً یہ سوائے پاکستان کے اور کسی کے لئے نہیں ہوسکتا۔یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندوستان ایک ملک ایک قوم نہ ہونے کے باوجود ایک قوم اور ایک ملک بن چکا ہے۔آپ اگر عمرے پر جائیں تو وہاں بھی آپ کو ہندوستان سے آیا ہوا کوئی ایسا مسلمان نہیں ملے گا جو کوئی ایسی بات کہہ دے یا کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ یہ اپنی قومیت سے باہر ہے۔میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ حج کے بعد وہاں سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔پہلے میں بھی وہاں جایا کرتا تھا مگر اب میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا ہے۔نواز شریف بھی وہاں جایا کرتے تھے ان کے اباجی بھی جایا کرتے تھے۔میں نے ان سے بھی پوچھا کہ بھئی آپ رائے ونڈ اجتماع میں جاتے ہیں مگر وہاں آپ نے کبھی کشمیر کے لئے بھی دعا کی ہے۔کبھی فلسطین کی آزادی کے لئے بھی دعا کی ہے۔وہ کہنے لگے ''نہیں'' جو اجتماع کرتے ہیں پہلے میرے پاس آیا کرتے تھے مگر اب انہوں نے آنا چھوڑ دیا ہے۔میں نے ان سے کہا کہ آپ کی خبر اور اشتہار بھی لگائیں گے کیونکہ آپ مجھے تبلیغ کے حوالے سے دعوت دینے آئے ہیں اس لئے میں شرکت کروں گا مگر آپ مجھے یہ بتائیں کہ رائے ونڈ کے اجتماع میں آپ کشمیر کی آزادی کے لئے دعا نہیں کرتے۔فلسطین کے لئے دعا نہیں کرتے۔میرے اس سوال کا ان لوگوں کے پاس تو کوئی جواب نہیں ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس جواب ہے۔ان کا یہ خیال ہے کہ ''ہندوستان واپس بھی جانا ہے''۔لہٰذا اب ہم قصے کہانیوں والے اسلام پر آ گئے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ اسلام ایسا ہو جو اسلام کا جمہوری نظام دے۔اسلام کی فلاحی مملکت کا جو تصور ہے اسے پورا کرے۔اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلے یہاں کوئی مسلمان بھوکا نہیں سویا کرتا تھا لیکن اب خودکشیاں ہو رہی ہیں۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ بجلی کا بل ادا نہیں کر سکتے۔لہٰذا میرا خیال ہے کہ جب تک آپ اسلامی تصور کے تحت اسلامی فلاحی مملکت نہیں بناتے آپ اسلام نافذ کر سکتے ہیں نہ آپ نظریہ پاکستان کے فروغ کے لئے کام کر سکتے ہیں۔

س: مسلم لیگ کے حوالے سے ایک بار مسلم لیگی لیڈر سردار شوکت حیات مرحوم نے کہا تھا کہ مسلم لیگ کا مشن صرف پاکستان بنانا تھا اور وہ بن گیا مگر اس کے بعد ہر آنے والی حکومت نے اسے اپنی داشتہ اور کنیز بنا کر جیسے چاہا استعمال کیا۔آپ اس پر کیا تبصرہ فرمائیں گے؟

ج: سردار شوکت حیات نے ٹھیک فرمایا تھا۔اب وہ (مرحوم) ہیں میں کچھ کہنا نہیں چاہتا مگر ان کے والد (مرحوم) سردار سکندر حیات یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے جو آخری وقت تک تحریک پاکستان کے خلاف رہی۔

Marfat.com

ان کے جانشین خضر حیات تھے جنہوں نے لاہور میں اکالی دل اور کانگریس کے ساتھ مل کر وزارت بنائی۔مگر قائداعظمؒ کی مسلم لیگ جو اس وقت واحد بڑی پارٹی تھی انہوں نے اس کی وزارت نہیں بننے دی۔اسی فلیٹی ہوٹل میں مولانا آزاد تشریف لائے اور انہوں نے جوڑ توڑ کروا کر وزارت بنوادی۔شوکت حیات ٹھیک کہتے تھے کہ مسلم لیگ کو ہر کسی نے استعمال کیا ہے لیکن خود سردار شوکت حیات بھی مسلم لیگ کو استعمال کر کے شوکت پنجاب بنے۔وزیر بھی بنے مگر وہ آزاد پاکستان پارٹی میں چلے گئے۔اس لئے جب ''مسلم لیگیے'' ایسے ہوں گے پھر ظاہر ہے نظریاتی مسلم لیگ بنے بغیر آپ مسلم لیگ کو بامِ عروج تک نہیں پہنچا سکتے۔خواجہ ناظم الدین آئی آئی چندریگر، سردار عبدالرب نشتر اور لیاقت علی خان وغیرہ مضبوط نظریاتی لیگی تھے مگر وہ ختم ہو گئے اور ایسے لیگی برسراقتدار آئے جو نظریہ ضرورت کے تحت لیگ کو اپناتے رہے۔میں تو میاں نواز شریف سے بھی پوچھا کرتا تھا کہ آپ کی پسند کی پہلی پارٹی تحریک استقلال تھی اور اس کے پہلے لیڈر اصغر خان تھے۔قائداعظم آپ کے لیڈر تھے اور نہ مسلم لیگ آپ کی جماعت تھی۔

س: صحافت بھی ریاست کا ایک اہم ستون ہے آپ صحافت کے بانیوں میں سے ہیں،اس ملک کو اسلامی اور فلاحی ریاست بنانے میں آج کی صحافت کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

ج: ریاست کے چار ستون ہیں۔انتظامیہ،عدلیہ،فوج اور صحافت جس کا اپنا ایک رول ہے۔اگر آپ سمجھیں کہ صحافت کے بغیر اس دور میں کوئی ملک جدید کہلا سکتا ہے تو یہ ناممکن ہے آج آپ نے چودھری شجاعت کا بیان پڑھا ہو گا کہ اس ملک میں صحافت آزاد ہے۔صدر صاحب بھی سویڈن میں فرما رہے ہیں کہ صحافت آزاد ہے مگر جتنی صحافت آزاد ہے وہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں لیکن صحافت آزاد ہو، پابند ہو یا غیر جانبدار ہو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں صحافت کا ایک خاص رول ہے کیونکہ اسرائیل کے بعد بلکہ اسرائیل سے پہلے پاکستان واحد ملک ہے جو ایک نظریئے کے تحت معرض وجود میں آیا اور میرا یہ دعویٰ نہیں بلکہ ایمان ہے کہ یہ بغیر نظریئے کے قائم نہیں رہ سکتا۔اگر ہم آج نظریہ پاکستان کو چھوڑ دیں گے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ہم ہندو سے الگ ایک علیحدہ قوم ہیں اور خدانخواستہ کل وہ دوبارہ تھانیدار بن کر ہمارے اوپر آ سکتا ہے۔ہماری صحافت کا ایک قبلہ ہے وہ قبلہ درست رہنا چاہیے۔ہمارے کچھ بھائی جو پڑھے لکھے ہیں یا سیکولر ہیں وہ ایک وقت میں سوشلسٹ بنتے ہیں،سوشلزم ختم ہوتا ہے تو امریکن بن جاتے ہیں۔این جی او بنا لیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ نظریہ پاکستان کیا ہے۔مگر میں حیران ہوں کہ ان کی سمجھ میں سوشلزم تو آ جاتا ہے ان کی سمجھ میں سیکولرازم تو آ جاتا ہے۔ان کی سمجھ میں اینگلو امریکن بلاک آ جاتا ہے لیکن اگر سمجھ میں نہیں آتا تو نظریہ

Marfat.com

پاکستان نہیں آتا۔ میرا یہ خیال ہے کہ نظریہ پاکستان کے حوالے سے پاکستان کو قائد کا پاکستان بنانے کے حوالے سے آپ ایک سمت درست رکھ سکتے ہیں اور اسی طرح سے پاکستان کو ماڈرن بھی بنا سکتے ہیں جو آنے والے وقت میں باقی دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم اسے مُلاں کا پاکستان نہیں بنانا چاہتے۔ یعنی مُلاں اپنے وعظ میں جس کے کلام کو استعمال کرتا ہے، جس کا حوالہ دیتا ہے وہ اقبالؒ ہے۔ جتنے بھی پڑھے لکھے علمائے کرام ہیں آپ ان کے وعظ سنیں سیاسی تقریریں سنیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ اقبالؒ کا سکہ نہ صرف پاکستان بلکہ ایران تک چلتا ہے۔

س: ابھی آپ نے این جی اوز کا ذکر کیا یہ کون سے عناصر ہیں جو ہر روز ایک نئی این جی او بنا لیتے ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں ؟

ج: وہ آپ نے سنا ہوگا کہ ''اول خویش بعد درویش'' یہ این جی اوز ''اول پیٹ'' پر یقین رکھتی ہیں۔ اس کے بعد اگر ان کے پاس کچھ بچ جائے تب وہ دوسروں کے بارے میں سوچتے ہیں مگر سب سے پہلے ان کا اپنا پیٹ ہے جو کبھی بھرتا ہی نہیں۔

س: ''نوائے وقت'' حمید نظامی کے مشن کو آگے لے کر چلا تھا اس مشن پر ویسے ہی کام ہو رہا ہے یا کچھ مصلحتیں اور مجبوریاں راستے میں حائل ہیں۔ ؟

ج: اس سوال کا جواب تو آپ کو دینا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس مشن کو آگے بڑھا رہا ہوں اگر کوئی قربانی دینا پڑے تو اس کے لئے نہ صرف تیار ہوں بلکہ دے رہا ہوں۔ گزشتہ چار پانچ ماہ سے ہمارے گروپ کے جتنے بھی اخبارات ہیں ان کے اشتہارات بند ہیں اور اللہ کے فضل سے ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری سرکولیشن سب سے زیادہ ہے لیکن اگر آپ میرٹ پر جائیں تو ہمیں سب سے زیادہ اشتہارات ملنے چاہئیں حتیٰ کہ میں نے ضیاء الحق سے بھی کہا تھا کہ جناب ہمیں آزادی چاہیے اگر کسی کو اشتہارات کی ضرورت ہے تو انہیں اشتہارات دیں۔ آپ مہربانی کر کے ہمیں آزادی صحافت دیں۔ بھٹو صاحب نے بھی ہمارے اشتہارات بند کئے جبکہ بھٹو صاحب کے لانے والوں میں ہم بھی شامل تھے کیونکہ ہم ایوب خان کو بھجوانا چاہتے تھے وہ ایک طریقہ تھا کہ اگر بھٹو صاحب کامیاب ہوتے ہیں تو ایوب جاتا ہے مگر بھٹو صاحب کے آنے سے پہلے ہی اسلامی سوشلزم پر ہمارا ان سے جھگڑا ہو گیا کیونکہ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارا قبلہ مکہ کی بجائے ماسکو لے جانا چاہتے ہیں۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم میں تو محسوس نہیں کرتا کہ میں نے کبھی سمجھوتہ کیا ہے اگر میں سمجھوتہ کر رہا ہوتا تو ہمارے اشتہارات چار پانچ ماہ تک بند نہ ہوتے۔ باقی ہماری جو پالیسی ہے وہ تو ایک کھلا باب ہے روزانہ ہم آپ کی عدالت میں حاضر ہوتے ہیں جہاں تعریف کی

Marfat.com

ضرورت ہے وہ ضرور کرنی چاہیے لیکن جہاں تنقید کی ضرورت ہے ہم اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

س: کوہستان اور مشرق کے زمانے میں صحافت کا ایک اپنا تقدس اور وقار تھا اور مقصدیت اس کی اولین شرط تھی مگر جب سے صحافت رنگین ہوئی ہے، نوائے وقت کا بھی شاید اس حوالے سے وہ معیار نہیں رہا جب اس میں شوبز ڈسپلے کے ساتھ چھپتا ہے تب یوں احساس ہوتا ہے کہ جیسے نوائے وقت اسلامی اور نظریاتی روایات کی ڈگر سے ہٹتا جا رہا ہے۔ خصوصاً جب سے جنگ آیا ہے اس کی وجہ سے تو نوائے وقت سمیت بہت سے اخبارات کا ٹرینڈ ہی تبدیل ہو گیا ہے؟

ج: ایسا بالکل نہیں۔ ہمارا اور جنگ کا کوئی مقابلہ نہیں، جنگ سو فیصد ایک بزنس یا کاروبار ہے۔ جبکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ نوائے وقت نظریاتی اور ہمارا کاروبار مشنری ہے۔ یہ کاروبار ضرور ہے مگر کاروبار اس حد تک ہے کہ آپ نے سٹاف کو تنخواہیں دینا ہے۔ آپ نے ایک اچھا پرچہ دینا ہے جو جنگ کا مقابلہ کر سکے جو ''خبریں''، پاکستان'' کا اور ''انصاف'' کا مقابلہ کر سکے۔ پریس بہت جدید ہونا چاہیے۔ دفتر میں حالات کار بہتر ہونی چاہیے۔ جہاں اب شاہ دین بلڈنگ میں بینک بن چکا ہے کبھی میں اس دفتر میں بھی بیٹھا کرتا تھا۔ سامنے جو بلڈنگ ہے میں اس میں بھی بیٹھا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے نیوز ایڈیٹر رات کو بنیان میں کام کرتے تھے۔ جیسا کہ کوہستان میں کام ہوتا ہوگا مگر ''کوہستان'' بھی نسیم حجازی صاحب کے زمانے میں نظریاتی پرچہ تھا کیونکہ وہ بھی حمید نظامی صاحب کے ساتھی تھے مگر جب (مرحوم) عنایت اللہ نے اسے کاروباری بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی۔ کمرشل venture بنانے کی کوشش کی تب وہ اس میں ناکام ہوئے اور آپ کو یاد ہوگا تب انہیں وہ پرچہ ایوب لیگ یا کنونشن لیگ کو دینا پڑا۔ اس کے بعد مشرق آیا اور آپ نے دیکھا کہ وہ بھی بعد میں NPT (نیشنل پریس ٹرسٹ) میں چلا گیا۔ اسی طرح پی پی ایل بھی این پی ٹی میں چلا گیا۔ یہ سرکاری پالیسی بھی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ آزاد صحافت کے خلاف کچھ اور عناصر بھی سرگرم عمل تھے جس کے تحت انہیں پابند اور مجبور کیا گیا کہ اگر وہ اپنے ذرائع پیدا نہیں کر سکتے تو NPT میں آ جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بھی وہاں جا کر ختم ہو گئے جبکہ ہم تو نظریاتی صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہوئے بھی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے Most Modern پریس ہے اگر کمپیوٹر آیا ہے تو ہم نے اس میں بھی جدتیں تلاش کی ہیں جس دفتر میں آپ بیٹھے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ یہاں حالات کار اس طرح کے نہیں ہیں جیسے ماضی میں تھے۔ انسان آہستہ آہستہ ہی ترقی کرتا ہے۔ نوائے وقت اس وقت ٹرسٹ کا پرچہ ہے میں اسے ٹرسٹ میں تبدیل کر چکا ہوں، یہ میرا ذاتی یا فیملی کا نہیں ہے بلکہ اسے ایک ٹرسٹ چلاتا ہے

Marfat.com

لیکن اس کے باوجود کہ ہم کاروبار کو اس حد تک ضرور سمجھتے ہیں کہ تنخواہ دینا ہے۔ کاغذ خریدنا ہے، سیاہی کی قیمت ادا کرنی ہے، انکم ٹیکس ادا کرنا ہے لیکن جہاں Compromise نہ کرنا ہو ہم نہیں کرتے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم جمہوریت یا اسلام کے حوالے سے موجودہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کا Compromise نہیں کر رہے اور نہ آئندہ کریں گے۔

س: کہا جاتا ہے کہ اخباری انڈسٹری کے کچھ لوگوں نے اپنے اپنے وقت کے حکمرانوں سے تعلقات بنائے اور پھر زندگی بھر ان تعلقات کے ثمرات سے فیض یاب ہوتے رہے آپ کے حوالے سے بھی کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں آپ نواز شریف کے ساتھ رہے یا ان سے مفادات حاصل کئے۔ آپ کو اشتہارات نہیں ملتے یہ الگ بات ہے مگر آپ نے ماضی میں فائدے تو اٹھائے؟

ج: جہاں تک اشتہارات نہ ملنے کا تعلق ہے تو سرکولیشن کی وجہ سے اشتہارات ہمارا حق ہے۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ حکومت اگر آزادی اور اشتہارات میں سے کسی ایک کو چن لے تو میں اشتہارات کے مقابلے میں آزادی صحافت کا انتخاب کروں گا۔ میں اشتہارات کو ترجیح نہیں دوں گا اگر آپ کہتے ہیں کہ فائدے اٹھائے یا مفادات حاصل کئے میں آپ کو پوری آزادی دیتا ہوں کہ آپ کھل کر مجھ سے سوال کریں کہ اس فائدے سے آپ کی کیا مراد ہے میں Indirect فائدہ اٹھانا گناہ سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس کوئی سوال ہے تو میں حاضر ہوں اور جواب دوں گا۔

س: یہ کیا وجہ ہے کہ نوائے وقت کے مقابلے میں بعض اخبارات ایسے ہیں کہ جو اپنے ملازمین کو اس سے زیادہ پرکشش پیکج دیتے ہیں ان کی تنخواہیں نوائے وقت سے بہت زیادہ ہیں مگر اس کے باوجود ان اداروں میں لوگ مستقل نہیں ٹکتے جبکہ جو نوائے وقت میں آتا ہے وہ کم تنخواہ کے باوجود یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے یہ کیا جادو ہے ؟

ج: یہاں سے بھی لوگ بھاگے ضرور ہیں یا بھگائے گئے ہیں مثلاً ہمارے دو چار کالمسٹ جو اچھے تھے وہ دوسرے اخبارات میں چلے گئے۔ یہ ضیاء الحق دور کی بات ہے۔ ایک کالمسٹ نے کہا کہ میرے پاس واپسی کی چابی جیب میں ہے۔ جب مجھے ان کی اس بات کا پتہ چلا تو میں نے کہا ان سے کہیے گا کہ ہم نے تالا بدل لیا ہے۔ میرے ایک اور دوست بہت بڑے کالمسٹ ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میرا گزارا اتنی تنخواہ سے کم میں نہیں ہوتا۔ میں نے کہا بھائی ٹھیک ہے وہ مطلوبہ تنخواہ میں دوں گا آپ کام جاری رکھیں۔ اس سے زیادہ میں بات نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس طرح ان کا نام Indirectly عیاں ہو جائے گا مگر ایک روز انہوں نے

Marfat.com

مجھے خط لکھا جواب بھی میرے پاس پڑا ہے، اس میں انہوں نے لکھا کہ جو تنخواہ نوائے وقت انہیں دے رہا ہے اس سے ڈبل تنخواہ کی انہیں پیشکش ہوئی ہے اور ساتھ نئی کار کی چابی ہے مگر یہ حسن طلب نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ آپ دیں گے اور نہ دے سکتے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا کہ خط لکھنے میں دیر ہو جائے گی، آپ کار کی وہ چابی بھی پکڑ لیں اور تنخواہ بھی قبول کر لیں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ تو خود گئے کچھ نکالے گئے کہ جو ہم یہاں لکھوانا چاہتے ہیں وہ یہاں نہیں لکھا جا سکتا۔ By Arrangement لہٰذا آپ فلاں اخبار میں چلے جایئے۔ بعد میں ایسے صاحبان نے واپس آنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے انہیں قبول نہیں کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں باعزت رہنا اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اگر آپ کے پاس بہت بڑا ادارہ اور بہت بڑا اخبار ہے مگر خدانخواستہ آپ کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میں اپنے سٹاف کو کارکن نہیں بلکہ اپنا ساتھی سمجھتا ہوں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ چپڑاسی کو بھی اوئے کر کے نہیں بلانا چاہیے۔ تنخواہ کا جہاں تک معاملہ ہے تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ بروقت دی جائے۔ جب میں یہاں 1992 میں آیا تو ہمارے حالات کار بہت زیادہ خراب تھے۔ تنخواہ ہم قسطوں میں دیا کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ ایسے حالات تبدیل ہوتے چلے گئے کہ میں نے اسی دور میں خود چھ چھ ماہ تنخواہ نہیں لی۔ لہٰذا اسٹاف کو پتہ تھا کہ یہ شخص خود اپنی تنخواہ نہیں لے رہا اس لئے اگر ہمیں ذرا دیر سے مل جائے گی یا دوسرے اور تیسرے ہفتے میں مل جائے گی تو کوئی پریشانی نہیں۔ اب اللہ کا فضل ہے کہ تنخواہیں وقت پر دے رہے ہیں اور اشتہارات بند ہونے کے باوجود اس سال ہم نے چار بونس دیئے ہیں۔

س: نوائے وقت کی موجودہ پالیسی میں ایک سکوت اور جمود کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ جیسا کہ بعض دوسرے اخبارات ہر وقت بھاگ دوڑ میں ہی رہتے ہیں کہ فلاں چیز آتی ہے تو فوراً چھاپ دو، فلاں واقعہ ہوا ہے تو فوری رنگین اشاعت دے دو یعنی وہ ہر وقت ورائٹی کے چکر میں رہتے ہیں جبکہ نوائے وقت میں اس کی نسبت ایک سکون اور اطمینان سا دکھائی دیتا ہے؟

ج: نوائے وقت کی تو ایک مستقل ریڈر شپ ہے ہمارے قارئین تو کہتے ہیں کہ یہ ہمیں افیون کی طرح لگی ہے۔ مجھے ایک ریٹائرڈ جج صاحب کا فون آیا جو غالباً سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج تھے۔ وہ کہنے لگے کہ ان کی بات کل ہی ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس سے ہو رہی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ میں نوائے وقت میں جو کچھ زمانہ طالبعلمی میں پڑھا کرتا تھا وہ آج تک پڑھ رہا ہوں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میرٹ کا تعلق ہے تو میرے خیال میں آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ ہم ہفتے میں ایک صفحہ انگریزی کا بھی دیا کرتے تھے۔ اگر آپ اس

Marfat.com

کے باوجود کہیں کہ ہم اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہیں تو الگ بات ہے۔ اب بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ترجمے کی بجائے ایک دو مضامین اور ایڈیٹوریل انگریزی میں بھی ضرور دیں تاکہ ہمارے جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ اس کو اسی انگریزی میں انجوائے کر سکیں جس میں وہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً اکنامسٹ ہے۔ ٹائمز ہے یا ٹائم ویکلی ہے آپ اس میں سے آرٹیکل دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی کئی چیزوں میں ہم پیچھے ہیں۔ مثلاً نوائے وقت میں اگر کسی ہندوستانی ایکٹرس کی تصویر چھپ جائے تو میں جرمانہ کرتا ہوں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر قباحت میں پڑنا ہی ہے تو آپ پاکستانی حوالے سے پڑیں۔ آپ کی نشو جیسی بھی ہے اس کی تصویر چھاپ دیں۔ ''میرا'' یا ''لیرا'' جو بھی ہے چھاپ دیں مگر میں کسی بھی ہندوستانی ایکٹر یا ایکٹرس کو چھاپنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ نظریات کی بات ہے۔ آپ میرے سٹاف سے پوچھ لیں کہ اگر غلطی سے بھی بھارتی ایکٹر یا ایکٹرس کی تصویر چھپ جائے تو میں ان کو جرمانہ کرتا ہوں۔

س: ''نیشن''، فیملی نوائے وقت یا ''پھول'' کیا ان کی پالیسی نوائے وقت کی پالیسی ہے یا یہ اس معاملے میں قدرے آزاد اور خودمختار ہیں؟

ج: گروپ کی ایک پالیسی ہے البتہ ایڈیم ضرور مختلف ہوسکتا ہے مثلاً جو ''فیملی'' ہے وہ فیملی کا اخبار ہے لیکن اگر آپ اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے پر چلے جائیں آپ کو کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی کہ جس پر آپ کو اعتراض ہو کہ یہ فیملی کے اندر نہیں جاسکتی۔ اسی طرح ندائے ملت ہے اسی طرح ''نیشن'' ہے۔ میں ''نیشن'' کی ایڈیٹوریل کی جائنٹ میٹنگ کرتا ہوں کیونکہ ان کا ایڈیم مختلف ہے وہ انگریزی زبان ہے اس میں جو تھوڑی بہت آزادی ہے وہ ٹھیک ہے لیکن وہ جو بنیادی نقطہ ہے ان سے انہیں ہٹنے نہیں دیا جاتا۔ مثلاً میں نے ''نیشن'' میں ایسے کئی ایڈیٹرز کو فارغ کیا ہے کہ جن کا قبلہ درست نہیں تھا اور اب وہ دوسرے اخبارات میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

س: مجھے یاد ہے کہ جب امریکی صدر کلنٹن اور مونیکا سکینڈل منظر عام پر آیا تھا تو نیشن نے مونیکا کا وہ طویل بیان جو اس نے کلنٹن کی اخلاقی بدعنوانیوں کے بارے میں عدالت میں دیا تھا جسے بطور حوالہ پیش کرنا بھی معیوب ہے۔ نیشن نے مونیکا کا وہ عدالتی بیان دو تین اقساط میں جوں کا توں شائع کر دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ نوائے وقت کے پلیٹ فارم سے شائع ہونے والے اخبار کے لئے اس قسم کا عدالتی بیان چھاپنا مناسب تھا؟

ج: اردو میں تین تین صفحات کا ترجمہ دینا تو ویسے بھی بڑا مشکل ہوتا ہے یہ تو وقت ضائع کرنے والی بات ہوتی ہے۔

Marfat.com

س: مگر سوال یہ ہے کہ مونیکا کا یہ بیہودہ عدالتی بیان چھاپنا ضروری تھا اس سے تو نوائے وقت کے نظریاتی قاری کو بھی یقیناً دھچکا لگا ہو گا؟

ج: یہ تو ایک سسٹرز پبلی کیشنز ہے نا......ایک حد تک تو وہ فرض ادا ہو گیا۔

س: آج کل ہر طرف الیکٹرونک میڈیا چھایا ہوا ہے۔ صبح کے اخبارات جو بھی خبریں دیتے ہیں وہ گزشتہ رات جیو، اے آر وائی، انڈس نیوز وغیرہ متعدد بار دکھا چکے ہوتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں الیکٹرونک میڈیا کے آنے سے پرنٹ میڈیا کی اہمیت کم نہیں ہو گی؟

ج: یہ جیو، بی بی سی، اے آر وائی یا سی این این جن کا بھی آپ نے حوالہ دیا ہے ان کا موازنہ وغیرہ میرا اور آپ کا کام ہے۔ اخبارات کی ریڈر شپ ان چینلز کے باوجود بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ ابھی گزشتہ روز ہمارے پریس انسٹی ٹیوٹ میں ایک سیمینار تھا اس میں ایک فاضل مقرر کا تجزیہ یہ تھا کہ چینل آنے کے باوجود اخبارات کی ریڈر شپ بڑھی ہے بلکہ جو رسپانس اشتہارات کا ہے وہ بدستور ٹیلی ویژن کی نسبت اخبارات کا زیادہ ہے۔ مثلاً آپ نے ٹی وی پر کوئی اشتہار دیا ہے مگر ٹی وی ناظر نے اس وقت کوئی چینل ہی دوسرا کھول رکھا ہے تب آپ کے پیسے تو ضائع گئے مگر آپ جو اخبار خریدتے ہیں کم از کم آپ پیسے پورے کرنے کے لئے اسے چوبیس گھنٹے میں تو ضرور پڑھتے ہیں۔ عوام صرف ان اخبارات کو پھینکتے ہیں جن کو پڑھ کر پیسے اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی سرخیاں سنسنی خیز ہوتی ہیں مگر اگلے دن اخبارات میں اس حوالے سے خبر تک نہیں ہوتی۔

س: نظامی صاحب آج کل فارغ وقت میں آپ کے معمولات کیا ہیں؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اوڑھنا بچھونا ہی نوائے وقت ہے اس کے بعد ٹیلی فونک رابطہ ہے اور وہ رات ساڑھے دس گیارہ بجے تک رہتا ہے۔ چونکہ صبح مجھے نماز کے لئے جلدی اٹھنا ہوتا ہے اس لئے ساڑھے دس بجے تک سو جاتا ہوں۔ پہلے ڈیڈ لائن 10 بجے تک تھی اب دس سے تھوڑی سی بڑھ گئی ہے۔ ہمارا پہلا ایڈیشن ساڑھے دس بجے چھپ کر مجھے گھر ملتا ہے وہ میں دیکھ کر اور پڑھ کر سوتا ہوں اگر اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو نہیں ہونی چاہیے تھی تو اس کے حوالے سے متعلقہ سٹاف کو فون کرتا ہوں یا وہ چیز جو میں نے ٹی وی پر دیکھی یا سنی ان سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس آ چکی ہے۔ باقی میں تھوڑی بہت ہوٹلنگ کر لیتا ہوں یا ریسٹورنٹ چلا جاتا ہوں۔ مگر اب وہ بھی بہت کم ہو گیا ہے کیونکہ جب سے یہ معاشرہ آیا ہے اس میں لوگ اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتے۔ اس لئے میں نے بھی باہر آنا جانا چھوڑ دیا ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک نوائے وقت کو پورا وقت دیتا ہوں۔

Marfat.com

س: آپ کو عوامی آدمی کہا جا سکتا ہے؟

ج: عوامی آدمی ان معنوں میں کہ میرا عوام سے تعلق ہے۔ میں ایسے طبقے میں پیدا ہوا ایسے ماحول میں پلا بڑھا جو خالصتاً عوامی ہے۔ مثلاً ہم بیڈن روڈ پر رہتے تھے۔ اس سے پہلے میری پیدائش سانگلہ ہل کی تھی۔ میں نویں جماعت تک وہاں پڑھا دسویں جماعت لاہور میں آ کر کی۔ آپ اندازہ کر لیں کہ بیڈن روڈ کیسے طبقے کا علاقہ ہے۔ یہ 1947ء سے پہلے کی بات ہے۔

س: آپ کی ماشاءاللہ اس وقت عمر عزیز کتنی ہے؟

ج: کہتے ہیں کہ خاتون اپنی عمر نہیں بتاتی ......

س: مگر آپ تو خاتون نہیں ہیں؟

ج: آپ یقین کریں گے کہ میری عمر 75 برس سے اوپر ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تین بائی پاس کروانے کے باوجود آپ کے سامنے ہوں۔ میں نے بائی پاس کی ہیٹ ٹرک مکمل کی ہوئی ہے۔ اکثر لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ نہ بتایا کریں کہ آپ نے تین بائی پاس بھی کروائے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ میں کیوں نہ بتاؤں کیونکہ اس کے باوجود میں Active ڈیوٹی پر ہوں۔

س: ماشاءاللہ یہ تو اللہ کی آپ پر خاص عنایت ہے۔ میں آپ سے یہی سوال کرنے والا تھا کہ آپ کی صحت اور فٹنس کا راز کیا ہے۔ آپ واک کرتے ہیں، ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرتے ہیں؟

ج: جیسا بھی موسم ہو میں صبح چالیس پچاس منٹ واک کرتا ہوں۔

س: واک کے لئے کہیں باہر جاتے ہیں لارنس گارڈن وغیرہ میں۔ ؟

ج: پہلے باہر جایا کرتا تھا مگر اب میں باہر نہیں جاتا کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں نہیں چاہتا کہ اخبار میں آئیں۔

س: کوئی ایسی خواہش یا آرزو جو ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی؟

ج: حقیقت یہ ہے کہ میں صرف پاکستان کو ایک آزاد ملک دیکھنا چاہتا ہوں اور قائدؒ اور اقبالؒ کے حوالے سے جس کے لئے ہم نے اسے حاصل کیا۔ میں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ میں نے ایف اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ مجھے لیاقت علی خان سے ایک تلوار اور مجاہد پاکستان کا سرٹیفکیٹ بھی ملا۔ اب میں اسی بورڈ کا ممبر ہوں جو تحریک پاکستان کے کارکنوں کو گولڈ میڈل دیتا ہے مگر ہم نے وہ گولڈ میڈل اپنے اوپر حرام کیا ہوا ہے کیونکہ جو دینے والے ہیں وہ خود نہیں لیتے۔ میری تو ایک ہی خواہش اور تمنا ہے کہ پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک

Marfat.com

آزاد اسلامی اور فلاحی مملکت دیکھوں۔ عوام کا دور دورہ ہو۔ ان کی حکومت ہو۔ ان کے نام پر جو فراڈ چلتا ہے وہ نہیں چلنا چاہیے۔

س: تمام اخبارات اپنے اپنے چینلز کھول رہے ہیں آپ کا کوئی ارادہ ہے؟

ج: ہم نے Apply کیا ہوا ہے مگر حکومت چونکہ اخبار سے ہی پریشان ہے اس لئے شاید چینل نہ دے اگر نہ بھی ملا تو ہم باہر سے شروع کر سکتے ہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ مگر وہ چینل بھی ''نوائے وقت'' چینل ہی ہوگا۔ اس میں جو تفریح ہوگی وہ بھی ایسی ویسی نہیں ہوگی۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبرقبیلہ

Marfat.com

Marfat.com

اپنے اندر کے ضیا شاہد کو مرنے نہیں دیا

ضیا شاہد

''ستاروں پر کمند ڈالنا'' بظاہر ایک محاورہ ہے لیکن اگر پاکستان کے جواں ہمت اور حقیقی معنوں میں کامیاب صحافی ضیا شاہد کی جدوجہد سے بھرپور زندگی اور صحافتی دنیا میں ان کی کامیابیوں کے غیر معمولی ریکارڈز پر ایک نظر ڈالیں تو ان کی پیشہ ورانہ زندگی ''ستاروں پر کمند ڈالنے'' کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔ ایک پینٹر سے ایڈیٹر تک کے سفر کی کہانی کا ایک ایک لفظ صحافتی میدان میں ان کے بلند حوصلے، محنت، لگن، شوق، اپنے مقصد سے عشق، جرأت اور دلیری کی گواہی دیتا ہے، ایسے اہل ہنر بہت کم ہوتے ہیں جو تدبیر سے تقدیر بنانے کا گُر جانتے ہیں۔

ضیا شاہد نے اپنے علم و عمل سے صحافتی دنیا میں ایسے ایسے معرکے سر کئے ہیں اور کمالات دکھائے ہیں کہ ہر صاحب کمال بھی اس پر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، ضیا شاہد سے ان کی صحافتی اور نجی زندگی کے حوالے سے جو مکالمہ ہوا، پڑھنے والوں کو وہ بھی یقیناً ورطۂ حیرت میں ڈال دے گا۔

س: آپ کے شب و روز جس طرح مسلسل بھاگ دوڑ اور جدوجہد میں گزرتے ہیں دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو ابھی تک اپنی مطلوبہ منزل نہیں ملی؟

Marfat.com

ج: آدمی کی کسی بھی پروفیشن میں منزل تو کبھی بھی نہیں آتی کیونکہ پرفیکشن صرف اللہ پاک کی ذات میں ہے۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ صحافت ایک ایسا پیشہ ہے اس میں کبھی ریٹائرمنٹ نہیں ہوتی جب تک انسان زندہ ہے وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو محنت اور مشقت شروع ہی سے میری ضرورت تھی۔ میری عمر ایک سال تھی جب میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور مجھے بچپن ہی سے کمائی کے کچھ ذرائع تلاش کرنا پڑے۔ میں اوائل عمر میں پینٹنگ کیا کرتا تھا اس سے کچھ پیسے مل جایا کرتے تھے۔ سو! میں ایک ایسے پروسیس سے گزرا ہوں جس میں زندگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ غربت، تکلیف، محرومیوں اور ناانصافیوں کو بھی واضح طور پر دیکھا ہے۔ خصوصاً عدالتی اور سماجی نظام کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ جو ناانصافیوں اور ظلم کا ایک سلسلہ تھا مجھے اخبار کے ذریعے یہ موقع ملا ہے کہ جس حد تک ہو سکے ان ناانصافیوں اور ظلم کو دور کر سکوں۔ میرا مشن صرف اخبار کو پروموٹ کرنا ہی نہیں بلکہ عوامی مسائل اور مشکلات کی نشاندہی بھی کرنا ہے۔ یہ کام میری زندگی کا مقصد بھی بن گیا ہے اور ایک عادت سی بھی ہو گئی ہے۔

س: آپ جس مقام پر کھڑے ہیں کیا والدین بھی آپ کو یہی کچھ بنانا چاہتے تھے یا ان کی سوچ اور خواب کچھ مختلف تھے؟

ج: میرے والد صاحب تو فوت ہو چکے تھے ان کی طرف سے تو خواہش ہو نہیں سکتی تھی البتہ میری والدہ نے میرے بہن بھائیوں کی تعلیم پر توجہ دی۔ میری بہن نے ایم بی بی ایس کیا میرے ایک بھائی نے ایم ایس سی پی ایچ ڈی کیا جبکہ دوسرے بھائی نے بی کام اور ایم کام کیا۔ ان بہن بھائیوں نے تعلیم کے سلسلے میں کچھ وقت ملک سے باہر گزارا اور جاب وغیرہ بھی کی۔ میری والدہ کا خیال تھا کہ وہ مجھے عالم دین بنائیں گی مگر میں اس پر پورا نہیں اتر سکا۔ میں دینی مدارس میں بھی گیا مگر بیک وقت سکول کے بعد دینی مدارس کے سسٹم میں جو دوری یا اختلاف ہوتا ہے اس کی وجہ سے بات نہ بن سکی۔ بالآخر والدہ صاحبہ کے ساتھ یہ بات طے ہوئی کہ میں عربی اور اسلامیات کے ساتھ ایم۔ اے کر لیتا ہوں۔ جرنلزم ایک اتفاقی بات تھی۔ میرا کوئی ذاتی منصوبہ نہیں تھا۔ البتہ جب میں ایک اسلامی مدرسے میں ہوا کرتا تھا تو بورڈ اچھے لکھا کرتا تھا۔ مجھ سے جب پوچھا گیا کہ شام کے وقت کہاں غائب رہتے ہو تو میں انہیں بتایا کرتا تھا کہ تھوڑی بہت پینٹنگ کر لیتا ہوں اور اس سے کچھ پیسے وغیرہ کما لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب تمہارا اتنا اچھا خط ہے تو کتابت شروع کر دو۔ چنانچہ ایک اخبار کے دفتر میں بطور کاتب چلا گیا مگر ساتھ ساتھ بی اے کے پارٹ ون میں پڑھتا بھی رہا۔

س: اس فیلڈ میں آپ کے جتنے بھی ہم عمر اور ہم عصر ہیں آپ ان سب سے زیادہ چاک و چوبند اور ہشاش

Marfat.com

بشاش نظر آتے ہیں آخراتنی جدوجہد اور کام کے باوجود آپ کی اچھی صحت کا راز کیا ہے؟

ج: میں اپنے کام کو پروفیشن نہیں سمجھتا بلکہ مجھے لگتا ہے کہ شاید میرے ساتھ الٹ معاملہ ہے۔ 37 سال جرنلزم میں ہوگئے ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ پاک کا مجھ پر خاص کرم ہے زندگی موت کا تو ویسے کوئی پتہ نہیں وہ لمحہ ایک سیکنڈ بعد بھی آ سکتا ہے اور دس سال بعد بھی نہیں آ سکتا لیکن طبعی عمر کے حساب سے مجھے لگتا ہے کہ اب میرے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ میرا اب ٹارگٹ دنیاوی اعتبار سے نہیں ہے کہ مجھے اتنے پیسے کمانے ہیں۔ میں اب بھی اس گھر میں رہتا ہوں جہاں میں ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' کی ملازمت کے دوران رہتا تھا۔ میں بس اتنا ہی مکان چاہتا ہوں جہاں اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کی سہولت ہو بلکہ میں تو انسٹی ٹیوشنز بنانے کا قائل ہوں کہ ادارے بننے چاہئیں جو کم از کم اس حال میں ہوں کہ آپ کی زندگی کے بعد بھی اگر کوئی ڈھنگ کی ٹیم ہو تو وہ اسے چلا سکے۔ جیسا کہ پرنٹ میڈیا کے بعد اب ہم الیکٹرونک میڈیا کی طرف جا رہے ہیں اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو پرنٹ میڈیا کے بعد اس میں بھی کوئی ایسا نیا تجربہ کروں گا جو پہلے نہ ہوا ہو۔ میں نے جنگ میں سات سال اور نوائے وقت میں 9 سال کام کیا اس کے بعد اپنے کچھ پرچے نکالے۔ پھر جب میں نے ''پاکستان'' نکالا تو وہ جنگ اور نوائے وقت کا ایک خوبصورت مکسچر تھا۔ اس کے بعد جب ''خبریں'' نکالا تو میرے لئے وہ سب سے مشکل تجربہ تھا، پیسے جمع کرنا، کمیٹی بنانا، اور آٹھ نو سو شیئر ہولڈرز کے ساتھ چلنا وغیرہ چنانچہ اس مرحلے پر ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسی پالیسی تلاش کی جائے جو پہلے سے موجود اخبارات کی نہ ہو۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ عوام کے مسائل اور مشکلات کی نشاندہی اور ان کے حل کے لئے کوئی کام کیا جائے۔ اب اتنے زیادہ Issue ہیں جو مجھے دیکھنا ہوتے ہیں۔ مثلاً کل میں مرید کے گیا۔ آج ایمن آباد جاؤں گا اور شاید کچھ روز بعد ساہیوال جیل میں قیدیوں کے مسائل سے آگاہی کے لئے بھی جاؤں۔ میرے پاس اس قسم کے بے شمار مسائل پڑے ہیں۔ میں اندرون سندھ میں بھی سفر کرتا ہوں اسی مقصد کے لئے وہاں سے سندھی اخبار بھی نکالا۔ لہٰذا یہ آپ کی لائف کا ایک حصہ بن جاتا ہے کہ کیا آپ اخبار کی مدد سے سماجی سسٹم کو پنچایت سسٹم کو پولیس کے دباؤ اور صوبے کے لوگوں کے لئے انصاف کی فراہمی کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس کام میں کم از کم مجھے تو بہت لطف آتا ہے اس قسم کے کاموں سے مجھے بڑی تقویت اور حوصلہ ملتا ہے۔ میری جسمانی تھکن اسی وقت غائب ہو جاتی ہے جب ہماری Contribution سے کچھ بہتری ہوتی ہے۔

س: ایک ایڈیٹر سے مالک بننے پر آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: بنیادی طور پر میں ایڈیٹر ہی ہوں مالک تو بڑا عجیب سا لفظ ہے اصل میں ہمارا ادارہ بھی تو ایک پبلک

Marfat.com

لمیٹڈ ہے اس کے آٹھ سو شیئر ہولڈرز اور 22 ڈائریکٹرز ہیں۔ لہٰذا یہ جزوی طور پر ہی ملکیت ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ مالک تو بہت سارے ہیں البتہ ایڈیٹر ہونا ذرا مشکل کام ہے۔ بنیادی طور پر میں آج بھی ایڈیٹر ہوں تاہم یہ بات بڑی واضح ہے کہ ہمارے ملک میں عامل صحافیوں نے اخبارات نکالے اور فیل ہو گئے۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ اتنے بڑے نام کہ جو مجھ سے بہت سینئر تھے مگر وہ فیل ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھا کالم نویس محض اچھا کالم نویس ہے، ایک اچھا نیوز ایڈیٹر صرف اچھا نیوز ایڈیٹر ہے، حتیٰ کہ ایک اچھا ایڈیٹر جو رپورٹنگ یا ایڈیٹوریل اور ایڈورٹائزنگ کے شعبے کو نہیں جانتا۔ فنانسز کو نہیں جانتا حتیٰ کہ وہ اخبار کی نیوز پیپر مینجمنٹ کو نہیں جانتا اس لئے فیل ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے مجھے اپنے کچھ کامیاب اور ناکام تجربات کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ مجھے نوائے وقت کراچی میں تین سال ریذیڈنٹ ایڈیٹر شپ کا موقع ملا اور ''جنگ'' میں بھی Independent کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا، اس کے بعد ''پاکستان'' کا Venture بھی میرا اپنا تھا۔ ''خبریں'' میرا اپنا اخبار ہے میں نے تھوڑی سی نیوز پیپر مینجمنٹ سیکھی جبکہ سادہ ایڈیٹر شپ ذرا مختلف چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ادارے کو بہتر بنیادوں پر استوار کر سکا۔

س: ''خبریں'' میں بہت سے سینئر لوگ آئے اور چلے گئے، کیا وہ آپ کے ساتھ چل نہیں سکے یا ''خبریں'' کے سسٹم کو سمجھنے میں ناکام رہے؟

ج: ایسی بھی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سینئرز میں ایک پرابلم یہ ہے کہ ایک تو شخصی تضاد کا مسئلہ ہے۔ میں بڑے پیار سے ایک سینئر آدمی کو لاتا ہوں، میرا خیال ہوتا ہے کہ وہ سیکشن سنبھال لیگا لیکن اوّل تو وہ جرنلزم کے کسی نئے تقاضے کو سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ ان کے فکسڈ آئیڈیاز ہوتے ہیں۔ وہ اس سے آگے بڑھنے کے لیے کسی طور تیار ہی نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ کامیابی اور آسانی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو نوجوان ہوں صحافت میں نئے آئے ہوں اور کچھ کرنا چاہتے ہوں پھر آپ اگر ان کو تھوڑا سا گائیڈ کر دیں تو ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ینگسٹرز آپ کی کسی بات کو سن کر برا محسوس نہیں کرتے وہ آپ کو ایک استاد اور بڑا تسلیم کرتے ہیں۔ پرانے آدمی کے ذہن میں ہوتا ہے کہ یہ کون آدمی ہے جو کل تک ہمارے ساتھ تھا وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے اور اپنے پرانے تجربات کو ہی ترجیح دیتے ہیں اب پچھلے تین چار ماہ سے میں اس فکر میں ہوں کہ پرنٹ میڈیا سکڑ رہا ہے اور الیکٹرونک میڈیا آ کر اس پر چڑھائی کر رہا ہے۔ ساری رات ٹی وی پر پٹیاں چلتی رہتی ہیں جو ہم صبح اخبارات میں چھاپ دیتے ہیں اب تو آپ الیکٹرانک میڈیا سے ایک قدم آگے آئیں یا Exclusive پر

Marfat.com

آئیں وگرنہ تو تین روپے کا اخبار بھی وہ ساری ضرورت پوری کر دیتا ہے جو صبح آپ رات بھر کی خبریں دیکھتے رہے ہیں۔ رات بارہ بجے تک الیکٹرونک میڈیا پر تقریباً ہر چیز مکمل ہو چکی ہوتی ہے اور یہ پرنٹ میڈیا کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ بلاشبہ اس میں الیکٹرونک میڈیا پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔ مثلاً کل جو بس کا حادثہ ہوا اس کی تفصیلات تو رات کو آ چکی ہیں اب اگلی صبح آپ اخبارات میں کیا دیں گے۔ پرویز مشرف کی تمام تقاریر رات بھر سنائی جاتی ہیں پھر صبح آپ کیا دیں گے۔ لہٰذا میرے خیال میں اس وقت پرنٹ میڈیا کو سب سے بڑا چیلنج یہ درپیش ہے کہ اس کی Creditability کو دیکھا جائے اور ایسے راستے تلاش کئے جائیں کہ الیکٹرونک میڈیا گھر میں ہونے کے باوجود صبح لوگ سات روپے کا اخبار خریدنے پر مجبور ہوں۔

س: کیا دوپہر کے اخبارات نے صبح کے اخبارات کی سرکولیشن اور اس کے بزنس کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دوپہر کے اخبار کی جو لیڈ ہوتی ہے وہ صبح سنگل کالم خبر بھی نہیں ہوتی۔ عام تاثر یہ ہے کہ لوگ دوپہر کے اخبار کو چسکے کے طور پر خریدتے ہیں۔ ؟

ج: میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ اس کے الٹ اعداد و شمار پیش کرتا ہوں۔ میں ٹھوس بنیادوں پر بات کر رہا ہوں۔ اس وقت صبح کے اخبارات کی اشاعت کم ہو رہی ہے۔ میں اکثر دوسروں سے بات بھی کرتا ہوں کہ اتنے بھاری بجٹ کے صبح کے اخبارات کم ہو رہے ہیں جبکہ ایوننگز بڑھ رہے ہیں اس کا عام جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وہ سنسنی خیزی کرتے ہیں مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ صبح کے اخبارات پر حکومت کا سوسائٹی کا اور ایڈورٹائزر کا پریشر بہت زیادہ ہے۔ آدھا صفحہ اشتہارات میں نکل جاتا ہے۔ باقی آدھے میں صدر، وزیراعظم، وزیر اطلاعات، وزیراعلیٰ اور اپوزیشن نے بھی آنا ہوتا ہے۔ مزید جگہ ہو تو ایک کرائم کی خبر اور ایک انٹرنیشنل خبر کے ساتھ اخبار ختم جبکہ ایوننگز کو ایک تو اشتہارات نہیں ملتے۔ کمرشلز بھی بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے ایوننگز ہارڈ نیوز تلاش کرتا ہے۔ وہ نہ تو سرکاری اشتہارات کی وجہ سے مجبور ہے کہ بڑی بڑی سرکاری خبریں چھاپیں نہ ہی وہ چھپی خبروں کو دہراتا ہے بلکہ اس نے تو سیل کرنا ہے۔ اس وقت میری اطلاع کے مطابق لاہور، کراچی اور اسلام آباد سے اردو کے اخبارات میں سرکولیشن کے اعتبار سے دو قسم کے اخبارات ہیں۔ نمبر 1 ایوننگز اور نمبر 2 کم قیمت والے اخبارات۔

س: آپ کو اس ملک نے عزت، شہرت اور نام دیا، آپ نے جواب میں اس کو کیا دیا ؟

ج: سب سے پہلے تو میں نے اس ملک میں جرنلزم کو ایلیٹ کلاس سے کھینچ کر Mases میں لانے کی کوشش کی، اس میں کسی حد تک کامیاب ہوا اور کسی حد تک ناکامیاب رہا۔ دوسرا میں نے اخبار کو ایک عدالت اور

Marfat.com

کھلی کچہری کی شکل دی جس میں پرنٹ میڈیا کے دباؤ سے لوگوں کے مسائل حل ہوئے ،اس کے علاوہ میں نے اپنے اخباری اداروں میں لیگل سیکشن بنا کر سارے کیس خود لڑے، بہت ساری چیزوں کو خود عدالت میں لے کر گیا۔خاص طور پر سپیشل Pro blems مثلاً پنجاب میں مختاراں مائی کا کیس میانوالی کا ونی کیس بچوں کے معاملات اوران سے بدسلوکی ۔مختلف علاقوں میں بڑے لوگوں کا چھوٹوں پر تسلط ۔ہم نے اس بارے میں محض خبریں ہی نہیں چھاپیں بلکہ میں اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اور خود میرا ادارہ بھی ایک پارٹی بنا۔ہم نے اس پر فائیٹ کی ، ہمارے لوگوں کو گولیاں لگیں ، چھرے لگے ، ہمارے خلاف مقدمات درج ہوئے ، ہمارے اوپر حملے ہوئے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرنلزم میں اگر چہ دوسرے حضرات جو مجھ سے بہت سینئر ہیں جن کی میں بڑی عزت کرتا ہوں مگر وہ شروع شروع میں مذاق اڑاتے تھے کہ یہ فوزم کیا ہوتا ہے مگر میں نے جرنلزم میں اس کی ابتداء کی، شہر سے باہر بھی انسپکشن ٹیمیں بنائیں ،کھلی کچہریوں کی ابتداء کی ،فوٹو گرافرز اور رپوٹرز کو عوام تک لے کر گیا،اس میں مجھے بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر میں سمجھتا ہوں کہ Trend Setter کے طور پر اردو جرنلزم میں یہ نئی چیز تھی جس کی میں نے کوشش کی۔

س: آپ اپنے قلم سے اس ملک کے عوام ، سیاستدانوں اور حکمرانوں کی کس حد تک اصلاح کر پائے ہیں؟

ج: میرا ایمان ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے بڑی شخصیت اس دنیا میں پیدا ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو پائے گی ۔ یہ ہمارا مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ایمان ہے ۔ جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو سعودی عرب کا ایک بڑا حصہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا اسی طرح سے بہت بڑے بڑے سکالرز جو ہیں وہ بھی سو فیصد دنیاوی اصلاحات کر کے یہاں سے رخصت نہیں ہوئے لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ رسول پاک ﷺ کے نقش قدم پر ہم کس حد تک چلے ہم تو ان کی جوتیوں پر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہیں ۔لہٰذا جب ہمارے ہادی اور اصل لیڈر نے ہمارے اصل رہنما نے اتنی بڑی تحریک کی ابتداء کر دی تو پھر اس سے آگے بھلا کیا بات ہو سکتی ہے ۔ میرے خیال میں کسی شخص کی کامیابی یہ نہیں ہوتی کہ وہ پورے نظام کو بدل دے ۔شاید ایسا کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ نظام کی تبدیلی میں چھوٹا سا کل پرزہ بننے کی ایک Approach ضرور رکھتا ہے ۔ میں نے دینی اعتبار سے رسول پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کو تھوڑا نہیں بلکہ بہت زیادہ پڑھا ہے میں جس اخبار میں بھی رہا میں نے روشنی ،کرنیں یا چھوٹا سا اسلامی کالم ضرور شروع کیا اور یہ میرا یقین تھا کہ اخبار میں سنجیدہ قسم کے مضامین نہیں پڑھے جاتے مگر ایک چھوٹا سا واقعہ جو رسول ﷺ ،صحابہؓ کی شخصیت پاک اور سیرت کے حوالے سے ہو وہ ضرور پڑھا جاتا ہے ۔ میں نے پنجابی اور سندھی کے جو اخبارات شروع کئے ہیں ان میں بھی اس قسم کا اسلامی واقعہ

Marfat.com

میں روزانہ ضرور دیتا ہوں وہ خشک یا متنازعہ نہیں ہوتا صرف ایک واقعہ ہوتا ہے سیاسی طور پر میرا آئیڈیل قائداعظمؒ ہیں میں نے ان کو بھی بہت پڑھا ہے ان پر فلم بھی بنانا چاہتا ہوں۔ زندگی نے مہلت دی تو ضرور بناؤں گا اگر ہم نے ٹیلی ویژن چینل شروع کیا تو میں قائداعظمؒ کی شخصیت اور خدمات پر سیریل بناؤں گا۔ پاکستان کے سیاسی معاملات میں جس چیز پر بھی آپ کو مشکل نظر آئے تو اس صورت میں اگر آپ قائدؒ کی لائف اور ان کی تعلیمات کو دیکھ لیں تو اس کی روشنی میں آپ اپنے معاملات سدھار سکتے ہیں۔

س: آپ پاکستان کے تقریباً ہم عمر بھی ہیں اور ہم عصر بھی، پاکستان جن مقاصد کے لئے بنایا گیا تھا کیا ہم وہ مقاصد حاصل کر پائے ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ دار ہماری لیڈر شپ ہے۔ قائداعظمؒ کی وفات کے فوراً بعد وہ فیوڈلز جو اپنی وقتی ضرورت کے تحت انگریز سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے اور جنہوں نے مسلم لیگ کی کشتی میں چھلانگیں لگا دی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ملک کے جاگیرداروں اور بیوروکریٹس نے آرمی سے مل کر یہاں کوئی بھی سسٹم چلنے نہیں دیا مگر اب امید یہ پیدا ہو چلی ہے کہ جس طرح سے سماجی، معاشی اور سیاسی شعور پیدا ہو رہا ہے پوری دنیا ایک سٹیٹ بن رہی ہے اور ہم یہاں بیٹھ کر کیلی اور بش کے الیکشن کی باتیں کرتے ہیں، معلومات کے خزانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ایک عام آدمی کا Conscious Level اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ حیرت ہوتی ہے مثلاً جب میں چونیاں میں جا کر بات کرتا ہوں یا وہاڑی جاتا ہوں یا کہیں سے بھی جب مجھے آنے کی پیشکش ہوتی ہے تو میں جاتا ہوں۔ میری نظر میں لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے ایلیٹ کلاسز کے فائیو سٹار ہوٹلز میں سیمیناروں کی کوئی ویلیو نہیں ہے کیونکہ اصل معلومات آپ کو کامونکی میں، پتوکی میں اور میر پور خاص میں ملتی ہیں یا صوبہ سرحد کے بدین میں جا کر ملتی ہیں۔ مردان اور کوہاٹ میں ملتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کا شعور بلند ہو رہا ہے۔

س: صحافت کی دنیا میں آپ کا استاد کون ہے؟

ج: ویسے تو بہت میرے سینئر رہے ہیں، میں نے ابتداء میں الطاف حسن قریشی صاحب کے ساتھ کام کیا، مجید نظامی، میر خلیل الرحمٰن اور میر شکیل الرحمٰن کے ساتھ کام کیا، میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھا، میں ان کا بہت شکر گزار ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اصل استاد زمانہ ہے اس کی ٹھوکریں ہیں، اس کے دھکے ہیں۔ بار بار ملازمت سے محرومی رہی۔ میں نے تو جیل بھی کاٹی ہے اور شاہی قلعہ بھی دیکھا ہے۔ دراصل یہی وہ تجربات ہیں جو آدمی کو سکھاتے ہیں، البتہ سینئرز کے پاس راہنمائی کے لئے جانا پڑتا ہے۔ آدمی کو بے استادہ بھی نہیں ہونا

Marfat.com

چاہیے کیونکہ بنیادی طور پر اپنی زندگی اور اپنی جدو جہد میں سے ثمرات ملتے ہیں۔

س: دس سال پہلے آپ جتنی محنت کرتے تھے اور جتنے گھنٹے کام کرتے تھے آج بھی اتنی ہی محنت کرتے ہیں؟

ج: اللہ کا بڑا شکر ہے میں بہت زیادہ صحت مند ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ کام کے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتا۔ جس دن چھٹی ہو مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ حتیٰ کہ اتوار کو بھی اپنی مرضی سے ہاف چھٹی کرتا ہوں اور دو بجے دفتر چلا جاتا ہوں کیونکہ میں اپنے کام میں اتنا Involve رہتا ہوں کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی خاص تفریح ہے نہیں۔

س: عدنان صاحب اور امتنان صاحب کے ہاتھ بٹانے سے آپ کے کام کا بوجھ کچھ کم ہوا؟

ج: صرف عدنان صاحب یا امتنان صاحب نہیں ہیں وہ چونکہ میرے بیٹے ہیں اس لئے ان کے نام زیادہ Discuss ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایک کمپنی ہوتی ہے وہ بھی شروع سے ڈائریکٹر تھے۔ بلکہ ہم نے بہت سے لوگوں کی ایک ٹیم تخلیق کی ہے جس میں عدنان اور امتنان بھی شامل ہیں۔ یہاں پر عظیم نذیر اور سرفراز سید صاحب ہیں۔ کراچی میں شبیر صاحب اور ملتان میں بھی ایسے ساتھی ہیں۔ انہوں نے پورے پورے Ventures سنبھالے ہیں۔ اس دوران بہت سے اچھے ورکرز بھی سامنے آئے لیکن زیادہ تر یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جوانی میں میرے پاس آئے۔ چاہے ان کے ساتھ کوئی رشتہ تھا یا وہ میرے ساتھی تھے۔ میرے ذہن میں ایک چیز ہے کہ آپ مجھے ایک نوجوان دے دیں جو میڈیا کر ہو اور بہت زیادہ باصلاحیت نہ ہو مگر میں اس سے ایک ہی چیز مانگوں گا۔ ایک تو وہ Willing ورکر ہو۔ ہڈ حرام اور بدنیت نہ ہو۔ پروفیشن کے اعتبار سے ایماندار ہو۔ مثلاً میں خود شراب نہیں پیتا، سگریٹ نہیں پیتا، میری کوئی ہوٹل لائف نہیں ہے۔ ایسی باتیں کرنے میں کوئی نیکی کا دعویٰ نہیں کرتا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ایسی چیزیں آدمی کے پروفیشن کو کھا جاتی ہیں اگر آپ نے آگے آنا ہے تو آپ کو اپنی زندگی میں ایک ڈسپلن قائم کرنا ہوگا۔

س: کرپشن کی آپ نے بات کی۔ عام اخبارات میں رپورٹرز یا فوٹو گرافرز کی جتنی تنخواہ ہوتی ہے اس سے تو ان کے پٹرول کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں یہ غلط ہے یا درست مگر ان پر الزام ہے کہ وہ کاروبار زندگی چلانے کے لئے کچھ دوسرے ''طریقے'' بھی اپناتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ تاثر کسی حد تک درست ہے۔ جو اخباری ادارے افورڈ کر سکتے ہیں مثلاً ہمارے زمانے میں شروع شروع میں بہت مشکلات تھیں۔ ہمارے ہاں جس بنیادی تنخواہ پر لوگ آتے ہیں وہ پانچ ہزار ہے جبکہ ہمارے

Marfat.com

پاس Highest Salary 45000 روپے ہے۔ اگر ادارہ افورڈ کرے تو ورکرز کو اچھے پیسے ملنے چاہئیں لیکن فرض کیجئے ادارے افورڈ نہیں کرتے تو پھر بھی غلط طریقے استعمال نہیں کرنے چاہئیں میں نے جرنلزم کے ساتھ ساتھ تراجم کئے ہیں۔ کتابیں ترجمہ کی ہیں، اس کے علاوہ دواؤں کے پیکٹوں میں جو چٹ ہوتی ہے اس سے بڑے پیسے کمائے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مشکل دور ہوتا ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ چار یا پانچ ہزار تنخواہ میں گزارا نہیں کرسکتے اور کرپشن شروع کر دیتے ہیں۔ دال روٹی تو آپ کو ملتی رہے گی مگر آپ کبھی بھی اپنے پروفیشن میں کوئی بہتر مقام حاصل نہیں کرسکیں گے۔ کرپشن اپنے ساتھ جانبداری لے کر آتی ہے۔ جس میں پیسے بھی ہیں، میں بہت گناہ گار آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر آج میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جاؤں تو اس معاملے میں اتنا مطمئن ہوں کہ پوری زندگی نہ میں نے پیسے لے کر کچھ چھاپا ہے اور نہ ہی میں نے پیسے لے کر کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔ نوجوانوں کے لئے بھی میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ اضافی آمدن کے ذرائع پیدا کریں مگر یہ رشوت نہیں ہونی چاہئے۔

س: جو آدمی سچ بولتا ہے یا کہتا ہے کہ ’’جہاں ظلم وہاں خبریں‘‘ ظاہر ہے ہمارے معاشرے میں ایسے شخص کو کم ہی پسند کیا جاتا ہے آپ کو یہ قدم اٹھا کر مشکلات پیش آئیں؟

ج: یہ کسی حد تک درست ہے کہ اس وجہ سے بہت سارے لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں بلکہ مجھ پر بڑے الزامات لگاتے ہیں۔ جس پر مجھے بڑی ہنسی آتی ہے مگر میں ذرّا بھی برا نہیں مانتا کیونکہ میرے نزدیک کام کی بات یہ ہے کہ یا تو آپ بالکل یتیموں اور مسکینوں کی طرح سے بزدلانہ جدوجہد کریں اور سب آپ کو اچھا کہیں۔ ظاہر ہے جب آپ کسی کرپٹ شخص کے خلاف اٹھیں گے تو وہ آپ کے خلاف ہو جائے گا۔ لہٰذا میری خواہش ہے اور اللہ پاک سے میری یہ دعا ہے کہ جو آدمی آپ کو برا کہتا ہے لوگ اسی کے بارے میں عام رائے یہ رکھیں گے کہ وہ خود برا ہے مگر سوسائٹی کے جو اچھے اور معقول لوگ ہیں وہ آپ کو برا نہ کہیں۔

س: آپ کے اندر ایک بہت بڑا ادیب بھی چھپا بیٹھا ہے۔ جرنلزم کی فائلوں میں وہ خوبصورت ادیب کہاں دب کر رہ گیا ہے؟

ج: جرنلزم سے بھی زیادہ میں شاید اتنی صحافت نہیں کرتا جتنی میں مینجمنٹ کرتا ہوں۔ ہمارے سات اخبارات سات شہروں سے نکلتے ہیں۔ ان شہروں میں کبھی جانا ہی پڑتا ہے۔ 6 شہروں میں مقامی ایوننگر نکلتا ہے، تین شہروں سے سندھی اور تین شہروں سے پنجابی اخبار نکلتا ہے۔ کوئٹہ ہمارا آٹھواں سٹیشن بن رہا ہے۔ میں ان کاموں میں اتنا زیادہ مصروف رہتا ہوں مگر میں آپ کی بات سے متفق ہوں میں کبھی کبھار لکھا کرتا تھا میری

Marfat.com

ایک آدھ کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ جب میں لاہور میں آیا تو میں فلمی رائٹر بننا چاہتا تھا، جس جس طرح اس عمر کے لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ وہ فلمی ایکٹر بنیں مجھے کبھی ایسا شوق نہیں ہوا میں نے کچھ فلموں کے لئے لکھنا بھی شروع کیا۔ ٹی وی تو خیر بہت بعد میں آیا مگر جن پروڈیوسرز کے ساتھ میں نے کام شروع کیا میں نے دیکھا کہ وہ فلمی رائیٹر کے ساتھ بہت بیہودہ اور بدتمیزی سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس سے چائے وغیرہ بھی منگواتے ہیں اس زمانے میں فلمی رائیٹر کو محض ایک منشی سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس زمانے میں استاد دامن نے متعارف کروایا تھا۔ تب میں اردو ڈائجسٹ میں جاب کیا کرتا تھا جس میں طویل کہانیاں کتابوں کے غیر ملکی تراجم بھی چھپتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بڑے ناولوں سے کہانیاں لے کر فلم کیلئے Adopt کی جا سکتی ہیں۔ میں نے دو کہانیوں پر کام بھی شروع کیا مگر اس وقت فلم رائیٹر کا مقام دیکھ کر اس کام سے باز رہا۔ اب بھی اگر مجھے الیکٹرونک چینل کھولنے کا موقع ملا تو چونکہ وہ میرا اپنا چینل ہوگا اس پر میں کوئی Compromise نہیں کروں گا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ میں اس کے لئے کوئی سیریل لکھوں۔ میری سوچ ابھی تک یہی ہے کہ میں جرنلسٹ کے نام سے ایک ڈرامہ سیریل بناؤں کیونکہ اخبار نویس کے حوالے سے ریاض بٹالوی کی سیریل ضرور بنی تھی لیکن وہ افسانوی تھی۔ اس میں اخبار نویس نثار قادری کو بنایا گیا تھا جو ہر وقت ماچس مانگتا تھا۔ آپ بھی اخبارات میں کام کرتے ہیں، اخبارات میں روزانہ اتنی کہانیاں آتی ہیں، اگر ان کہانیوں کو آپ ٹرانسفارم کریں تو اچھی چیز بن سکتی ہے۔ اسی طرح میری یہ بھی خواہش ہے اور میں منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہوں کہ اگر مجھے چھ ماہ کی فرصت مل جائے تو میں ایک خوبصورت فلم لکھوں، دو ایک مرتبہ میں نے تیاریاں بھی کیں، فنانسرز کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ کروڑ، ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کا بجٹ نہیں ہوتا مگر اس سے پرنٹ میڈیا Demage ہوگا کیونکہ جو کچھ میں نے بنایا ہے جب تک میری زندگی ہے میں اسے نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہتا۔ میرا ارادہ دو چینل لانے کا ہے ایک فل ٹائم کامیڈی چینل ہوگا۔ دوسرا نیوز چینل ہوگا۔ ابتدائی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جنوری تک دونوں پراجیکٹ لانچ کر دوں۔

س: آپ نے ٹی وی چینل کا نمبر 5 تجویز کیا۔ مکان کا نمبر 5، گاڑیوں کے نمبر 5 آخر یہ پانچ کی کہانی کیا ہے۔ یہ کوئی آپ کا لکی نمبر ہے؟

ج: یہ تو بس ایسے ہی مذاق ہی مذاق میں بات شروع ہوئی تھی۔ یہ تو اللہ کی طرف سے چانس تھا مکان کا نمبر 5 تھا، پھر خبریں 5۔ پنج محل روڈ سے شروع کیا۔ ہماری فیملی کے لوگ 5 تھے۔ یوں آہستہ آہستہ گھر میں بچے بھی یہ خیال کرنے لگے کہ شاید پانچ ہمارے لئے اچھا نمبر ہے۔ میں ان چیزوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا، مگر

Marfat.com

میرے بیٹے عدنان کی خواہش تھی کہ اس نے کہا کہ چینل 5 میں تجویز کروں گا۔ بہر حال نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب میں نے خبریں نکالا تو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ فضول نام ہے۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ نوائے فلاں یا نظریہ فلاں ہونا چاہیے۔ میں نے کہا خبریں سادہ سا نام ہے۔ ٹی وی پر بھی چلتا رہتا ہے۔ سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی سا بھی نام ہو بے شک آپ انسانوں کے نام رکھ دیں۔ رشید یا مجید کے نام سے اخبار نکال لیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب بھی میرے ذہن میں ٹی وی کا آسان اور سادہ سا نام ہے مگر اصل چیز یہ ہے کہ آپ اس پر دکھاتے کیا ہیں۔ موجودہ ٹیلی ویژن بڑے مضبوط ادارے چلا رہے ہیں۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ آپ اپنے ٹی وی چینل پر کیا دکھائیں گے۔ آج کل میں اپنا دماغ اس پر لڑا رہا ہوں۔ جس طرح میں نے جرنلزم میں تھوڑا سا راستہ تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے، ٹی وی چینلز میں بھی اسی قسم کا راستہ تلاش کریں گے جس کے لئے سب سے زیادہ مجھے ینگسٹرز کی ضرورت ہے جن کے ذہن میں کوئی نئی سوچ ہو، میں بڑے بڑے مشاہروں پر خلیفوں کی خدمات حاصل کرنے پر یقین نہیں رکھتا۔ بشرطیکہ اسے کام کرنے کا کوئی موقع دیا جائے۔ اسے تھوڑی سی Know how مل جاتی ہے کہ یا اس طرح سے کرلیں۔ میں اس چیز کو اپنانا چاہتا ہوں جو کوئی دوسرا نہ کر رہا ہو۔

س: آپ نوجوانوں سے بھی زیادہ جوان لگتے ہیں مگر جب نوفل آپ کو دادا ابو کہتا ہے تب آپ کو کیسا لگتا ہے ؟

ج: (قہقہہ) بڑا اچھا لگتا ہے اصل میں ہر مرد کی اپنی خوبصورتی ہے۔ ینگسٹر ہونا بڑی اچھی بات ہے مگر دادا اور نانا سننا بھی اچھا لگتا ہے۔ میں تو نانا بھی ہوں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے دونوں نواسوں سے بہت پیار تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگلی جنریشن سے آدمی کی محبت ٹرانسفر ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے عدنان اور امتنان شاید مجھ سے ڈانٹ ہی کھاتے ہوں مگر قدرتی طور پر مجھے اپنی بیٹی سے بڑا پیار ہے۔ وہ بڑی اچھی اور محنتی لڑکی ہے جس نے کسان ٹائم چلایا وہ ایک ہسپتال میں ڈاکٹر تھی۔ میرا داماد بھی بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کام کے لئے اپنے گھر کا بندہ چاہیے۔ میں نے بڑے سینئر لوگوں کو اپنایا مگر جو میں چاہتا تھا وہ میری بات نہیں مان سکے۔ جس سے میں اپنی تکنیک منواؤں ہر شخص کہتا تھا کہ کسان ٹائم بند ہو جائے گا یہ دو ماہ بھی نہیں چل سکے گا۔ لاکھوں روپے اس کے ایک ٹائم کے لئے جاتے ہیں مگر مجھے پتہ تھا کہ یہ چل جائے گا۔ مگر اس کے لئے کوئی گھر کا بندہ تلاش کروں۔ یہ خوبی مجھے اپنی بیٹی میں نظر آئی وہ بہت نمازیں بھی پڑھتی ہے اس نے مجھے کہا میرا کیا تعلق ہے ٹی وی سے مگر جب میں اس کو لے کر آیا تب ایک تو

Marfat.com

ادارے کا ماحول اچھا تھا وہ فلم ٹی وی کا ماحول لگتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے اتنا Strict ماحول بنایا ہے کہ کوئی بندہ گپ شپ نہیں لڑا سکتا، مگر اس سے پہلے شروع میں جب باہر کے لوگ لے کر آیا جب بیٹی یہاں نہیں ہوتی تھی تو مجھے اس وقت بہت صدمہ ہوا جب میں نے ایک کمرے میں شراب کی بوتل دیکھی۔ مجھے پتہ چلا کہ رات لوگ ریہرسل کرنے آئے تھے اور انہوں نے یہاں بیٹھ کر شراب پی۔ اسی دن میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں میری بیٹی ہونی چاہیے جو یہاں انتہائی خوفناک ڈسپلن میں رکھے۔

س: آپ کو اپنے کام سے جنون کی حد تک عشق ہے، کبھی ویسے عشق کیا ہے؟

ج: اب اس عمر میں ہم اپنے عشق بتائیں گے تو کیا ہوگا۔ بیوی سے تو بندہ ساری عمر ڈانٹ کھاتا ہے مگر اب بچوں کی نظر میں بھی ذلیل ہوگا، یہ تو لائف کا ایک حصہ ہے اس کے مختلف ادوار ہوتے ہیں۔ ایک عمر میں آدمی یہ سارے ہی کام کرتا ہے مگر ہر چیز عمر کے ساتھ اچھی لگتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ترجیحات بھی بدل جاتی ہیں۔ اب اس عمر میں آدمی کچھ اردگرد دیکھتا ہے کچھ اپنے بچوں کو دیکھتا ہے اور کچھ یہ دیکھتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور کہاں پیش ہونا ہے۔

س: آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کا خیال ہے کہ آپ کی محبت میں انتہا اور غصے میں بھی انتہا۔ آپ کے ان دو رویوں کے درمیان اس قدر عدم توازن کیوں؟

ج: یہ ٹھیک ہے، میں انتہا پسند ہوں، سختی میری طبیعت میں ہے مگر میں آپ کو اس کی ایک وجہ بتاتا ہوں، کوئی آدمی قتل کر کے میرے پاس آجائے اور کہے کہ میں قتل کر آیا ہوں تو میں کہوں گا کہ آئی ڈونٹ مائنڈ مگر تم نے بڑی بری حرکت کی ہے مگر جتنا آپ کو ریلیف مل سکتا ہے میں کوشش کروں گا۔ میں صرف ایک چیز پر بہت سخت ردعمل ظاہر کرتا ہوں، میرا جی کرتا ہے کہ اگر مجھے قانون یا اخلاق اجازت دے تو شاید میں اس کے سر میں اینٹ ماروں اور وہ ہے جھوٹ اور میری کسی بندے سے نہیں بن سکتی، اس وجہ سے تقریباً ہر ہفتہ ایک آدھ شخص اس کا نشانہ بنتا ہے کیونکہ وہ جھوٹ بولتا ہے وہ کہتا ہے میں گیا تھا وہ بندہ نہیں ملا۔ جب میں چیک کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ گیا ہی نہیں، دوسری بات یہ کہتا ہے کہ وہ دیر سے پہنچا ہے بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی جھوٹ بول رہا ہے، اس نے کسی رپورٹر سے خبر لے لی خود وہ گیا ہی نہیں۔ پھر وہ تیسری بات یہ کہتا ہے کہ اس نے تو کوئی پیسے ہی نہیں لئے مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ رات کو وہ ملزم پارٹی کے ساتھ فلاں جگہ گھوم رہا تھا، یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب میں بالکل آؤٹ آف مائنڈ ہو جاتا ہوں اور میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کنٹرول کرتا ہوں، آجکل تو میں یہی کہتا ہوں یار! اس کو میرے پاس نہ لے کر آؤ میری اس سے لڑائی ہو جائے گی، للہذا میں یہ

Marfat.com

سمجھتا ہوں کہ جب انسان نے صدیوں کا سفر سالوں میں اور سالوں کا سفر ہفتوں میں طے کرنا ہے تو آپ کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی، میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ جرنلزم ایمانداری کے بغیر نہیں چل سکتی، اگر آپ بد دیانت اور بے ایمان ہیں تو بات مشکل ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں، اخبار میں قتل کی خبر تو چھپے گی، آپ اسے روک تو سکتے نہیں یہ تو ہاٹ نیوز ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ رعایت یہ کر سکتے ہیں کہ اس کو اتنا ڈسپلے نہ دیں جتنا آپ کے مخالف چاہتے ہیں یعنی جرنلزم ایسی چیز ہے، اس میں آپ کو اپنے خلاف بھی خبر چھاپنا پڑتی ہے مثلاً میرے عزیزوں نے اگر مجھ پر کوئی الزام لگایا ہے تو میں اس کو تو چھاپوں گا مگر ساتھ اپنا جواب بھی چھاپوں گا۔ مگر یہ اس کا رائیٹ ہے کہ وہ میرے بارے میں جو کہنا چاہتا ہے کہہ دے۔ میری ساری ناراضگی اپنے ورکر کے ساتھ یہی ہوتی ہے

نمبر ایک یہ کہ وہ پیشہ و رانہ طور پر ایماندار نہ ہو اور نمبر دو میں یہ محسوس کروں کہ اس نے مجھے بتائے بغیر کوئی غلط کام کیا ہے۔ میں تو ایسے ورکرز سے کافی دیر تک پوچھتا ہی نہیں، مہینوں تک کسی کی باری نہیں آتی مگر جب انتہا ہو جاتی ہے تو مجھے پوچھنا پڑتا ہے، میری کسی سے پرسنل لڑائی نہیں ہے، میں تو اکثر ملازموں سے کہتا ہوں یار! اگر تمہارا باپ بیمار ہے، کوئی اور بیمار ہے تو چلو میں اسے ہسپتال میں داخلہ دلوا دیتا ہوں، یہ واحد ادارہ ہے جس میں ورکرز کو رمضان کے پورے مہینے میں افطاری کرواتے ہیں، یہ میرا اپنا شوق ہے، لوگوں کو ایسوسی ایٹ کرنا میرا شوق ہے، بچی کی شادی میں دفتر کی طرف سے شرکت کرنا ہماری روایت ہے، ہم کچھ نہ کچھ کنٹری بیوٹ ضرور کرتے ہیں، یہ ایک ہمارا سماجی رشتہ ہے، میں سب لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں، ورکرز کے ساتھ تفریح پر بھی جاتا ہوں، خود پیسے خرچ کرتا ہوں۔ یہ ہے ایک انتہائی پہلو، مگر جب یہی شخص مجھے دھوکہ دیتا ہے جب وہ مجھے چکر دیتا ہے مثلاً ہمارے پاس ایک صائمہ کیس آیا، ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا رپورٹر اس کے گھر جا کر اسے دھمکیاں بھی دے کر آیا، اس سے کہا کہ اتنے پیسے تم دے دو تو تمہاری بات دب جائے گی، یہ بات چند ماہ پہلے ہمارے ایک رپورٹر کے علم میں آئی، اب وہ پچھلے گیارہ سال سے خبریں سے وابستہ ہے، رپورٹر ہے بظاہر بڑا معقول آدمی ہے مگر جب پوری تحقیق کے بعد یہ پتہ چلا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو میں نے کہا اس کی چھٹی کرواؤ، دفتر والوں نے بڑی سفارشیں کیں کہ وہ بڑا اچھا ہے، میں نے کہا اگر اچھا ہے تو ہوگا میں کیا کروں، جس آدمی نے ڈیڑھ ماہ بعد فلم سمیت لڑکی کے گھر جا کر بات کی اور اسے اپنا کارڈ بھی دیا اور اسے کہا کہ تم فلاں شخص سے اس طرح سے ڈیل کر لو تو تمہاری بات چھپ جائے گی، آپ بتائیں کہ میں اس رپورٹر کا کیا کروں۔ اب ایسے رپورٹر کو رپورٹنگ میں رکھنے کا مطلب اپنے گھر میں چور رکھنا اور اپنے محکمے میں غلاظت جمع کرنا ہے۔

Marfat.com

س: آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے سارے معاملات حل ہو سکتے ہیں اگر اس ملک میں شریف، محروم اور عام آدمی خاص طور پر Low اور مڈل کلاس اپنے اندر جرأت پیدا کر لے۔ ہم بند کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں مگر جب ٹرائل کا موقع آتا ہے تو ہم کسی مظلوم کے ساتھ کھڑے ہونے کی بجائے دب جاتے ہیں کہ ہمیں نقصان ہوگا۔ ہم ''تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ'' پر عمل کرتے ہیں حالانکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ جو واقعہ آج دوسرے کے گھر پر ہوا ہے کل ہمارے گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ اللہ پاک ہمیں توفیق دے۔ یہ بڑا اچھا ملک ہے اچھے لوگ ہیں۔ بڑے وسائل ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا اور یہ سوسائٹی Survive کرے گی مگر اس کے لئے قرآن پاک میں جو آیت ہے ''جو تم کہتے ہو وہ کرتے کیوں نہیں ہو'' اس فرمان پر ہم عمل نہیں کرتے۔ کرپٹ سے کرپٹ آدمی کو اگر آپ ڈرائنگ روم میں سنیں تو لگے گا کہ یہ اتنا اچھا انسان ہے مگر جب آپ اس کے عمل دیکھیں گے تو وہ مختلف ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ لوگوں میں جرأتِ اظہار آ جائے جواب آہستہ آہستہ آ رہی ہے میں آپ کو بتاؤں کہ 14 کروڑ عوام کو کون سی فوج مار سکتی ہے۔ کون سی پولیس مار سکتی ہے۔

س: آپ بیک وقت اخباری مالک، ایڈیٹر، کالم نگار اور دانشور ہیں۔ آپ کو اپنی کس شخصیت پر کس حوالے سے ناز ہے؟

ج: ناز تو خیر بہت بڑا لفظ ہے۔ اس میں غرور آ جاتا ہے غرور سے بچنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ انسان کو کامیابی دے تو وہ بھی ایک آزمائش ہوتی ہے کہ آپ میں اکڑ اور غرور تو پیدا نہیں ہو گیا۔ اپنے آپ کو ہر وقت کھینچ کر نیچے رکھنا اپنے آپ کو ڈی کلاس رکھنا آپ کروڑوں روپے خرچ کر سکتے ہیں مگر آپ تیس ہزار روپے میں گزارا کرتے ہیں۔ یہ ایک مشکل کام ہے اور جس چیز پر مجھے اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ ابھی تک میں نے اپنے اندر کے انسان کو بدلنے نہیں دیا۔ میری مجبوریاں بطور اخبار نویس ہو سکتی ہیں مگر بطور انسان میں بڑا Independent آدمی ہوں۔ میرے اندر سے جو خواہش یا خیال ابھرتا ہے وہ اگر بہت ساری چیزیں لکھ نہیں سکتا مگر وہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ Dicuss ضرور کرتا ہوں۔ میں نے اپنے اندر کے ضیا شاہد کو کبھی مرنے یا قتل نہیں ہونے دیا۔

س: آپ کا کالم جمعہ بخیر ایک ایسی چیز تھی کہ جو پیارے پڑھنے والوں کو اکثر رُلا بھی دیا کرتی تھی۔ خبریں کے لئے آپ خود اچھی چیزوں کی تلاش میں رہے پھر آپ نے خبریں کو جمعہ بخیر سے کیوں محروم رکھا؟

Marfat.com

ج: ایل صاحب! وہ لکھنا بڑا مشکل تھا۔ میں حلفاً آپ کو بتاؤں میں ڈائیلاگ نہیں بول رہا وہ لکھنے میں ایک ڈیڑھ دن لگ جایا کرتا تھا۔ پتہ نہیں لوگ روتے ہیں یا نہیں مگر میں یہ کالم لکھنے کے دوران ایک اذیت کی کیفیت سے گزرتا تھا میں بعض چیزوں کو اتنی شدت سے محسوس کرتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری کنپٹیاں پھٹ جائیں گی۔ وہ میرے لئے لکھنا ایک عذاب تھا۔ اسی میں ایک سٹوڈنٹ کا قصہ ہے جو رات ہمارے ہاں رہا میری بیوی نے اس کو کھانا کھلایا مگر تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلا تو گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ جمعہ بخیر ایسا کالم تھا کہ جسے لکھتے وقت میں خود کتنی ہی مرتبہ رویا کرتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے بھاگ گیا کیونکہ وہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ میں روایتی لکھ نہیں سکتا میں بڑا محسوس کر کے لکھنے والا ہوں۔

س: آپ میں معاف کر دینے کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ خبریں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے بہت غلطیاں کیں مگر اس کے باوجود وہ آپ کی شفقت کے سائے میں ہیں؟

ج: ایسی چیزیں چلتی رہتی ہیں میں نے پہلے بھی کہا میرے لئے تکلیف دہ وہ آدمی ہوتا ہے جو منافقت کرتا ہے۔ میں نے جیل میں ایک بار بہت بڑے لیڈر سے کہا یہ کیا ہر وقت محبت محبت کرتے رہتے ہیں آپ تو بڑے منافق آدمی ہیں۔ میں جس آدمی پر چڑھائی کرتا ہوں دو چار دن بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس پر کچھ زیادہ ہی چڑھائی کر دی تھی۔ پھر میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اسے تھوڑا سا Compensate کروں۔ مجھ سے اکثر جس کو ڈانٹ پڑی میں نے اس کی تنخواہ بڑھا دی یا اس کو کوئی اور سہولت دے دی۔ آپ یقین کریں میں لوگوں سے بڑا پیار کرتا ہوں میں کسی کے خلاف نہیں ہوں۔ میرے دل میں کبھی بھی کسی کے لئے کدورت نہیں رہی۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے کہ کچھ لوگوں کو آگے بڑھنے میں مدد دی جائے جو سچے اور کھرے ہیں ان کی مدد کی جائے۔

س: آپ کو اپنے تین بیٹوں سے زیادہ کون عزیز ہے۔؟

ج: میرے دو بیٹے ہیں۔

س: تیسرا بیٹا بھی ہے، جب کسی ورکر سے کوئی سنگین غلطی ہوتی ہے تو آپ اکثر کہتے ہیں ''یہ خبریں میرا بیٹا ہے۔ یار اس کے ساتھ تو ایسا برا سلوک نہ کرو۔'' ؟

ج: ''خبریں'' میرا بیٹا نہیں ہے بلکہ میرا ایک مشن ہے۔ دراصل یہ تو Express کرنے کی بات ہے۔ خبریں Way of Life ہے۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے میری زندگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے خبریں چھوڑ کر نئے سرے سے ایک اور اخبار بنانا پڑے تو میں بنا لوں گا۔ میں اس سے بھی الگ کوئی راستہ نکال لوں گا۔ خدا

Marfat.com

تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہو تو میں پھر ایک ادارہ قائم کر سکتا ہوں۔ ایک، دو، تین ادارے بھی قائم کر سکتا ہوں۔ جب تک زندگی ہے۔ مگر بیٹا ہونا اور چیز ہے۔ بیٹے میرے عدنان اور امتنان ہیں۔ اس کے علاوہ اس پروفیشن میں میرے بہت سارے بیٹے ہیں مثلاً میں نے عظیم پر بڑی محنت کی ہے مگر اس کو بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ میرے اپنے بیٹوں کو بہت ڈانٹ پڑتی ہے اور وہ کئی دفعہ بھاگ گئے ہیں۔ ایک دفعہ عدنان نے کہا بس میں یہ کام چھوڑ دوں گا۔ اس نے کہا میرا خیال ہے کوئی اور کام کر لوں۔ میں نے کہا کر لو لیکن اگر تم یہاں میرے پاس ہو تو پھر تمہیں سننا پڑے گا۔ ہمارے ادارے سے بعض ینکسٹرز بڑے اچھے نکلے ہیں۔ مجھے ان پر فخر ہے مجھے یقین ہے انسان کی زندگی تو فانی ہے۔ میں ایسی ٹیم بنانے میں پچاس فیصد کامیاب ہو گیا ہوں، اس ٹیم کے ساتھ اگر ہم چلتے رہے تو کامیاب ہو جاؤں گا۔ بشرطیکہ میں مالی کرپشن کا شکار نہ ہوں۔ مثلاً آپ اس کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں جب میں جنگ میں نوکری کرتا تھا تو میں نے یہ گھر بنایا۔ میرے پاس ہر قسم کے دوست آتے ہیں۔ مجھے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہاں اہم لوگوں کا آنا جانا ہے کوئی بڑا گھر لیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں بڑی غیر متعلقہ ہیں۔ میرا آفس جو آٹھ منزلہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہاں سے ٹی وی چینل بھی چلے۔ انگریزی کا اخبار بھی ساتھ نکلے، اداروں کو بننا چاہیے افراد بالکل فضول چیز ہیں، افراد کی ترقی کوئی ترقی نہیں ہے۔ البتہ اگر ادارے ترقی کریں تو کوئی بات ہے۔ اس وقت صرف ہماری لاہور کی تنخواہیں 47 لاکھ ہیں۔ جب اخبار نکلا تو یہ 6 لاکھ تھیں۔ اب سات سٹیشنوں پر ایک کروڑ سے زیادہ ہم تنخواہ دیتے ہیں۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ تو وہ لڑکا ہے جو بورڈ لکھتا تھا اور دیواریں لکھ کر کچھ پیسے کما لیتا تھا آج اللہ کے فضل سے اس مقام پر ہے۔ لہٰذا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ نے میرے جیسے نکمے اور معمولی آدمی کے ہاتھوں اتنی برکت دی کہ ہم اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر چل سکتے ہیں۔ لہٰذا ادارے بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کا ایک ہی اصول ہے کیا آپ اپنی ذات پر ایک ڈسپلن نافذ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اس کی مثال دیتا ہوں۔ میں اس وقت پارٹنر کے طور پر، سماجی اور مالی طور پر بھی اس پوزیشن میں ہوں (کیونکہ میری کچھ پراپرٹی وغیرہ بھی مجھے مل گئی) کہ آٹھ دس کنال کا گھر بنا سکتا ہوں مگر میرے پاس جتنے پیسے ہیں۔ وہ سب میں نے اپنے ادارے میں Invest کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تین شہروں سے نکلنے والا ایک انگریزی اخبار اس ڈرائنگ روم کو وسیع کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک ٹی وی چینل شروع کرنا زیادہ اہم ہے۔

☆......☆......☆......☆......★

Marfat.com

خبر قبیلہ

مجیب الرحمٰن شامی

Marfat.com

Marfat.com

''پاکستان'' مجھے ''اللہ میاں'' نے دیا

مجیب الرحمٰن شامی

معروف دانشور، سینئر صحافی، منفرد کالم نگار اور روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر جناب مجیب الرحمٰن شامی کے صحافتی سفر کی داستان محنت اور جدوجہد کے ساتھ ساتھ اتفاقات سے بھی عبارت ہے۔ مثلاً یہ بھی اتفاق ہے کہ وہ ایک ایسے دن پیدا ہوئے جو وطن عزیز کی آزادی کا دن ہے یعنی 14 اگست۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جو شخص وطن کی آزادی والے دن پیدا ہوا اسے اخبار بھی ''پاکستان'' مل گیا۔ اسے بھی اتفاق ہی کہا جائے گا کہ ان کی کبھی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی روزنامہ کے ایڈیٹر بنیں اور ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ پس ثابت یہ ہوا کہ ''اتفاق'' میں بڑی برکت ہے۔ مجیب الرحمٰن شامی سے ان کی صحافتی اور نجی زندگی کے بارے میں ایک بامقصد مکالمہ ہوا جو نذر قارئین ہے۔

س: عوام کے ایک حلقے میں صحافتی حوالے سے آپ کے نام کو نیکی، شرافت، اخلاقی اقدار کی پاسداری اور حب الوطنی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا بچپن سے ہی مزاج ایسا تھا یا عمر کے کسی خاص حصے میں یہ تبدیلی آئی؟

ج: ہمارا گھریلو ماحول اور پس منظر مذہبی تھا، ہمارا خاندان مشرقی پنجاب کے ممتاز خاندانوں میں سے ہے

Marfat.com

ہمارے جد امجد حضرت تاج العارفین عبدالنبی شامیؒ صاحب ہیں۔ جن کا مزار شام چوراسی میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔ ہم ان کی اولاد میں سے ہیں اور صاحبزادگان ہیں۔ مگر میں اپنے نام کے ساتھ صاحبزادہ نہیں لکھتا۔ اس لحاظ سے ہم ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آس پاس مذہبی ماحول دیکھا نمازیں پڑھی جاتی تھیں، روزے رکھے جا رہے ہیں۔ میلاد شریف کی محفلیں اور عرس ہو رہے ہیں۔ ختمِ قرآن ہو رہے ہیں چنانچہ اس ماحول کے زیر اثر مجھے پڑھنے کا شوق ہوا میں نے جو کچھ پڑھا اس سے میری طبیعت جمتی چلی گئی اور میرے نظریات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔

س: آپ کے والد صاحب کیا کرتے تھے؟

ج: میرے والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور وہ اس وقت پاکپتن میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے ریڈر ہوا کرتے تھے۔ کبھی والد صاحب کا تبادلہ ساہیوال ہو جایا کرتا تھا تو کبھی کسی اور جگہ ہو جاتا تھا۔ وہ یہ ملازمت تقسیم سے پہلے کرتے تھے۔ ہم نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کی اور ہوشیار پور آ گئے جو ہمارا آبائی شہر تھا۔ میں دو سال کا تھا جب ہماری ہجرت ہوئی۔ میری تاریخ پیدائش 14 اگست 1945ء ہے۔ جب پاکستان بن گیا تو والد صاحب کی تقرری پاکپتن میں ہو گئی۔ شاید اس کے لئے والد صاحب نے کچھ کوشش بھی کی ہو، پاکپتن سے ان کا ایک روحانی تعلق تھا کیونکہ وہاں بابا فرید شکر گنج کا مزار تھا جو اب بھی ہے۔ اس لحاظ سے پاکپتن کی ایک روحانی حیثیت ہے۔

س: آپ کے والدین آپ کو یہی کچھ بنانا چاہتے تھے جو اس وقت آپ ہیں یا ان کے کچھ اور خواب تھے؟

ج: ہمارا خاندان بنیادی طور پر ملازمت پیشہ ہے، ان میں بڑے بڑے افسر اور جج ہوئے۔ اس لحاظ سے سرکاری ملازمت ہمارے خاندان میں ایک وراثت کے طور پر منتقل ہوئی تھی۔

س: آپ نے ملازمت کیوں نہیں کی؟

ج: میرے والد صاحب کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں ملازمت کروں۔ کیونکہ میں اپنے زمانے میں اچھا طالب علم تھا اس لئے ان کو توقع تھی کہ میں سول سروس کا امتحان پاس کر سکتا ہوں۔ میں نے بچپن میں تاریخ پڑھی ابوالکلام آزاد، شبلی اور بعد میں مولانا مودودی کو پڑھا۔ میرے ذہن میں ابتداء ہی سے آزاد پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا میرے دل میں کبھی یہ نہیں آیا کہ میں ملازمت اختیار کروں۔ میں اخبار نویس بننا چاہتا تھا اگر اخبار نویس نہ بنتا تو میں وکیل بنتا مگر میری اولین خواہش چونکہ اخبار نویس بننے کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کیا۔

Marfat.com

س: صحافتی سفر کا آغاز کہاں سے کیا؟

ج: میں نے روز نامہ ''حریت'' کراچی سے باضابطہ طور پر صحافت کا آغاز کیا اور وہاں میں فیچر رائیٹر کے طور پر کام کرنے لگا۔ یہ میری ابتداء تھی، اس وقت مجھے مہینے کے سو روپے مل جایا کرتے تھے، کچھ دیر وہاں کام کیا پھر جب حریت کے حالات خراب ہو گئے تو مجھے اس وقت کے میگزین ایڈیٹر نے مشورہ دیا کہ ''اخبار جہاں'' نیا نیا نکلا ہے آپ وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ ان کے مشورے پر میں روز نامہ ''جنگ'' میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ وہاں مجھے فلمی صفحے کا انچارج بنا دیا مگر مجھ پر یہ بڑا گراں گزر رہا تھا، میں نے ان سے کہا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے تو میر خلیل الرحمٰن کے چھوٹے بھائی میر حبیب الرحمٰن نے کہا کہ اخبار نویس کو تو ہر کام کرنا چاہیے۔ میں نے کہا یہ کام میرے ذوق کا نہیں ہے میں نے وہاں بمشکل ایک مہینہ گزارا ہو گا مگر جب وہاں مستنصر جاوید آ گئے تو انہوں نے فلمی صفحہ سنبھال لیا اور مجھے اخبار کے دوسرے شعبہ میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اخبار جہاں میں کچھ عرصہ کام کیا اس وقت اسلام اور سوشلزم کی لڑائی زوروں پر تھی میں نے علمائے اسلام اور سیاستدانوں کے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا جو بڑے مشہور ہوئے اور وہاں سے ایک اخبار نویس کے طور پر میری شہرت ہوئی۔ اس کے بعد ہفت روزہ ''زندگی'' نکالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قریشی برادران نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی اور ساڑھے سات سو روپے ماہانہ کی آفر کی یہ غالباً 1969ء کی بات ہے جب ایوب خان کی واپسی کا سفر شروع تھا۔ یحییٰ خان کی آمد آمد تھی ۔ جب میں لاہور آیا تو ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب نے مجھے اپنے گھر پر ٹھہرایا اور جب تک میں ہفت روزہ زندگی سے وابستہ رہا میرا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔

س: ہفت روزہ زندگی کے بعد آپ قومی ڈائجسٹ نکال کر مالکوں کی صف میں شامل ہو گئے؟

ج: ایسا نہیں تھا۔ میں ہفت روزہ زندگی میں کام کرتا رہا پھر میں بھٹو صاحب کے زیر عتاب آ گیا۔ ایک پرچہ بند ہوتا تو دوسرا پرچہ نکال لیا کرتے تھے۔ اس دوران میں اور الطاف حسن قریشی جیل بھی گئے۔ سزائیں بھی کاٹیں۔ پھر ایسا ہوا کہ 1974ء کے اوائل میں ہفت روزہ زندگی بند کر دیا گیا۔ لہٰذا ادارہ اردو ڈائجسٹ نے فیصلہ کیا کہ اس کی جگہ آپ متبادل پرچہ نہیں نکالیں گے اور جب ہم لوگ ادارے سے علیحدہ کر دیئے گئے تو پھر ہم نے فیصلہ کیا جس میں چپڑاسی سے سب ایڈیٹر تک تمام عملہ شامل تھا۔ پھر ہم نے نیا ادارہ بنایا جس کی بنیاد ''نئی زندگی پبلی کیشنز'' پر رکھی گئی۔ اس طرح 1974ء سے میں نے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا۔ آپ مالک کی بات کر رہے ہیں میں تو خود کو مالک نہیں بلکہ منتظم سمجھتا ہوں چنانچہ ہم نے مل کر ہفت روزہ کا آغاز کیا جس کا نام

Marfat.com

''الیوم'' تھا مگر حکومت نے اس پر اتنا زور ڈالا کہ ہمارے پبلشرز اس کے چھپنے سے پہلے ہی منحرف ہو گئے اور انہوں نے پرچہ ہم سے واپس لے لیا۔ اس کے بعد ''لیل و نہار'' جو منظور ملک صاحب کے پاس تھا ان کے بھائی سعید ملک نے مجھے پیشکش کی چنانچہ ہم نے ''لیل و نہار'' اپنے پرچے کے طور پر شائع کیا۔ بھٹو کے پورے دور میں ہمیں ڈیکلریشن نہیں ملا۔ ایک پرچہ اگر بند ہوتا تھا تو ہم دوسرا نکال لیتے تھے۔ آخر جب بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہوگئی تب 1977ء میں ہمیں اپنا ڈیکلریشن ملا جس کا نام 'ہفت روزہ بادبان'' تجویز کیا گیا اس کے کچھ عرصہ بعد ہم نے سوچا کہ ایک ماہانہ پرچہ بھی ہونا چاہئے تاکہ ادارے کا انتظامی بوجھ بٹ جائے تب ہم نے قومی ڈائجسٹ نکالا، اس دوران کچھ وقفے کے بعد ادارہ اردو ڈائجسٹ نے ہفت روزہ ''زندگی'' کو دوبارہ شروع کیا اور پھر بند ہو گیا چونکہ اب اس کا ڈیکلریشن خالی تھا لہٰذا میں نے الطاف حسن قریشی سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو زندگی کا ڈیکلریشن میں لے لوں۔ انہوں نے اجازت دے دی یوں زندگی کا ڈیکلریشن میرے پاس آ گیا۔

س: عوام کے ایک حلقے کا خیال یہ ہے کہ آج کے دور میں تو صحافت جھوٹ، دوغلے پن اور منافقت کا دوسرا نام ہے۔ آپ کی شخصیت اس صحافتی فریم میں کیسے فٹ ہوئی؟

ج: ایک بات ہم بھی کہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی کہتے ہیں کہ اخبار نویس معاشرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ لیکن اگر تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مولانا ظفر علی خانؒ کیوں پیدا ہوتے، حسرت موہانیؒ، ابوالکلام آزادؒ، الطاف حسین اور حمید نظامیؒ کیوں پیدا ہوتے۔ اس طرح اگر آپ آگے بڑھ جائیں تو سیاست میں محمد علی جناحؒ کیوں پیدا ہوتے۔ شاعری میں علامہ اقبالؒ کیوں جنم لیتے۔ اس لئے جو اخبار نویس ہے اس کے منصب کا یہ تقاضا ہے کہ وہ معاشرے کے رنگ میں نہ رنگا جائے بلکہ معاشرے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ یہ ایک قائدانہ کردار ہے جو اخبار نویسوں کو ادا کرنا چاہئے۔

س: اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اخباری دنیا کا ''جہادی'' کہا جا سکتا ہے؟

ج: آپ ایک لحاظ سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ جہاد کیا چیز ہے۔ جب آپ کے پاس بے سروسامانی ہوتی ہے۔ اس لئے منع کیا گیا کہ آپ دنیا کی بہت زیادہ چیزیں اکٹھی نہ کریں۔ اکٹھی کریں گے تو جہاد نہیں کر سکیں گے، کیونکہ مال ہوگا تو مال کا خوف ہوگا تو جب مال کا خوف ہوگا تو جہاد نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ ایک دور تو ہمارا وہ ہے جسے فکر و فاقے کا دور کہتے ہیں۔ جدوجہد کرتے ہیں، ہماری

Marfat.com

کل پونجی چند ہزار روپے ہے۔اس میں آپ لڑ رہے ہیں بھڑ رہے ہیں، لڑائی کر رہے ہیں جب میں ہفت روزہ نکالا کرتا تھا تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ اشتہار کیا ہوتا ہے میں نے کبھی سرکاری اشتہار مانگا نہ کسی نے دیا۔ ہمارا سارا دارومدار سرکولیشن پر تھا کم اخراجات محدود وسائل اور تھوڑے لوگ تھے۔ ہم لوگ اپنا کام چلا لیتے تھے مگر جب ہم اپنی اخبار تک آئے تو پھر یہ ہوا کہ کارکن بڑھ گئے، وسائل بڑھے تو مسائل بھی بڑھ گئے۔اب ہمیں بھی معلوم ہوا کہ اشتہار کیا ہوتا ہے۔لہٰذا بزنس کی طرف بھی توجہ دینا پڑتی ہے۔اس کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے تو ہم شعر پڑھ دیا کرتے تھے کہ:

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر پہ زمانہ ہے

اب ہم خاک نشین نہیں رہے کرسی نشین ہو گئے ہیں ان حالات میں اب حکومت ہمیں کوئی بات کہتی ہے تو ہمیں سو بار سوچنا پڑتا ہے اس کے سود وزیاں کا حساب لگانا پڑتا ہے۔ کارکنوں اور ادارے کی طرف دیکھنا پڑتا ہے لیکن اگر آپ میرے اندر کی بات پوچھیں تو میں اس سے زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔

س: شاعر مشرق نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا جو خواب دیکھا تھا کیا آج آپ کو اس کی عملی تعبیر نظر آتی ہے؟

ج: خواب اصل میں قومیں دیکھتی ہیں۔ جو شاعر مشرق کا خواب تھا وہ مسلمانوں نے اپنا لیا تو وہ ان کا اپنا خواب ہو گیا۔اپنے خوابوں کی تعبیر بھی آپ ہی ڈھونڈنا پڑتی ہے۔سوال یوں ہونا چاہئے کہ جو ہمارے اپنے خواب تھے وہ ہم نے کہاں تک پورے کئے جب ہم سوال اس طرح کریں گے تو اس کا جواب بھی خود بخود مل جائے گا لیکن اگر ہم کہیں تعبیر نہیں ڈھونڈ سکے تو وہ بھی ہماری اپنی کوتاہی ہے۔

س: اس وقت بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات کا خواب بھی دیکھا جا رہا ہے۔اس سلسلے میں ہمارے فنکار، ادیب اور شاعر بھی بھارت جا رہے ہیں کیا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہوگا؟

ج: بات یہ ہے کہ پہلے سرحدیں موجود نہیں تھیں اور ہم سینکڑوں سال سے اکٹھے رہتے چلے آ رہے تھے، سب لوگوں کا آنا جانا اور اُٹھنا بیٹھنا تھا۔سب ایک ہی ملک میں رہ رہے تھے اور ہمارا ایک ہی جغرافیہ تھا اب اس میں دیوار کیسے کھڑی ہوتی مگر آپ دیکھیں کہ ان سب چیزوں کے باوجود ہم ایک نہیں بن سکے اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمیں اپنا حصہ الگ الگ کر لینا چاہئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکٹھے رہن سہن سے اور ملنے جلنے سے بنیادی چیزیں نہیں بدلتیں۔لہٰذا آپ یہ کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایسا ملاپ ہو

Marfat.com

جائے جو 1947ء سے پہلے تھا۔ ایک بات اور کہ بھارت کے لئے ہم دوست کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ میں دوستی کے حق میں ہوں مگر آپ یہ دیکھئے کہ دوست میں ''دو'' کا لفظ بھی شامل ہے۔ دو ہوں گے تو دوستی ہوگی نا۔ ایک ہونے سے تو دوستی نہیں ہوسکتی، دنیا میں کوئی بھی دو بھائی ہیں جو ایک دوسرے میں گھل جائیں۔ بھائی جو ہیں وہ الگ الگ رہتے ہیں ان کا اپنا رہن سہن اور بود و باش ہوتی ہے، تاہم وہ بھائی رہتے ہیں لہٰذا پاکستان اور بھارت کو دوستوں کی طرح سے رہنا چاہئے مگر اپنی اپنی جگہ پر رہنا چاہئے، ملنا جلنا چاہئے آنا جانا بھی چاہئے مگر آنے جانے اور ملنے جلنے سے ایسا نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہو گئے۔

س: آپ ایک ایڈیٹر ایک منتظم ایک کالم نگار اور ایک دانشور بھی ہیں آپ کو اپنی شخصیت کا کون سا پہلو اچھا لگتا ہے؟

ج: میری شخصیت کا کوئی بھی حوالہ مضبوط نہیں ہے۔ صرف بنیادی حوالہ یہ ہے کہ آپ ایک مسلمان اور اچھے انسان ہیں اگر آپ اچھے انسان اور اچھے مسلمان ہیں تو سارے حوالے اچھے ہیں۔ آپ کی جو آخرت ہے اس پر آپ کی بخشش ہو جائے تو سبھی حوالے اچھے ہیں۔

س: آپ ''کالم'' بہت کم لکھتے ہیں۔ اس کی وجہ؟

ج: جو پبلشر اور ایڈیٹر ہوتا ہے اس کے لئے کالم نگاری بڑی مشکل ہوتی ہے اخبار کی ضروریات اور ہوتی ہیں جبکہ عوام کی خواہشات اور ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے درمیان پل صراط عبور کرنا پڑتا ہے جب میں کوئی چیز لکھتا ہوں تو بعض اوقات ہماری انتظامیہ کہتی ہے کہ یہ آپ نے کیا لکھ دیا ہے اور بعض اوقات تو لوگ کہتے ہیں آپ نے فلاں چیز لکھ دی ہے اس لئے فی الحال اداریئے کے ذریعے ہی اپنی بات کہہ دی جاتی ہے۔

س: قائداعظمؒ نے اس قوم کو پاکستان کا تحفہ دیا، آپ کو ''پاکستان'' کس نے دیا؟

ج: حالات نے، اللہ میاں نے، وہ ایسے ہوا کہ ایک بار میں ملتان گیا وہاں ہاکرز کا اجتماع تھا۔ کسی ہاکر نے کہا کہ آپ کو نواز شریف نے یہ اخبار دیا ہے۔ انہی کا دورِ حکومت تھا، میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ اخبار اس نے دیا ہے جس نے نواز شریف کو دیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیں تو میں اور نواز شریف دونوں ایک ہی قطار میں کھڑے ہیں اور جس بھی صاحب کے پاس جو کچھ ہے وہ بنیادی طور پر اسے اللہ نے دیا ہے۔ اس میں کسی بھی حکومت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اخبار کی حالت خراب ہو چکی تھی اس کی Liabilities بہت زیادہ تھیں جبکہ پیشہ ورانہ Input نہیں تھی۔ ایک بار روزنامہ ''دن'' نے اس کو ٹھیکے پر لے لیا مگر اس وجہ سے ان کے بھی اپنے مسائل پیدا ہو گئے اور اخبار گڑبڑ ہو گیا۔ اکبر بھٹی صاحب پھر میرے پاس آئے میں نے بینکوں

Marfat.com

سے بات کی۔آخر میرے بھی کچھ تعلقات اور اثرورسوخ تھا جس پر بینک والوں نے کہا ٹھیک ہے اگر آپ اس کو لیتے ہیں تو ہم اس کے قرضے ری شیڈول کر دیں گے مگر آپ کو ان قرضوں کا ایک حصہ ادا کرنا پڑے گا اس سلسلے میں ہم نے پھر بینکوں اور دوستوں سے بات کی، ان کے ساتھ بینکوں کے ری شیڈولنگ کا معاہدہ کیا۔ روزنامہ ''پاکستان'' کی جو پرنٹنگ کمپنی تھی اسی کے پھڈے اور مقدمے تھے کہ صورتحال خراب ہو رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم نے کچھ شیئرز کچھ دوستوں میں بیچے اور اس کو اس بحران سے نکالا اس کے علاوہ مارکیٹ میں ہماری تھوڑی بہت ساکھ بھی تھی۔اس لئے وہ چل پڑا۔جس طرح پاکستان بہت سے نشیب وفراز سے گزرا اسی طرح روزنامہ ''پاکستان'' کو بھی بہت سے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا اور اللہ نے نیک نام کیا۔اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں کہ مجھے آئندہ پانچ سال گزرے ہوئے پانچ سال سے بہتر لگتے ہیں۔

س: جب ''پاکستان'' آپ کے پاس آ گیا تو لوگوں کا خیال تھا کہ آپ اسے ''زمیندار'' بنا دیں گے کیونکہ آپ اسلامی ذہن کے بندے ہیں مگر آج پاکستان کو دیکھیں خصوصاً شوبز کے حوالے سے اس میں جتنی بولڈ چیزیں چھپتی ہیں اس سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں شامی صاحب کی مرضی شامل نہیں ہے؟

ج: میں نے آپ سے پہلے بھی بات کی ہے کہ جب آپ مقابلے اور مسابقت میں آتے ہیں تب آپ کو بہت سی چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے آپ اسے سمجھوتہ کہہ لیجئے یا کچھ اور۔مثلاً آپ شوبز ہی کو لے لیجئے، ٹیلی ویژن آ گیا، کیبل آ گیا، چینلز بھی چل رہے ہیں، ایکٹر اور ایکٹریس بھی ہیں لہٰذا جب آپ اخبار نکال رہے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی انڈسٹری، سیاست، سپورٹس کو Coverge دیں مگر شوبز کے بارے میں یہ تصور کر لیں کہ یہ غلط ہے۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ اخبار اس سیگمنٹ کو بالکل نظر انداز کر رہا ہے اس لئے بعض چیزیں ایسی ہیں جو اپنے آپ کو منوا لیتی ہیں۔میری ذاتی رائے آج بھی یہی ہے کہ اگر میرا بس چلے تو شاید میں ایسا نہ کروں تو آنکھیں بند کر لوں میں ایسا کرتا بھی رہا ہوں مگر یوں سلسلہ چلتا نہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجھے بھی اپنی رائے بدلنا پڑی کیونکہ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔میری سوچ اور رائے تو اپنی جگہ قائم ہے مگر ہماری اخبار کی ایک انتظامیہ ہے یہاں فردِ واحد کی حکومت تو نہیں ہے لہٰذا ساری انتظامیہ کا فیصلہ ہے کہ ہم اس سیگمنٹ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

س: آپ کے بارے میں یہ تاثر بھی موجود ہے کہ ایک طرف آپ آزادیٔ صحافت کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف اشتہارات کی دوڑ میں لگے ہیں۔پی آر بنا رہے ہیں کبھی گورنر سے ملاقات تو کبھی وزیراعلیٰ سے نشست اور پھر اسلام آباد کے چکر آخر اس میں کس قدر حقیقت ہے؟

Marfat.com

ج: میں نے تو آج تک ایسا اخبار نویس یا ایڈیٹر نہیں دیکھا جو کسی حکمران سے نہ ملتا ہو لیکن اس وقت جو ہماری پوزیشن ہے وہ یہ ہے کہ سب سے کم ملاقاتیں کوئی حکمرانوں سے کرتا ہو گا تو وہ میں ہوں۔ مثلاً پرویز مشرف صاحب صدر مملکت ہیں۔ میری ان سے علیحدگی یا تنہائی میں ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ اسی طرح جمالی صاحب جب وزیر اعظم تھے ان سے بھی میری آج تک تنہائی میں ملاقات نہیں ہوئی۔ اخبار والوں کے وفود جاتے ہیں وہاں اجتماعی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ جن میں میں بھی شامل ہوتا ہوں اس اعتبار سے وفاقی حکومت سے اشتہارات کے حوالے سے ہمیں شکایات بھی ہیں جہاں تک صوبائی حکومت کا تعلق ہے تو پرویز الٰہی حکومت میں وزیر اعلیٰ ہیں جبکہ خالد مقبول گورنر ہیں جب وہ یاد کرتے ہیں تو ان کے پاس چلے جاتے ہیں مگر یہ بھی تین چار مہینے بعد ملاقات ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ ان سے میرے جو تعلقات ہیں ان کے والد چودھری ظہور الٰہی کے زمانے سے ہیں لہٰذا یہاں تو مجھے پی آر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں ان کمپنیوں کے ساتھ تمام اداروں کے ساتھ جو اشتہارات جاری کرتی ہیں ہو سکتا ہے آپ کی میل ملاقاتیں ہوتی ہیں کیونکہ سب کا آپ کو خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تو آپ کے فرائض کا حصہ ہے۔ ''پاکستان'' میں بھی سارے انتظامی امور عام طور پر میرے برخوردار عمر شامی صاحب چلاتے ہیں جہاں کہیں کہتے ہیں معاونت کر دیتا ہوں۔ لہٰذا مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔

س: آپ نے اخبار کا ایڈیٹر بننے تک کا سفر 30-35 برس میں طے کیا۔ ضیاء صاحب کی بھی اتنی ہی خدمات ہیں مگر عمر شامی صاحب اور عدنان شاہد صاحب کیا ان کے ایڈیٹر بننے کو آپ ان کی بہت زیادہ ذہانت قرار دیں گے یا ان کی غیر معمولی کوالٹی تصور کریں گے یا یہ سارا وراثت کا سلسلہ ہے؟

ج: یہ کوالٹی ہے اور نہ ذہانت بلکہ میں اسے وارثت کہوں گا کیونکہ اخبار بھی ایک کاروبار ہے اور کاروبار تو ظاہر ہے انہی لوگوں کے پاس جائے گا جو ان کی اولاد ہیں تاوقتیکہ آپ اسی کا ٹرسٹ بنا دیں۔ مثلاً میرا ایک مکان ہے وہ کس کے پاس جائے گا۔ میرے بیٹے کے پاس ہی جائے گا نا؟ عدنان شاہد صاحب اپنی جگہ بہت ذہین نوجوان ہیں پڑھے لکھے ہیں ان کے والد نے انہیں لکھایا پڑھایا ہے اور میرے جو برخوردار ہیں ان کی میں نے تعلیم و تربیت کی ہے۔ مثلاً میرے چار بیٹے ہیں آخر ان میں سے عمر شامی صاحب ہی کیوں منتظم ہیں۔ یہ بھی تو ایک سوال پیدا ہوتا ہے اس لئے میری توجہ اس بات پر ہے کہ ان کی تعلیم شروع ہی سے ایسی کرائی جائے کہ وہ کسی ادارے کا انتظام چلا سکیں۔ اب عمر شامی نے لمز سے ایم بی اے کیا ہے اور ان کے ساتھ والے جتنے سٹوڈنٹ تھے 1998ء والے بیچ کے آج اگر دیکھیں تو وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور اداروں میں اڑھائی تین لاکھ

Marfat.com

سے کم تنخواہ نہیں لے رہے جبکہ ہم دونوں باپ بیٹا یہاں سے کہیں کم تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ جیسا آپ دیکھیں خلیل الرحمٰن کے بعد میر شکیل الرحمٰن نے انتظام سنبھالا اور حمید نظامی صاحب کے بعد مجید نظامی صاحب نے یہ کام سنبھالا۔اب ہوتا یہ ہے کہ اگر آپ کی اولاد میں جوہر موجود ہیں جیسے مولانا ظفر علی خان کے بعد مولانا اختر علی نے کام سنبھالا تو آج زمیندار کہاں ہے۔کوہستان میں نسیم حجازی صاحب کے بچے بھی موجود تھے کوہستان آج کہاں ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ کے بچوں میں جوہر موجود ہے تو وہ کام کرلیں گے اگر جوہر موجود نہیں ہے تو کام نہیں کر سکیں گے۔ میں اپنے بیٹے کے حوالے سے کہتا ہوں ہر آدمی جو ہے وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک اخباری ادارے کو چلانے کی جو صلاحیت ہے اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ عمل ہے۔اخبار چلانا تو اب بہت بڑی انڈسٹری بن چکی ہے اس سے سینکڑوں لوگ وابستہ ہوتے ہیں ان کو چلانے کے لئے ذہنی صلاحیت تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

س: شامی صاحب پاکستان نے آپ کو ایک نام دیا، مقام دیا، عزت اور شہرت سے نوازا۔ آپ نے جواب میں اس کو کیا دیا؟

ج: اس کا اندازہ تو آپ لگا سکتے ہیں البتہ میرا یہ خیال ہے کہ اس پیشے سے وابستہ ہو کر میرے جو بزرگ ہیں میں نے ان کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس اعتبار سے میرے پیشے کی جو متانت اور وقار ہے کوشش کی ہے کہ وہ مجروح نہ ہونے پائے۔ مثلاً ایک بار مجھے نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ آپ ضمیر کے مطابق لکھا کریں اس وقت ایم آر ڈی کی تحریک تھی جس سے مجھے کچھ اختلاف تھا۔ چنانچہ جب نواب زادہ صاحب نے کہا کہ میں ضمیر کے مطابق لکھوں تو میں نے ان سے کہا کہ کس کے ضمیر کے مطابق میں اپنے ضمیر کے مطابق تو لکھ رہا ہوں لیکن اگر آپ کے ضمیر کے مطابق لکھوں گا تو بے ضمیری ہو جائے گی۔ جس پر وہ چپ کر گئے۔ میں نے ممکن حد تک اپنے ضمیر کے مطابق کام کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اس لحاظ سے مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے ''پاکستان'' میں صحافت کے پیشے کو اپنے ہاتھوں کوئی صدمہ نہیں پہنچایا۔

س: آپ اپنے بیٹوں کے باس ہیں، باپ ہیں یا دوست؟

ج: یہ تو آپ انہی سے پوچھئے۔ ویسے میری اپنی عادت ہے کہ میں اپنی رائے کسی پر مسلط نہیں کرتا، میں صرف بحث اور گفتگو کرتا رہتا ہوں تاکہ وہ میری بات مانیں اگر کوئی میری بات نہیں مانتا تو پھر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں بہت کم موقعوں پر ایسا ہوتا ہے کہ میں اپنے بیٹوں سے کہوں کہ آپ نے یہ کام کرنا ہے میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ Authority without Responsibility کوئی چیز

Marfat.com

نہیں ۔جس وقت میرا بیٹا یہاں آ کر بیٹھا تھا تو پہلے دن ہی میں نے اپنے بیٹے کو چیک سائن کرنے کی اتھارٹی دی اور میرا یہ خیال ہے کہ روزنامہ پاکستان کے شاید ہی دو یا تین چیک ہوں جن پر میں نے سائن کئے ہوں۔ جب تک آپ کسی کو اختیار نہیں دیں گے تو پھر آپ اس سے توقعات کیا وابستہ کریں گے۔ میرے ساتھ کام کرنے والا ہر بندہ مانے گا کہ میں سب کو فری ہینڈ دیتا ہوں میں لوگوں پر جبر کا قائل نہیں ہوں۔

س: کون سی ایسی خواہش ہے جو ابھی پوری نہیں ہوئی؟

ج: اب تو کوئی خواہش نہیں اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بخش دے ۔ میں آپ کو ایک عجیب بات بتاؤں۔ایک تو میں بہت زیادہ خواہشات کا تابع نہیں ہوں۔دوسری بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں جو خواہش پیدا ہوتی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔مثلاً میری یہ خواہش تھی کہ میں ایک روزنامہ نکالوں اور ایک روزنامہ کا ایڈیٹر ہوں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں مشیر بن سکتا تھا کوئی حکومتی عہدہ قبول کر سکتا تھا مگر میں نے کہا میری یہ بھی خواہش ہے کہ میری قبر پر جو کتبہ ہو وہ یہی لگے کہ میں اخبار نویس کی موت مرا۔

س: آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟

ج: ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے ہاں جوانی آتی نہیں ۔ بچپنا ختم ہوا تو بڑھاپا شروع۔ ہمارا جو ماحول تھا جو ہمارے آباؤ اجداد تھے ان میں ہمیں اپنی جوانی کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوا۔دوسری بات یہ کہ آپ کے نزدیک عشق کا جو مفہوم ہے وہ ہمارے ہاں شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔(قہقہہ) میں ایک مرتبہ ٹیلی فون پر اپنی بیوی سے گفتگو کر رہا تھا۔میرے دوست پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کس سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے کہا اپنی بیوی سے،دوستوں نے کہا آپ تو بیوی سے ایسے گفتگو کر رہے ہیں جیسے کوئی اپنی محبوبہ سے کرتا ہے۔دراصل ہمارے اوپر بزرگوں کی بہت شفقت اور نظریں رہیں اور وہی نظریں ہی ہمیں اس قسم کے کاموں سے بچاتی رہیں۔

س: پاکستان کا نظریہ تو قائداعظمؒ نے پیش کیا تھا۔آپ کے ''پاکستان'' کا نظریہ کس نے پیش کیا تھا جہاں اس وقت آپ بیٹھے ہیں؟

ج: یہ سب تو آپ کو تحقیق کرنی چاہئے سارے جواب تو میرے پاس نہیں ہوں گے کسی نہ کسی نے پیش کیا ہی ہوگا۔(قہقہہ)

س: ہمارے ہاں کچھ بہت ہی معروف اور بڑے بڑے دانشور ہیں جن کی دانشوری جاگتی ہی شراب کی وجہ سے ہے۔اس دانشوری کو آپ کیا کہیں گے جو حقیقت سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ نشے میں تو آدمی حقیقت میں نہیں رہتا؟

Marfat.com

ج: میں اس دانشوری کے بارے میں کوئی بات کیسے کر سکتا ہوں۔ مثلاً کسی استاد کا شعر ہے۔

لطفِ مے زاہد تو کیا جانے
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

شراب پر مجھے ریاض خیر آبادی کا ایک شعر بہت پسند ہے، وہ بھی آپ سنتے جائیں۔ انہوں نے کہا:

وہ لحد میں بوئے مے تھی
نہ اتر سکے فرشتے
میں عذاب ہی میں رہتا
جو نہ بادہ خوار ہوتا

ممکن ہے جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بھی یہی شعر پڑھتے ہوں۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

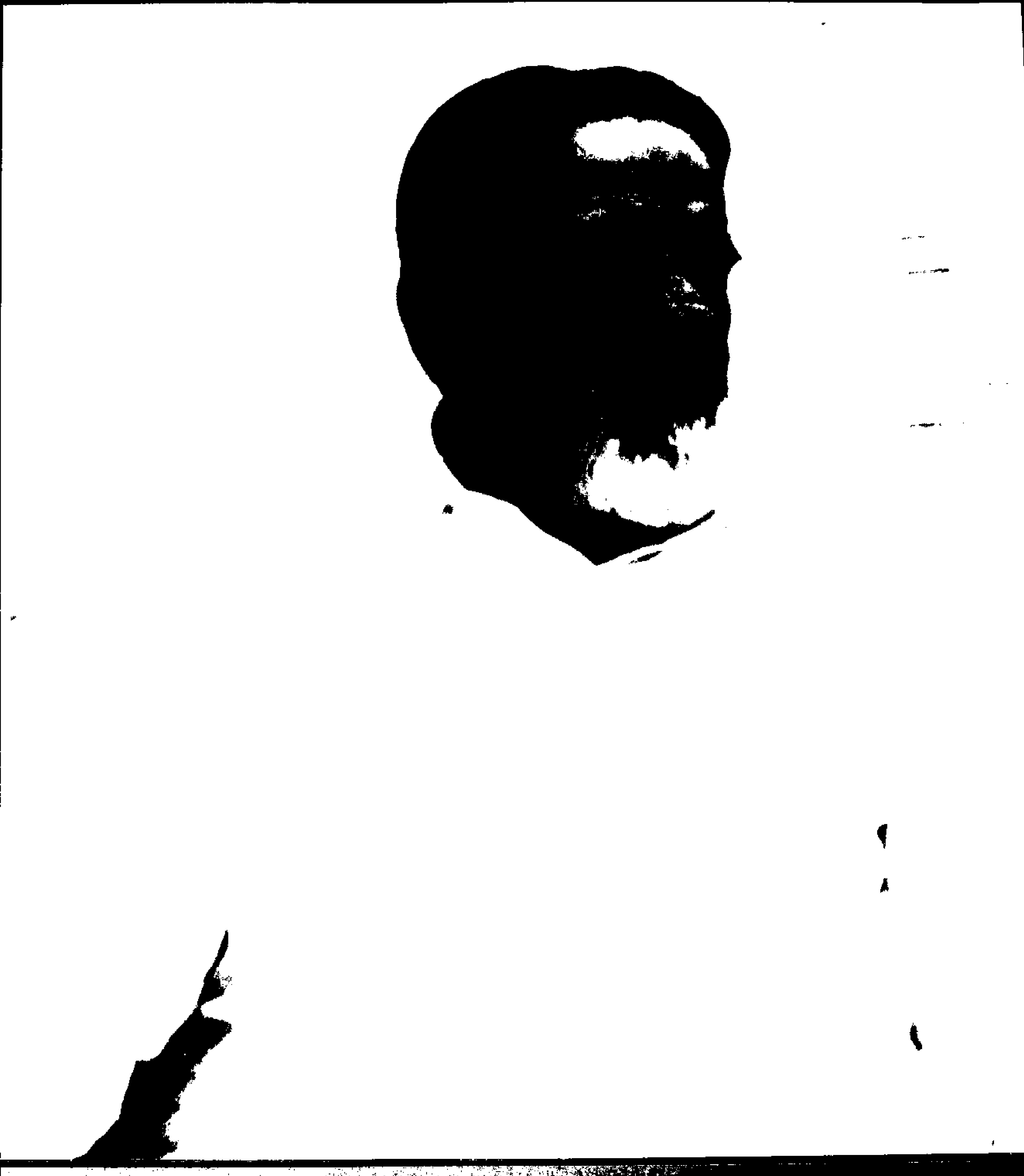

مصطفیٰ صادق

Marfat.com

Marfat.com

سکینڈلز، سیکس اور سنسنی خیزی کی صحافتی دوڑ میں شامل نہیں ہونا چاہتا

مصطفیٰ صادق

مصطفیٰ صادق کی شخصیت صحافتی حلقوں سے زیادہ سیاسی اور حکومتی حلقوں میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ صحافت سے زیادہ سیاست میں انہوں نے غیر سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ 1977ء کا آئین بنانے کے لئے تمام سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا کریڈٹ بھی انہی کو جاتا ہے جس کا اعتراف ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے نام پر ایک تعریفی خط میں بھی کیا۔ اخباری صنعت کے مسائل کو وہ کس قدر سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دو مرتبہ (اے پی این ایس) کے صدر رہے اور خاصا کام کیا۔ مصطفیٰ صادق کا زیادہ تر قیام آجکل اسلام آباد میں ہوتا ہے۔ آپ انتہائی مختصر وقت کے لئے جب لاہور تشریف لائے تو ان سے ملکی سیاست اور صحافت کے حوالے سے ایک دلچسپ مکالمہ ہوا جس کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے۔

س: اپنی ابتدائی زندگی اور اس ماحول کے بارے میں کچھ بتائیں جس میں آپ نے آنکھ کھولی؟

ج: میں خالص دیہاتی ماحول میں پیدا ہوا۔ ضلع ہوشیار پور میں آنکھ کھولی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میرا گاؤں صفائی ستھرائی کے اعتبار سے تعلیم، سیاست اور دینی اعتبار سے صفِ اوّل میں شمار ہوتا تھا، اس دور میں جب مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوئی تو قائداعظم کے ماننے والوں میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ میں نے تقاریر کیں 1946ء کے الیکشن میں حصہ لیا۔ 1951ء میں مولانا مودودیؒ نے لاہور میں جو تقریر کی تھی جب، وہ تقریر

Marfat.com

میں لوگوں کو سناتا ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ اس وقت کہاں تھے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ جب مولانا مودودی نے 1951ء میں تقریر کی تو میں سٹیج سیکرٹری تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ قائداعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کے بعد میرا دوسرا دور تب شروع ہوا ہے جب میں نے مولانا مودودیؒ کے ساتھ کام کیا۔ تحریک اسلامی کے ساتھ میں نے دس سال کا طویل عرصہ گزارا اگر آپ جو ماحول کی بات کر رہے ہیں تو جیسے میں نے پہلے بتایا کہ ہمارے گاؤں کا ماحول دینی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے ایک مثالی ماحول تھا۔ میں کسی خاص گاؤں کی تعریف نہیں کر رہا مگر یہ سمجھتا ہوں کہ اس جیسے گاؤں اگر یہاں بھی ہوتے تو آج ہم بہت زیادہ ترقی کر چکے ہوتے۔ وہاں کا ماحول بہت ہی پیار محبت والا تھا۔ بچیوں کی بہنوں کی طرح عزت کی جاتی تھی کوئی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک نوجوان غلطی سے اپنے مزاج کے مطابق سیٹی بجاتا ہوا گلی میں سے گزرا جس پر میرے تایا زاد بھائی نے اس سیٹی مارنے والے کا مار مار کر کچومر نکال دیا تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ میرا قصور کیا ہے۔ تایا زاد بھائی نے کہا تم نے سیٹی کیوں بجائی، یہ تھا وہ ماحول جس میں کوئی غیر اخلاقی بات برداشت بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اب لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاسی بحران ہے، معاشرتی بحران اور اقتصادی بحران ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اخلاقی بحران ہے جو قیادت قائداعظمؒ کے زمانے میں تھی اب وہ کبھی میسر نہیں آ رہی یہی وجہ ہے کہ ایک اسمبلی بنتی ہے تو ایک ٹوٹتی ہے۔ قرآن پاک میں ایک بڑھیا کا ذکر ہے کہ وہ بہت مضبوط سوت کاتی تھی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اسے توڑ دیتی تھی۔ ہم بھی اسمبلیاں بناتے ہیں ووٹنگ کرتے ہیں اور اس کے بعد اسمبلیاں توڑ دیتے ہیں۔ بہرکیف مجھے فخر ہے کہ میں نے تحریک پاکستان میں قائداعظمؒ کے ساتھ کام کیا۔ میں قائداعظمؒ سے بارہا ملا بھی ہوں، ان کی تقریر بھی سنی ہے۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کی صدارت میں ایک اجلاس ہو رہا تھا، میں نے اس میں کہا تھا کہ قائداعظمؒ کے ہاتھوں کو جب میں نے چھوا تھا تو اس کا لمس آج تک میرے ہاتھوں کو محسوس ہوتا ہے۔ قائداعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے۔ بہرکیف لوگ پاکستان کے لئے کام کر رہے ہیں جو قابل قدر اور قابل احترام ہیں۔

س: آپ تحریک پاکستان کے باعمل کارکن ایک دانشور اور ایڈیٹر بھی ہیں لیکن اگر آپ سے آپ کی شناخت کے بارے میں کہا جائے تو آپ اپنی شخصیت کا کس حوالے سے تعارف کروائیں گے؟

ج: ایسا نہ ہو کہ ذاتی تعریف ہو جائے مگر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں نے صحافت میں انتہائی سختی کے باوجود نظریاتی کالم لکھے ہیں۔ میں نے اپنے اصولوں اور اپنے نظریئے کو نہیں چھوڑا اگر آپ برا نہ مانیں تو میری برادری جو کہ ایک صنعت بن گئی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ بعض اداروں نے ترقی کی

Marfat.com

دوڑ میں اخلاقی قدروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔اس وقت صحافت تین چیزوں کی بنیاد پر چل رہی ہے ایک سیکس دوسرا اسکینڈل اور تیسری سنسنی خیز خبر (Sex, Scandle and Sansation) یہ تین ایسی چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر بعض اخبارات نے آپس میں مقابلہ کیا جس میں کچھ آگے نکل گئے اور کچھ پیچھے رہ گئے۔مگر الحمدللہ میں اس مقابلے سے بالکل الگ تھلگ رہا ہوں۔ایک بار پرائم ٹی وی لندن والوں نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ آپ کے ہاں اخباری صنعت پر کچھ پابندیاں ہیں۔ میں نے ان سے جواب میں کہا کہ ہمارے ہاں اخبارات کی تین قسمیں ہیں۔کچھ اخبار شہ زور ہیں کچھ منہ زور ہیں اور کچھ کمزور ہیں میرے جیسے۔لہٰذا شہ زور پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی منہ زور تو پہلے ہی منہ زور ہے جبکہ کمزور پر پابندی لگانے یا نہ لگانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر سچی بات یہ ہے کہ بڑے اخبارات میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے کردار اور اصولوں کو نبھایا ہے۔انہوں نے نظریہ پاکستان کی آبیاری کی ہے نظریہ پاکستان کا تحفظ کیا ہے اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے میں اپنی بعض دوسری کمزوریوں کے باوجود اچھا کردار ادا کیا ہے اور یہ رویہ بڑا قابل قدر ہے۔اب ہم آزادی صحافت کی بات کرتے ہیں میں نے امریکہ میں ایک ریڈیو ٹاک میں حصہ لیا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے ایوب خان کا دور دیکھا، یحییٰ خان اور ضیاء الحق کا دور دیکھا، دو دوار نواز شریف اور دو بے نظیر کے دیکھے۔ان میں سے کون سا دور ایسا تھا جو آپ کے خیال میں صحافتی پابندیوں سے آزاد تھا۔میں نے کہا کوئی بھی نہیں۔انہوں نے پوچھا کیا مطلب میں نے کہا مطلب یہ کہ میں نے تو کبھی کوئی پابندی قبول نہیں کی۔ہمارے ہاں صحافت کی آزادی کے لئے ہر دور میں جدوجہد ہوئی۔کبھی زیادہ اور کبھی کم لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کمزوری کی وجہ سے خدانخواستہ ہم لیٹ گئے۔

س: آپ کے والدین آپ کو کیا بنانا چاہتے تھے مگر آپ کیا بن گئے؟

ج: میرے والد تو اس وقت انتقال کر گئے تھے جب میں چوتھی جماعت کا امتحان دے کر گھر واپس لوٹا تھا، سارے سکول سے زیادہ میرے نمبر تھے اور میں روتا ہوا گھر آ رہا تھا۔کلاس فیلوز نے پوچھا کہ کیا ہوا میں نے ان سے کہا کہ میں نے جس والد صاحب کو جا کر بتانا تھا کہ میرے اتنے نمبر آئے ہیں۔اب وہ والد ہی دنیا میں نہیں رہے۔تو میں اپنی کامیابی کا کس کو بتاؤں؟ لہٰذا بچپن میں والد صاحب کی موت کی وجہ سے مجھے زمیندارہ مجبوراً کرنا پڑا میں نے کاشتکاری بھی کی اسی دوران میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔والدین مجھے کچھ نہیں بنانا چاہتے تھے اور میں یہ بات فخر سے کہوں گا کہ میرے والد کا نام لے کر لوگ ڈر جاتے تھے کہ اس کی اولاد کو گالی دینا نہیں آتی۔میرے والد کا نام حسین علی تھا اور اہل علاقہ کہا کرتے تھے کہ حسین علی کے بچوں کو گالی دینا نہیں آتی۔والدہ

Marfat.com

میرے لئے دعا کرتی تھیں وہ معذور تھیں مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جایا کرتے تھے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنا بوجھ اٹھانا پڑا۔

س: صحافتی دنیا میں کیسے آئے؟

ج: میں جماعت اسلامی میں ہوتا تھا۔ ارشاد حقانی اس وقت ''روزنامہ تسنیم'' میں کام کیا کرتے تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ آپ ''تسنیم'' میں کیوں نہیں آ جاتے۔ چنانچہ ان کے کہنے پر میں ''تسنیم'' میں چلا گیا وہاں میں کبھی سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا اور کبھی رپورٹنگ میں کام کرتا۔ تسنیم اخبار کی نوکری نہیں بلکہ ایک مشن تھا۔ وہاں کام کرتے کرتے ایک وقت ایسا آ گیا کہ ''آفاق'' میں آنا پڑا۔ آفاق سے نکلتے ہی میں نے ''وفاق'' شروع کر دیا میرے ساتھی جمیل اطہر صاحب تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ جماعت اسلامی میں کام کرتے کرتے صحافتی ڈگر پر چل نکلے۔ وہاں بھی کارکن تھے یہاں بھی کارکن تھے۔ وہ بھی مشن تھا یہ بھی مشن ہے۔ جس دفتر میں اس وقت ہم بیٹھے ہیں یہ بھی اسی مشن کا ایک حصہ ہے۔ یہ ''تحریک استحکام پاکستان'' کا دفتر ہے جس کا میں انچارج ہوں۔

س: اس وقت ہمارے ہاں کوئی نظریہ پاکستان اور کوئی استحکام پاکستان کی بات کر رہا ہے بعض مخالفین کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے مال پر بڑی بڑی جائیدادیں بنا لیں جبکہ پاکستان میں کہیں استحکام نظر نہیں آتا۔ آدھا ملک ویسے ہی کٹ گیا یہاں پر کسی طرح کی یکجہتی نہیں ہے لہٰذا یہ لوگ جو نظریہ پاکستان اور استحکام پاکستان کے بورڈ لگا کر بیٹھے ہیں یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے ؟

ج: یہ کہنا تو زیادتی ہے کہ ہم لوگوں نے کام نہیں کیا۔ ہم نے صرف فنڈ جمع نہیں کئے بلکہ کام بھی کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں کسی کی صفائی پیش نہیں کر رہا۔ مجید نظامی صاحب پر الزام تھا کہ انہوں نے 12 کروڑ روپے لے لئے جس کا مجید نظامی صاحب نے یہ جواب دیا کہ پورا بارہ کروڑ روپیہ بینک میں موجود ہے اور اس کا جو منافع ہے اس سے وہ ''نظریہ پاکستان ٹرسٹ'' کی ضروریات اور اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ جہاں تک ''تحریک استحکام پاکستان'' ہے تو کوئی اس کا فنڈ اور کوئی اس کا بیلنس نہیں۔

س: آپ نے تحریک استحکام پاکستان کے نام سے جو دفتر بنایا ہے اس کا مشن کیا ہے اور کام کیا ہو رہا ہے؟

ج: استحکام پاکستان کے لئے ہم بیداری کی ایک لہر پیدا کر رہے ہیں اس میں ہمارا کوئی اپنا سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ ہماری کوئی پولیٹیکل گیم یا سیاسی جماعت نہیں ہے۔ یہ کوئی الیکشن کی پارٹی بھی نہیں ہے۔ اس ملک میں ڈیڑھ سو سے زائد پارٹیاں ہیں جو الیکشن لڑتی ہیں مگر تحریک استحکام پاکستان واحد تنظیم ہے جس کا الیکشن سے

Marfat.com

کوئی تعلق نہیں ہمارا کوئی حریف نہیں اور کوئی حلیف نہیں کوئی دوست نہیں اور کوئی دشمن نہیں جو پاکستان کا دوست ہے وہ ہمارا دوست ہے اور جو پاکستان کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم تو بیداری کی ایک لہر پیدا کر رہے ہیں۔

س: آپ ایک قابل اور تجربہ کار اخبار نویس ہونے کے باوجود اپنے ''وفاق'' کو کامیاب نہیں کر سکے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: میں آپ کے سوال کا جواب پہلے دے چکا ہوں میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہاں مقابلہ سیکس، سنسنی خیزی اور سکینڈلز کا ہے۔ میں وفاق پر توجہ اس لئے نہیں دے سکا۔ میری کمزوریاں اور مجبوریاں اپنی جگہ پر مگر اس ملک میں جس قسم کی صحافت ترقی کر رہی ہے اس کا مقابلہ صرف تین بنیادوں پر ہے جس کا ذکر ابھی میں نے کیا جبکہ میں ان تینوں چیزوں پر یعنی سیکس، سکینڈلز اور سنسنی خیزی کی بنیادوں پر اپنا اخبار نہیں چلا سکا اور نہ ہی میں چاہتا ہوں اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ مجھے اخبار مزید مضبوط بنانا چاہئے تھا آپ کو یاد ہوگا کہ 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں وفاق سب سے آگے تھا اس طرح کوئی بھی تحریک دیکھ لیں مثلاً تحریک ختم نبوت میں بھی وفاق نے اہم رول ادا کیا۔

س: برائیوں کے خلاف جہاد کرنا تو عین فرض ہے بقول آپ کے اگر صحافت الیکٹرونک میڈیا میں اس قدر فحاشی، عریانی آ گئی ہے تو کیا ایسے میں ہمیں ان برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ میں نام نہیں لینا چاہتا مگر اب بھی چند اخبارات اور جرائد ایسے ہیں جو سیکس، سکینڈلز اور سنسنی خیزی سے دور آج بھی مولانا ظفر علی خان والی صحافت کر رہے ہیں۔ آپ نے ہتھیار کیوں ڈال دیئے؟

ج: جن کا آپ نے بغیر نام لئے ذکر کیا ہے جو بقول آپ کے اب بھی برائیوں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں ان کے پیچھے کچھ جماعتیں کام کر رہی ہیں میرے ساتھ کوئی جماعت نہیں ہے حتیٰ کہ کوئی گروپ تک نہیں ہے جبکہ ان اخبارات کے پیچھے بڑی بڑی جہادی تنظیمیں کام کر رہی ہیں مگر میرا اخبار کسی جہادی تنظیم کی مدد اور سرپرستی کے بغیر کام کر رہا ہے بے شک جہاد ایک قومی کاز ہے مگر میرے ساتھ کوئی جہادی تنظیم نہیں ہے۔

س: پاکستان میں جمہوریت کو زیادہ نقصان فوج نے پہنچایا یا سیاستدانوں نے؟

ج: دونوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔

س: کچھ مزید وضاحت؟

ج: وضاحت یہی ہے کہ سیاستدانوں نے سیاست زیادہ کی ہے انہوں نے گروہی اور علاقائی سیاست پر توجہ دی۔ تعصبات کو زیادہ ہوا دی ہے۔ رہی فوج تو اس کا کام سیاست کرنا نہیں تھا ان سے آپ کیسے توقع کریں

Marfat.com

گے وہ جمہوریت کے لئے بھی کام کریں گے وہ تو جمہوریت کے درمیان جو خلا یا گیپ آتا ہے اس کو پورا کرنے کے لئے آتے ہیں ان سے تو شکوہ کرنا ہی فضول ہے کہ انہوں نے جمہوریت کو فروغ کیوں نہیں دیا۔

س: اسلامی جمہوریہ پاکستان میں آج اسلام نظر آتا ہے اور نہ ہی جمہوریت پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہے۔ اسلام اور جمہوریت کی پاسداری کس نے کرنا تھی۔قوم پوچھتی ہے کہ نظریہ پاکستان اور استحکام پاکستان جیسی تنظیموں نے پاکستان میں اسلام اور جمہوریت کی بقاء کے لئے عملی طور پر کچھ کیا ہوتا تو آج یہ حالات تو نہ ہوتے ؟

ج: پاکستان کی سلامتی اور بقاء کی حفاظت پوری قوم نے کرنی تھی، دانشوروں نے کرنی تھی، قوم کے علماء نے کرنی تھی، سیاستدانوں اور حکمرانوں نے کرنی تھی اپنی اپنی جگہ سب نے ہی کوشش کرنی تھی جو کامیاب بھی ہونی چاہیے تھی مگر قوم کو اس مقصد کے لئے بیدار اور منظم نہیں کیا گیا۔قائداعظمؒ نے ہمیں ایک منزل تو دے دی مگر ہم اسے مضبوط اور مستحکم نہیں کر سکے۔

س: آپ استحکام پاکستان کی بات کرتے ہیں قائداعظمؒ کے مشن کو آگے لے جانے اور اسے کامیاب کرنے کے دعویدار ہیں مگر آپ ایک فوجی حکمران کے دور میں وزیر بن گئے؟ جنرل ضیاء نے آپ کو وزیر بنا دیا۔ کیا یہ سب جمہوریت کے فروغ کے لئے تھا؟

ج: میں نے ان سے وزارت طلب نہیں کی تھی بلکہ مجھ پر وزارت تھوپی گئی مجھے مجبور کر دیا گیا کہ یہ کام اس وقت آپ کے کرنے کا ہے کہ آپ کو آرڈی نیٹ کریں مجھے جنرل ضیاء نے کہا کہ اس ملک میں آپ کا ایک مقام ایسا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں آپ کو پسند کرتی ہیں، کابینہ آپ کو پسند کرتی ہے۔

س: یہ بات جنرل ضیاء نے آپ سے کہی تھی؟

ج: جی ہاں جنرل ضیاء نے کہا تھا بلکہ مجھ سے حلف لینے کے بعد انہوں نے جو الفاظ کہے تھے میں یہاں پر وہ الفاظ Quote کرنا چاہوں گا۔انہوں نے کہا ''آج ہم نے ایک ایسے وزیر سے حلف لیا ہے جو تمام سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کو اندر سے بھی جانتا ہے اور باہر سے بھی جانتا ہے۔'' ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ 1973ء کا آئین بنوانے میں میرا بھی رول تھا، اس سلسلے میں بھٹو کا میرے نام شکریہ کا پرسنل لیٹر بھی موجود ہے جس میں انہوں نے لکھا کہ آپ نے ہمیں اور اپوزیشن کو متحد کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے میں اس حوالے سے آپ کی خدمات کو بے حد سراہتا ہوں لہٰذا یہ وہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے ضیاء صاحب نے یہ سمجھا کہ مصطفیٰ صادق تمام جماعتوں کو ایک کر کے اچھے Element کو آگے لا سکتا ہے۔پھر آپ کو یاد ہوگا کہ صحافت

Marfat.com

میں بھی (APNS) آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کا دو مرتبہ صدر رہا۔ جنرل ضیاء نے جس وقت مجھے بطور وزیر لیا اس وقت میں کونسل آف نیوز پیپر سوسائٹی کا صدر تھا۔ 7 اپریل 1988ء کو جنرل ضیاء نے مجھے کابینہ میں لیا اور 26 مارچ 1988ء کو نظامی صاحب اور میر خلیل الرحمٰن دونوں کی مشترکہ تجویز تھی کہ مصطفیٰ صادق کو APNS کا صدر بنانا چاہیے۔ پشاور میں کونسل کا اجلاس ہوا جس میں مجھے APNS کا صدر بنایا گیا۔ لہٰذا جس آدمی کو ایڈیٹروں نے صدر نامزد کیا ہو اس کو ضیاء الحق نے کوئی رشوت نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ آدمی چونکہ اخبارات میں بھی کام کر سکتا ہے سیاستدانوں کے ساتھ بھی چل سکتا ہے اس لئے انہوں نے میرے نام کے ساتھ عوامی رابطے کا وزیر لکھا تھا۔ معاف کیجئے گا ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے وزارت کے لئے کوئی بھاگ دوڑ کی ہو بلکہ فوجی حکومت نے ضرورت محسوس کی کہ وہ میرے جیسے آدمی کی خدمات حاصل کرے۔ دیکھئے نا جب میں نے ان سیاستدانوں کو اکٹھا کر کے 1973ء میں آئین بنوا دیا جسے بھٹو نے بھی سراہا تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ میں سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کو اکٹھا کر سکتا ہوں۔

س: آپ سیاستدانوں کے بہت نزدیک رہے اس ملک کے سیاسی نظام کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا، ماضی کے اس تجربے اور مشاہدے کو سامنے رکھتے ہوئے آپ یہ فرمائیں کہ اس وقت پوری قومی اسمبلی کو چھوڑ کر باہر سے آئے ایک شخص کو وزیر اعظم بنوانے کی جو کوشش ہو رہی ہے اس کے پیچھے کیا مقاصد ہیں؟

ج: اصل میں یہ بڑا ذاتی سا سوال ہے بہر کیف جو کچھ انہوں نے کرنا ہے وہ ہر صورت میں کر کے رہیں گے۔ مگر آپ مجھے بتائیں کہ اور کونسا ایسا کام ہے جو عوام کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ نصاب کی تبدیلی عوام کی مرضی سے ہو رہی ہے۔ اب تو سیاست اور تجارت بھی عوام کی مرضی سے نہیں ہو رہی۔ بھارت کے ساتھ تعلقات بھی عوام کی مرضی سے نہیں ہو رہے، کشمیر کا مسئلہ عوام کی مرضی سے حل نہیں ہو رہا اس لئے تو وہ جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں۔

س: یہ کیا بات ہوئی کہ جمالی صاحب کو مزید ڈیڑھ ماہ برداشت نہ کیا جا سکا اگر شوکت عزیز کو ہی وزیر اعظم بنانا تھا تو ڈیڑھ ماہ کے لئے شجاعت حسین کو وزیر اعظم بنانے کا تکلف کیوں کیا؟

ج: یہ سوال تو آپ کو پرویز مشرف سے کرنا چاہئے کہ وہ جمالی کو کیوں برداشت نہیں کر سکے وہ کون سی مصلحت تھی کہ جس کی وجہ سے انہیں فوری کاروائی کرنا پڑی۔

س: پاکستان نے آپ کو عزت دی، نام دیا مقام دیا اور شہرت بخشی، جواب میں آپ نے پاکستان کو کیا لوٹایا؟

Marfat.com

ج: میرا تو اوڑھنا بچھونا ہی پاکستان کا استحکام ہے، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ استحکام پاکستان کے لئے وقف ہے۔ میں نے پاکستان بنانے میں رول پلے کیا میں نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے میں کردار ادا کیا، جو کچھ ہو سکا اب بھی کر رہا ہوں اور میں اس کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

س: دوسرے اخبارات کے مالکان کے بیٹوں نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے اخبارات کی ترقی و ترویج کے لئے کام کیا، روزنامہ وفاق کی ترقی میں اس قسم کا کردار آپ کے بیٹوں میں سے کسی نے کیوں نہیں کیا؟ جتنا پرانا یہ اخبار ہے اسے تو دنیائے صحافت کے بامِ عروج پر ہونا چاہئے تھا؟

ج: دراصل جو جس کے نصیب میں ہوتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ آپ نے جن اخبارات کا ذکر کیا ہے وہ بڑے ادارے تھے ان کے بڑے وسائل تھے، بڑے اداروں نے بڑے وسائل سے اپنے بچوں کی تربیت کی اور انہوں نے اپنے ادارے سنبھال لئے۔ میرا چھوٹا ادارہ ہے وسائل کم ہیں مگر میرے بیٹے بھی اپنے وسائل کے مطابق کام کر رہے ہیں۔

س: صحافتی حوالے سے آپ اپنے کسی بیٹے کو اپنا جانشین سمجھتے ہیں؟

ج: صحافتی حوالے سے تو میں اپنا جانشین اپنے آپ کو ہی سمجھتا ہوں۔

س: آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پایہ تکمیل کو نہ پہنچی ہو؟

ج: پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا میری خواہش رہی ہے اسی کے لئے پیدا ہوا تھا اسی کے لئے کام کیا اور اسی کے لئے کام کر رہا ہوں کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ ہو۔ یعنی وہ خواہش جو کامیاب نہیں ہو رہی اس کے لئے کام کر رہا ہوں۔

س: آپ اپنے بچوں کے باپ ہیں یا دوست؟

ج: میں اپنے بچوں کو نیکی کے کاموں کی تلقین کرتا رہتا ہوں، نیکی کے کاموں کی طرف توجہ دلاتا ہوں، دبدبہ و رعب میرے مزاج کا حصہ نہیں، نہ میں نے کبھی ایسا رویہ اختیار کیا ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی توجہ اس طرف ضرور دلاتا ہوں کہ نیکی کے کام کرنے چاہئیں۔

س: جب بھی پیپلز پارٹی کا دور آتا تھا تو مخالفین الزام لگایا کرتے تھے کہ ٹی وی پر مادر پدر آزادی ہو جاتی ہے۔ لالی ووڈ، ہالی ووڈ بن جاتا ہے مگر آج کیبل پر جس طرح کا عریانی اور فحاشی کا سیلاب گھر گھر آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آپ مذہبی ذہن کے آدمی ہیں کیا اس رجحان کے خلاف کبھی آپ نے آواز اٹھائی ہے؟

ج: ایک نیشنل کانفرنس کولمبو میں ہوئی تھی میں نے اس میں کہا تھا کہ ہمارے ملک میں مغربی اور انڈین کلچر کا

Marfat.com

جو سیلاب آ رہا ہے اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں جوابی سیلاب لانا پڑے گا۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اگر آپ اس کلچر کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو جوابی سیلاب بن کر مقابلہ کریں اب تو تشویش کی بات ہے کہ ہمارے ہاں چینلز اور اخبارات کے ذریعے انڈین کلچر گھر گھر میں گھس آیا ہے۔

س: ہمارے ہاں اس قدر نیوز چینلز آ گئے ہیں کیا ان کی وجہ سے اخبارات کی اہمیت کچھ کم نہیں ہو گئی؟

ج: میں نے تحریک استحکام پاکستان کی ایک میٹنگ میں کہا تھا کہ جب تک ٹیلی ویژن گھروں میں موجود ہے ہمارے گھروں میں اسلام نہیں آ سکتا کیونکہ ہر ٹی وی چینل پر کیبل بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔ شعبہ ابلاغ پنجاب یونیورسٹی کے انچارج ڈاکٹر مغیث الدین شیخ تھے انہوں نے کہا تھا: لوگو! اس وقت سے پہلے اپنی صلاح کرلو اور انڈین کلچر سے پناہ مانگو۔ جب میری بچی کے ماتھے پر تلک نہیں لگ جاتا، اپل صاحب یہ تو بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم اس کے باوجود بڑی تیزی کے ساتھ انڈین کلچر کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔

س: مصطفیٰ صادق صاحب ایک بات سچ سچ بتائیں کیا زندگی کے کسی دور میں آپ نے عشق کیا ہے؟

ج: میں کسی عشق کے نام سے مرعوب نہیں ہوا میں نے تو عشق کیا ہے مسجد سے۔ معلوم نہیں عشق کو کون ضروری سمجھتا ہے۔ ہماری تو ٹھیک وقت پر شادی ہو گئی اور الحمد للہ بیوی سے زیادہ پیار کبھی کسی سے نہیں ہوا۔

س: آپ کی شادی لو میرج تھی یا ارینج میرج تھی؟

ج: میری شادی ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ماموں نے اور میری والدہ نے آپس میں ہماری شادی کے بارے میں طے کیا تھا کیونکہ اس زمانے میں لڑکی اور لڑکے سے ان کی پسند کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا تھا۔ اس وقت ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔ جس دور میں ہم نے شادی کی اس دور میں پسند یا ناپسند کی بات نہیں تھی۔

س: آپ کے بہت پرستار اور چاہنے والے ہیں آپ کی آئیڈیل شخصیت کون ہے؟

ج: میرے آئیڈیل صرف نبی اکرم ﷺ ہیں، ان کی ذات کے علاوہ مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

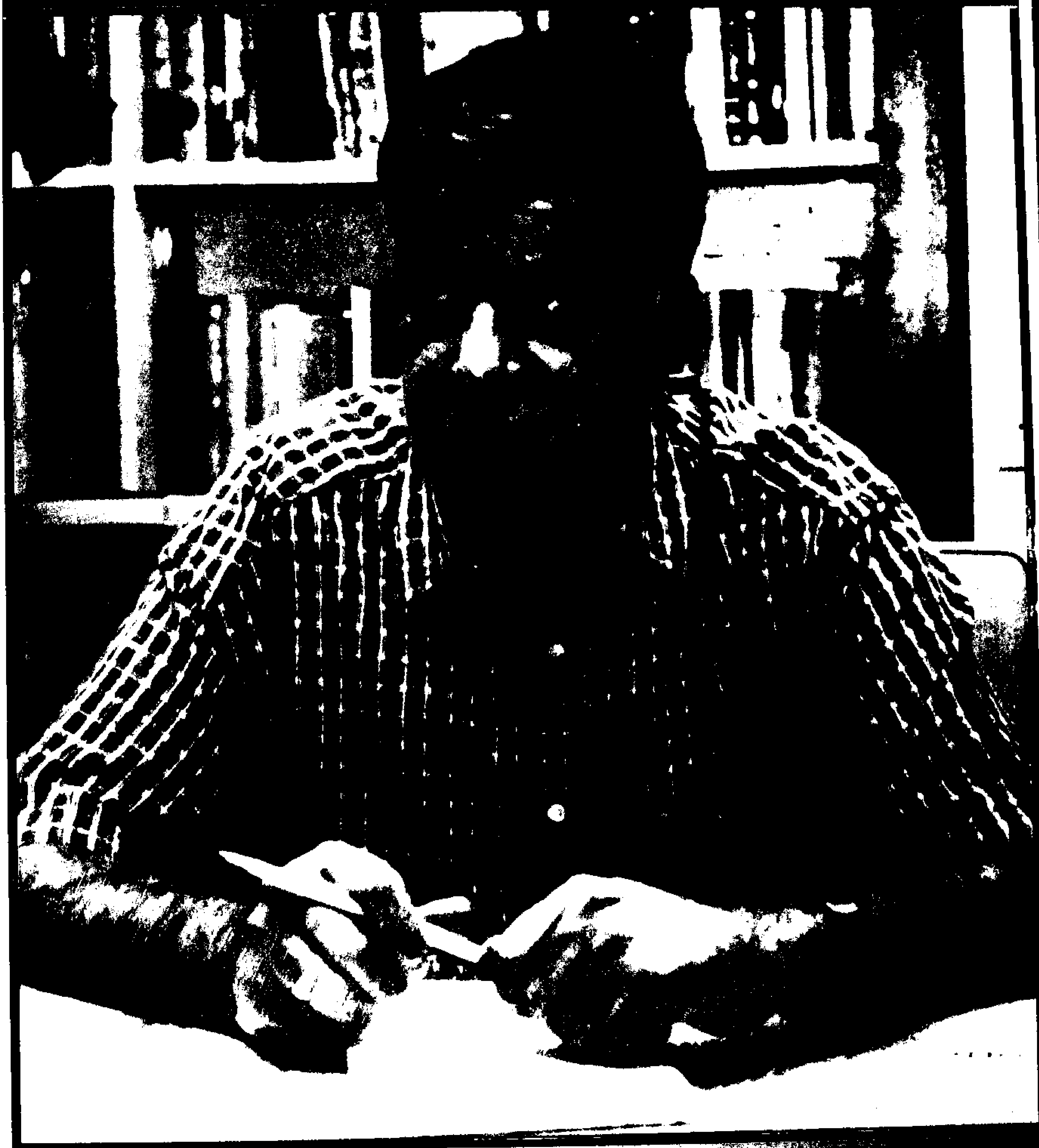

Marfat.com

Marfat.com

ڈمی اخبارات سرکاری چندے پر پلتے ہیں

عارف نظامی

عارف نظامی کا بچپن اس اعتبار سے قابل رشک ہے کہ انہوں نے ''علم'' کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اس دور کے صحافتی ماحول میں ہوش سنبھالا جب قلم کی حرمت اور ضمیر کی پاسداری لکھنے والوں کا ایمان تھا۔ آپ نوائے وقت کے بانی اور بیباک صحافیوں کے امام حمید نظامی (مرحوم) کے صاحبزادے ہیں، اپنے والد کے صحافتی اصولوں کی شاہراہ پر قدم قدم چلتے ہوئے آج وہ پاکستان کے ایک مقبول اور معتبر انگریزی اخبار ''دی نیشن'' کے چیف ایڈیٹر ہیں، اس کے علاوہ اے پی این ایس کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور اس حوالے سے نہ صرف اخباری مالکان بلکہ صحافیوں کے مسائل سے بھی پوری طرح آگاہی ہے، اخلاقی روایات کی پاسداری ان کا ایمان ہے، زیر نظر انٹرویو میں جو گفتگو ہوئی وہ ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

س: آپ اس وقت جس مقام پر کھڑے ہیں کیا یہی آپ کے بچپن کا خواب تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان بننا چاہتے ہوں مگر اتفاقات نے آپ کو صحافی اور ایڈیٹر بنا دیا ؟

ج: ظاہر ہے زندگی میں اتفاقات کا بڑا دخل ہوتا ہے ہماری فیملی میں تو تقریباً ماحول ہی لکھنے پڑھنے کا تھا۔ میرے والد حمید نظامی صاحب (مرحوم) اس ادارے کے بانی تھے میں نے ان کو اکثر کام کرتے دیکھا لہٰذا اس

Marfat.com

اعتبار سے میری تربیت میں ایک تو ماحول کا بڑا دخل ہے ویسے شوق بھی تھا۔

س: ماحول اپنی جگہ درست مگر جب آپ کالج کی سطح پر تعلیم حاصل کر رہے تھے تب اپنے مستقبل کے بارے میں آپ کی ذاتی سوچ کیا تھی کیا آپ کی پہلی ترجیح صحافت ہی تھی یا کچھ اور بننا چاہتے تھے؟

ج: میری پہلی ترجیح ہی یہی تھی کہ میں جرنلزم کی فیلڈ میں آؤں، یہی وجہ تھی کہ میں نے ایم اے بھی جرنلزم میں کیا۔ میرا بھرپور رجحان اسی طرف ہی تھا، ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے اس طرف آنے کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔

س: آپ کی تربیت میں آپ کے والد حمید نظامی (مرحوم) کا عمل دخل تو ہے ہی مگر مجموعی طور پر والد اور والدہ میں سے آپ کی تعلیم و تربیت میں زیادہ حصہ کس کا ہے؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تعلیم و تربیت میں والد صاحب کا بہت دخل تھا، والد صاحب کی طرف سے جرنلزم کی مجھے جو تربیت ملی وہ اپنی جگہ پر مگر جب ان کا انتقال ہوا تب میری عمر تیرہ برس تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں میری والدہ صاحبہ بھی علی گڑھ کی گریجویٹ تھیں، وہ بڑی اچھی اردو دان تھیں اور ان کی تربیت کا اس لحاظ سے بھی خاصا دخل ہے کہ انہوں نے اس انداز میں میری پرورش کی کہ جس کی بنیاد پر میں اپنے والد کے اصولوں کی آبیاری کر سکوں، اس کے ساتھ ساتھ مجید نظامی صاحب کا بڑا دخل ہے جن کے زیر سایہ میں نے اس پروفیشن کے تقاضوں کو سمجھا۔ مجید نظامی صاحب کا بھی وہی مشن اور مقصد ہے جو میرے والد حمید نظامی (مرحوم) کا تھا۔

س: زمانہ طالب علمی میں آپ کی تفریحات اور مشاغل کس طرح کے تھے، سپورٹس وغیرہ سے دلچسپی تھی؟

ج: سپورٹس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی یہ درست ہے کہ میں نے سکوائش بھی کھیلی ہے۔ کرکٹ بھی تھوڑی بہت کھیلتا رہا، فلمیں دیکھنے کا شروع سے شوق تھا۔ حمید نظامی صاحب (مرحوم) کو بھی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ ہفتے میں دو تین فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ویڈیو وغیرہ تو نہیں تھا وہ دیکھتے بھی انگریزی فلمیں تھے اس کے علاوہ انہیں میوزک کا بھی شوق تھا۔

س: آپ کس قسم کی فلمیں دیکھا کرتے تھے؟

ج: میں بھی زیادہ انگریزی فلمیں ہی دیکھا کرتا تھا۔

س: اس کی کیا وجہ ہے کہ جس ماحول میں آپ نے پرورش پائی وہاں زیادہ تر اسلامی ماحول تھا اردو زبان کا اثر تھا پھر انگریزی فلموں سے دلچسپی کیسے ہوئی؟

Marfat.com

ج: اسلامی ماحول تو اپنی جگہ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ نوائے وقت کی بھی جس طرح سے پالیسی رہی ہے۔حمید نظامی (مرحوم) بھی ایک جدید آدمی تھے۔ جدید آدمی سے مراد یہ ہے کہ وہ پاکستان کو ایک جدید اسلامی اور جمہوری ریاست کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے وہ سگریٹ تک نہیں پیتے تھے مگر اس کے باوجود وہ بڑے خوش لباس تھے۔ مجید نظامی صاحب بھی خوش لباس ہیں یقیناً یہ بات بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ نوائے وقت ایک اسلامی اور جمہوری پاکستان کے حق میں ہے۔حمید نظامی صاحب کے اداریوں میں یہ فقرہ بار بار استعمال ہوا کہ پاکستان میں پاپائیت نہیں چلے گی، مطلب یہ کہ وہ یہاں اسلامی اور جمہوری نظام دیکھنا چاہتے تھے اس پیرائے میں اگر آپ دیکھیں تو بہت سی چیزیں ان کی زندگی کا حصہ تھیں۔مثلاً آپ نے جو انگریزی فلم کی بات کی ایسا نہیں تھا کہ انگریزی فلم دیکھنا خلافِ اسلام ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ چیزیں جو اسلامی اخلاق اور قیود کے دائرہ میں آتی ہیں ان میں کوئی برائی بھی نہیں۔

س: آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

ج: ہم چار بہن بھائی ہیں۔

س: آپ کا نمبر کونسا ہے؟

ج: شعیب نظامی صاحب میرے بڑے بھائی ہیں۔

س: حمید نظامی صاحب کی بچوں کی تعلیم وتربیت کے اعتبار سے زیادہ توجہ اور شفقت کس کے لئے تھی؟

ج: میرا چھوٹا بھائی تو بہت چھوٹا تھا اس کا تو چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا مگر جو آپ نے سوال کیا تو ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ نظامی صاحب کی کسی ایک بچے پر زیادہ توجہ ہو انہوں نے سب کو مساوی توجہ اور محبت دی۔

س: ایک بچہ یا نوجوان وہ ہوتا ہے جو زندگی میں تمام کامیابیاں اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے حاصل کرتا ہے۔مگر ایسے بچے بھی ہیں کہ جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں، انہیں بنا بنایا ایک سیٹ اپ مل جاتا ہے۔اس سلسلے میں عدنان شاہد، عمر شامی، میر شکیل اور عرفان اطہر کی مثال دی جاتی ہے۔ان کو تو بنے بنائے ادارے اور سیٹ اپ مل گئے آپ کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟

ج: میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔خدا کا شکر ہے بعد یہ ٹرینڈ چل نکلا کہ اور نوجوان بھی اخباری صنعت میں آ گئے میں جب نوجوان تھا تب کی بات نہیں کر رہا تاہم میرا مسئلہ دوسروں سے ذرا مختلف ہے میں اس فیلڈ میں آتے ہی ادارہ نوائے وقت کا میگزین ایڈیٹر، ایگزیکٹو ایڈیٹر، نیشن، کا ایڈیٹر نہیں لگ گیا۔سب سے

Marfat.com

پہلے تو میں نے پیشہ ورانہ تربیت حاصل کی جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ میں نے تعلیم کے علاوہ عملی طور پر نوائے وقت اور ''نیشن'' کے ہر شعبے میں پریس سے کام شروع کیا۔ اگر نوائے وقت کی بلڈنگ سے جب نیچے جائیں گے تو قندیل پریس آپ کو نظر آئے گا۔ یہ نوائے وقت کا پریس تھا یہاں پر میں نے ہاتھ سے پلیٹیں بھی لگائی ہیں مشین بھی چلائی ہے اس کے بعد جب میں نے بی اے کر لیا تو ایم اے جرنلزم کے ساتھ ساتھ یہاں میں پارٹ ٹائم کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ جب میں نے ایم اے جرنلزم کر لیا تو میں نے یہاں آ کر ایک جونیئر رپورٹر کے طور پر کام کیا حتیٰ کہ لاہور کارپوریشن، ایجوکیشن کی Beet پر کام کیا۔ میں پنجاب اسمبلی کی بھی کوریج کرتا رہا۔ میں نے سالہا سال رپورٹنگ کی اس کے بعد مجھے ڈائیگ ہمر ڈ شولڈل گئی اور مجھے ملک سے باہر جانا پڑا پھر جب میں واپس آیا تو نوائے وقت کا ڈپٹی ایگزیکٹو رہا، اس کے بعد ایگزیکٹو ایڈیٹر مقرر رہا۔ جہاں تک ''دی نیشن'' کا تعلق ہے تو 1986ء میں مجید نظامی صاحب کی راہنمائی میں یہ میں نے خود شروع کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے بنا بنایا اخبار مل گیا۔ اس کی پلاننگ کے علاوہ اس کی جو Conception ہے اس پر توجہ دی۔ یہ ''پاکستان ٹائمز'' کے بعد لاہور سے پہلا انگریزی اخبار تھا، سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں ہاتھوں سے کام کرنا جانتا ہوں میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ عدنان شاہد صاحب اور عمر شامی صاحب بھی بڑا اچھا کام کر رہے ہیں مگر آپ نے چونکہ میرے بارے میں پوچھا تو اس لئے اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں۔

س: آپ کی تربیت ''نوائے وقت'' میں اردو جرنلزم کے ماحول میں ہوئی، پھر جب آپ نے انگریزی اخبار ''دی نیشن'' کا آغاز کیا تب یہ کام اور تجربہ آپ کے لئے نیا اور انوکھا نہیں تھا؟

ج: جیسا کہ میں نے آپ سے شروع میں عرض کیا میری Formal تعلیم انگریزی اداروں میں ہوئی۔ اس کے بعد جب میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ماس کمیونیکیشن میں ایم اے جرنلزم کیا تو وہ بھی انگریزی میں تھا۔ آپ نے یہ ذکر کیا تو میں آپ سے کھل کر بات کروں۔ میرا خیال ہے کہ اردو صحافت کرنے کے لئے بھی انگریزی زبان کی روانی بہت ضروری ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے اردو اخبارات میں یہ Limitation سی ہوتی ہے کہ وہ انگریزی بول سکتے ہیں اور نہ انگریزی لکھ سکتے ہیں۔ یہ وہ تلخ حقیقت ہے کہ چاہے ہمیں اچھا لگے یا نہ لگے اسے آپ کافروں کی زبان کہیں یا کچھ اور کہیں لیکن ضروری ہے کہ دنیا کے جو عصری تقاضے ہیں اس میں پروفیشنلزم کا تقاضا یہی ہے اردو کو اگر آپ میرے گھر کی لونڈی قرار دیتے ہیں تو وہ اور بات ہے اس لحاظ سے مجھے فخر ہے کہ میں Tri Engular جرنلسٹ ہوں۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حمید نظامی صاحب (مرحوم) اور مجید نظامی صاحب نوائے وقت کی پالیسی اور

Marfat.com

مشن کے جس ٹریک پر پہلے چل رہے تھے میری مراد اسلام اور نظریہ پاکستان سے ہے مگر اب ایسا کم نظر آ رہا ہے۔ مثلاً آپ کی اس وقت جو پبلیکیشنز آ رہی ہیں، ان میں تھوڑا سا ماڈرن ازم آ گیا ہے۔ آج جب نوائے وقت کے نظریاتی قارئین، ''نیشن''، ''نوائے وقت'' یا فیملی میگزین میں کچھ ایڈوانس قسم کی تحریریں پڑھتے ہیں اور تصاویر دیکھتے ہیں تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شاید آپ کا نظریاتی اور اسلامی ادارہ اپنے ہی بنائے ہوئے ٹریک سے ذرا ہٹ گیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: آپ نے مشن کی بات کی تو مشن کیا ہے؟ ہمارا مشن یہ ہے کہ اس ملک میں جمہوری اداروں کو مضبوط کرنا ہے اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے کام کرنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مشن کو آگے بڑھانے کے لئے کیا کیا جائے۔ ایک ایسا اخبار نکالا جائے یا زندہ رکھا جائے جو مفادات کی خاطر کسی کے سامنے نہ جھکے اور کاروباری لحاظ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو تب ہی وہ اپنے مشن کو پورا کر سکے گا وہ اخبارات اور صحافی جو سیاسی جماعتوں کے چندوں پر بیٹھے ہیں یا اپنے کارکنوں کو وہ تنخواہ نہیں دے سکتے وہ کیا اپنے مشن کو پورا کریں گے۔ آپ یہ صحیح کہہ رہے ہیں کہ عصری تقاضوں کے مطابق ہمیں حدود وقیود میں رہتے ہوئے کوشش کرنی ہے کہ ہم اپنے ٹریک سے نہ ہٹیں۔ اس وقت بہت ساری چیزیں ہیں جو باقی اخبارات کر رہے ہیں ہم نہیں کرتے مثلاً انڈین ایکٹرسوں کی تصاویر ہمارے ہاں نہیں چھپتیں، مردانہ کمزوری کے فراڈ اشتہارات جو بعض دوسرے اخبارات پورے پورے صفحات پر چھاپ رہے ہیں ہم وہ نہیں چھاپتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے جیسے آپ کو علم ہوگا کہ ہم اپنی پالیسی کے لئے قربانی دینا بھی جانتے ہیں لہٰذا یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے لیکن ہمارا بنیادی طور پر ایک مشن ہے مگر ہم ایک مکمل اخبار بھی ہیں البتہ میں نے جس مشن کا ذکر کیا ہے وہ کوئی تبلیغی مشن نہیں ہے ہم ''ضرب مومن'' یا جیسے اس طرح کے اخبارات ہیں ہم ویسے نہیں ہیں۔

س: آپ نے ابھی ایک بات کی کہ بعض اخبارات سیاسی چندوں پر پل رہے ہیں آپ ایسے اخبارات کی نشاندہی کرنا پسند کریں گے؟

ج: میں نے تو ایک جنرل سی بات کی ہے میرا نہیں خیال کہ کوئی اخبار سیاسی چندوں پر چل رہا ہے مگر ایسے تو اخبارات ہیں جو ڈمی ہیں سرکاری چندوں پر تو چل ہی رہے ہیں۔

س: ''پاکستان ٹائمز'' کی انگریزی صحافت میں اپنا ایک مقام اور شناخت تھی اگر وہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام نہ جاتا تو شاید وہ آج بھی نمبرون انگریزی اخبار ہوتا۔ اس میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر چھپنے والے مضامین اور ایڈیٹر کی ڈاک میں چھپنے والے خطوط کی ایک اپنی خوبصورتی اور اہمیت ہوا کرتی تھی اور جرنلزم سے وابستہ لوگ

Marfat.com

بھی پاکستان ٹائمنر کے مضامین اور خبروں سے رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے مگر یہ کیا وجہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور سہولتیں ہونے کے باوجود نیشن اور ''نیوز'' اس جیسا مقام نہیں بنا سکے؟

ج: میرا تو خیال ہے کہ آج کے انگریزی اخبارات پاکستان ٹائمنر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جس طرح کا میٹریل آپ کو نہ صرف میرے بلکہ دوسرے اخبارات میں پڑھنے کو ملتا ہے میں صرف اپنے اخبار کی بات نہیں کر رہا اس کے علاوہ ''نیوز''، ''ڈان'' اور ''ڈیلی ٹائمنر'' ہے۔ البتہ ایک مسئلہ ضرور ہے کہ اخبارات بہت زیادہ نکل آئے ہیں ابھی میں امریکہ گیا ہوا تھا نیو یارک جیسے اتنے بڑے شہر میں صرف ایک معیاری اخبار ہے ''نیو یارک ٹائمنر'' باقی دو اور ہیں، ڈیلی نیوز یا اسی قبیل کے دوسرے اخبارات، جبکہ لاہور جیسے شہر سے چار انگریزی اخبار نکلتے ہیں۔ انگریزی اخباروں کی سرکولیشن بہت محدود ہے ان کی ہفتے کی سرکولیشن اردو اخبارات کی ایک دن کی سرکولیشن کے برابر ہوتی ہے۔ میں آپ کو اس حوالے سے ایک واقعہ سناؤں، میں سی پی این ای کا صدر تھا جب پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈر منسوخ ہوا تو یہ نیک کام میرے ہی ہاتھوں سے ہوا۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ میرا ہی کمال تھا کیونکہ میں سی پی این ای کا صدر تھا جب پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈر منسوخ ہوا تو یہ نیک کام میرے ہی ہاتھوں سے ہوا۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ میرا ہی کمال تھا کیونکہ میں سی پی این ای کا صدر تھا۔ اسی دور میں جنرل ضیاء الحق کا طیارہ کریش ہوا جس کے بعد ایک ایسی حکومت آئی جس کے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے۔ غلام اسحاق خان صدر بھی تھے اور چیف ایگزیکٹو بھی۔ الٰہی بخش سومرو وزیر اطلاعات تھے۔ اس دور میں اخبارات جاری کرنے پر پابندی ختم ہوئی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اخبارات بہت زیادہ ہو گئے ہیں جبکہ صحافی اتنے نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ صحافیوں کے لئے کوئی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نہیں ہیں ہمارے نوجوان جو ماشاء اللہ شعبہ صحافت میں ماسٹر کرتے ہیں یا کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے آتے ہیں ان میں پروفیشنلزم نہیں آتا کیونکہ پروفیشنلزم عملی کام کے دوران ہی حاصل ہوتا ہے۔

س: پاکستان ٹائمنر کی بات میں نے اس حوالے سے کی تھی کہ وہ اخلاقی اقدار کا خیال بہت زیادہ رکھتا تھا جبکہ آج وہ چیز نظر نہیں آتی۔ مثلاً کچھ عرصے پہلے جب مونیکا کلنٹن سکینڈل منظر عام پر آیا تو نیشن نے مونیکا کا وہ عدالتی بیان من وعن تین چار اقساط میں شائع کر دیا جو اس نے عدالت میں کلنٹن کے خلاف دیا تھا۔ مونیکا کا یہ بیان اس قدر غیر اخلاقی اور فحش تھا کہ جب وہ نوائے وقت جیسے پلیٹ فارم سے نیشن نے شائع کیا تو قارئین کو ایک دھچکہ سا لگا سوال یہ ہے کہ کیا مونیکا کا عدالتی بیان چھاپنا نیشن کی مجبوری تھی؟

س: مجھے تو یاد نہیں ہے ویسے اگر میرے خیال میں اس بیان میں کوئی ناقابل اشاعت چیز چلی گئی تھی تو ایسا

Marfat.com

نہیں ہونا چاہیے تھا۔

س: مجید نظامی صاحب نے اپنے حالیہ انٹرویو میں میرے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ انہوں نے نیشن کے بعض ایڈیٹرز کو اس قسم کی حرکات کی وجہ سے فارغ کیا تھا۔ کیا یہ درست ہے کہ مجید نظامی صاحب ''نیشن'' کے انتظامی معاملات میں اس طرح کے فیصلے کر سکتے ہیں؟

ج: جی ہاں بالکل۔

س: آپ کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ آپ بہت کم کم عوامی آدمی ہیں۔ بعض دوسرے اخباری مالکان اور چیف ایڈیٹرز کی طرح آپ کی وہ پی آر بھی نہیں ہے جس طرح یہ لوگ حکومتی و سرکاری حلقوں اور الیکٹرونک میڈیا میں وقتاً فوقتاً نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنے اخبارات کے لئے مفادات اور مالی فائدے بھی حاصل ہوتے رہتے ہیں جبکہ آپ کا ایسا کوئی رجحان نہیں ہے حتیٰ کہ آپ کی تو اپنے اخبار میں بھی تصویر نظر نہیں آتی؟

ج: اب تو پھر بھی آنا شروع ہو گئی ہے مگر آپ کو شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ میرے والد صاحب (مرحوم) نے جو روایات چھوڑی تھیں اس میں ان کا اپنا نام بھی اپنے اخبار میں نہیں چھپتا تھا۔ دوسرا ہم نے اپنے والد صاحب کے اصولوں سے یہ سیکھا ہے کہ حکمرانوں کا طواف نہ کیا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ پی آر کے نام سے خوشامد ہم سے نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ملاقات ہو تو ہم بڑی عزت کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ دوسرا اشارہ اگر آپ کا یہ ہے کہ ہم ایڈیٹر کے طور پر باہر جا کر چھاپے ماریں اور خود اپنے آپ کو خبر بنالیں تو میرے خیال میں یہ ایڈیٹر کا کام نہیں ہے۔ ایڈیٹروں کا کام تو کچھ اور ہوتا ہے مثلاً حمید نظامی صاحب (مرحوم) اور مجید نظامی صاحب نے نظریہ پاکستان کیلئے بہت کام کیا ہے آپ نے کہا میں عوامی نہیں یہ بات درست نہیں مگر یہاں ہمیں عوامی کی تشریح کرنی پڑے گی کہ یہ کیا ہے۔ اگر حکمرانوں والا کوئی سٹائل ہے تو دوسری بات ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ نوائے وقت اور نیشن کے اشتہارات بند ہیں۔ یہ سلسلہ پورے ایک سال سے چل رہا ہے اب بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ آپ جائیں اور سجدہ سہو کریں تو اشتہارات دومنٹ میں کھل سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بہت سے ایڈیٹرز اور مالکان نے یہ کام کئے اور کرتے ہیں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی انڈسٹری کے جو ساتھی ہیں وہ آپ کے اشتہارات بند ہونے پر خوش ہیں کیونکہ بجٹ ان کو ملتا ہے ہم کہتے ہیں چلیں اچھی بات ہے ان کو مبارک ہو، ہمارے ساتھ بظاہر وہ سب کھڑے ہوئے ہیں لہٰذا اس صورتحال میں بعض اوقات اپنے وقار اور عزت سے کھیلنا پڑتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مالی نقصان ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ کا یہ خاصا ہے اور بطور ہتھیار

Marfat.com

پی این ایس کے اور اس سے پہلے سی پی این ای کے صدر اور ایک ادارے کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بھی ہم اشتہارات کے سرکاری کنٹرول میں ہونے کے سخت خلاف ہیں کہ ان کو اخبارات کی پالیسیاں متاثر کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

س: شیخ رشید صاحب کا کہنا ہے کہ اشتہارات کے معاملے میں حکومت تمام اخبارات کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے؟

ج: بات یہ ہے کہ سیاستدانوں کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ شیخ صاحب تو ایسے فارمولے پر چل رہے ہیں کہ اتنا جھوٹ بولو کہ وہ سچ ہو جائے۔ اخبار کوئی ٹیکسٹائل مل تو نہیں ہے یہاں ہم کوئی صابن تو نہیں بنا رہے اخبار بنا رہے ہیں اس میں اگر آپ کو کوئی سرکاری اشتہار نظر آ گیا ہو تو آپ مجھے بتا دیجئے میں آپ کو انعام دے دوں گا۔ نوائے وقت کے اوپر تو اشتہارات کا اس طرح سے سخت کنٹرول ہے جیسے جیل کے باہر چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے کہ ادھر سے کوئی اشتہار نکلنے نہ پائے، اس وقت نہ صرف وفاقی حکومت کے اشتہارات بند ہیں بلکہ ...... پرویز الٰہی صاحب نے بھی وفاقی حکومت کے دباؤ میں آ کر پہل کی اس کے باوجود یہ ہمارے دوست ہیں مسلم لیگی حکومت ہے ہمارا مسلم لیگی اخبار ہے، مگر ہمارے اشتہارات بند ہیں مگر میں یہ کہوں گا کہ ایم کیو ایم کی حکومت یا سندھ میں جو بھی حکومت ہے انہوں نے ہمارے اشتہار بند نہیں کئے۔ بلوچستان کی حکومت نے بھی اشتہار بند نہیں کئے، سرحد حکومت نے بھی ایسا نہیں کیا، آزاد کشمیر کی گورنمنٹ بھی ہمیں اشتہارات دے رہی ہے مگر پنجاب میں جو ماشاءاللہ مسلم لیگی وزیر اعلیٰ ہیں ان پر دباؤ ہے تو وہ مجبور ہیں آپ نے پوچھا تھا ہمارا حکومت سے کیا اختلاف ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا اختلاف ہے۔ چودھری شجاعت جب وزیر اعظم تھے تو وہ کہتے تھے کہ میں نے یہ اشتہار بند نہیں کئے۔ مسلم لیگی حکومت سے بات کر کے یہ کھلوائیں۔ جمالی صاحب بھی یہی کہتے تھے سو! کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اپنے دور میں وزرائے اعظم کہتے ہیں کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سندھ کے وزیر اعلیٰ ہیں وہ جب مجھے ملے تو کہنے لگے بھئی آپ یہ معاملہ ٹھیک کریں۔ اشتہار بند کرنے والے تو ایک ہی صاحب ہیں اور وہ صدر صاحب ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں بھی نہیں پتہ کہ نوائے وقت کے اشتہارات کس نے بند کئے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کسی ماورائی قوت نے ہمارے اشتہارات بند کئے ہیں۔

حکومت سے ہمارے اختلاف کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے تو بات یہ ہے کہ نوائے وقت اور نیشن جمہوریت اور جمہوری اداروں کی تقویت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوری

Marfat.com

اداروں کو مضبوط بنانا چاہیے۔ سچی جمہوریت واقعی سچی ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے ایوب خان کے دور میں لوگ کہتے تھے کہ یہ لائل پور کا گھنٹہ گھر ہے۔ آگے سڑک پر چلو تو ایوب خان آ جاتا ہے۔ یہاں بھی اگر ہمارا یہی حال ہو جائے کہ جنرل پرویز مشرف کے بغیر جمہوریت نہ چل سکے پھر جمہوری ادارے تو مضبوط نہیں ہوں گے اسی طرح کشمیر پالیسی ہے اس پر انڈیا کے حوالے سے ہم نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا مگر یہ کوئی نئی چیزیں نہ ہیں۔ اس بارے میں ہم کہتے ہیں کہ جب اعلان لاہور ہوا تو مجید نظامی صاحب واجپائی کے عشائیے میں بھی نہیں گئے اسی طرح کرگل کے مسئلے پر فوج کا جو مؤقف تھا اس کا بھرپور ساتھ دیا مگر بعد میں پتہ چلا کہ شاید وہ صحیح تھا یا غلط تھا اس کا فیصلہ تو تاریخ ہی کرے گی۔ اب آپ پوچھیں گے اختلاف کیا ہے تو اس قسم کی چیزیں اور اخبارات بھی لکھتے ہیں آپ کا اخبار بھی لکھتا ہے مگر ہمارے اخبار سے ان کو اختلاف یہ ہے کہ شاید ہمیں نواز شریف سب کچھ لکھنے کو کہتا ہے تو دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہم بیرونی اشاروں پر ناچتے ہیں سب سے پہلے تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ بیرونی اشارے کیا ہوتے ہیں اگر ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو کیا ہمیں یہ نواز شریف نے کہا ہے یا بےنظیر نے ہمیں کہا ہے۔ یہ تو ہمارا مشن ہے ہم لکھتے رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے ہمارا کوئی معذرت خواہانہ رویہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نواز شریف خود ہم سے شاکی رہتا ہے اور شاکی ہے اور کوئی سماجی تعلقات بھی اس طرح کے نہیں جیسے پہلے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں اب بھی وزیراعظم ہوں جبکہ ہمارا نظریہ یہ تھا کہ جو 17ویں ترمیم ہوئی ہے اس میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر وردی کے اوپر ٹائم ٹیبل لے کر آگے چلنا چاہیے تاکہ جمہوریت کی گاڑی چلے مگر میاں صاحب کو اس پر بھی اختلاف تھا انہوں نے نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی صاحب کے نام ایک خط لکھا جس کا ذکر نظامی صاحب نے شاید آپ سے بھی انٹرویو کے دوران کیا ہوگا لہٰذا اس Sense میں یہ نواز شریف کی جرأت ہے اور نہ کسی اور کی کہ وہ ہمیں بتائے کہ ہمیں کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں لکھنا چاہیے نہ ہی نواز شریف نے کبھی ایسا کیا ہے۔ اب آگے چلیے: شیخ رشید صاحب نے بھی ایک بار فرمایا کہ ”ان کو اشتہاروں کی کیا ضرورت ہے ان کو تو پاؤنڈز اور ڈالرز آتے ہیں“ ہم تو لعنت بھیجتے ہیں ایسے کسی ایک پیسے پر بھی۔ اگر نوائے وقت یا نیشن نے ایک آنہ بھی لیا ہو تو ہم اخبار بند کر دیں گے لیکن اس کے باوجود لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں پیسے کے بغیر کوئی چیز نہیں چلتی وہ غلطی پر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے مخالفین یہ سوچتے ہیں کہ ہم نوائے وقت کے سرکاری اشتہارات کا اتنا بڑا نقصان کیسے برداشت کر رہے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کچھ لوگ اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر کسی صورت بھی تیار نہیں ہوتے۔ اللہ کا فضل ہے اور ان شاء اللہ ہم ان حالات میں بھی اپنے مشن کو آگے لے کر چلتے رہیں گے۔

Marfat.com

س: آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ جب میر شکیل الرحمٰن سے آپ کی بہت چپقلش چلتی تھی مگر اب مشترکہ مفادات ہیں تو تعلقات میں گرمجوشی آ گئی ہے کیا یہ بات درست ہے؟

ج: میں یہ عرض کروں گا کہ جو پہلی صورتحال تھی وہ غیر صحت مندانہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے بول چال کے روادار بھی نہ ہوں لیکن اگر آپ نوائے وقت میں کام کرتے ہیں یا کوئی انصاف میں کام کرتا ہے تو جیسے آپ لوگ جرنلسٹ ہوتے ہی ہیں اسی طرح اخباری مالکان کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ Code of Ethetics ہونا چاہئے اور اس کے مطابق چلنا چاہیے آپ کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ میر شکیل الرحمٰن کے والد میر خلیل الرحمٰن (مرحوم) کی میرے والد حمید نظامی (مرحوم) سے ایک زمانے میں بہت دوستی تھی، جب تک دونوں زندہ رہے یہ دوستی چلتی رہی۔ نظامی صاحب (مرحوم) جب بھی کراچی جاتے تھے تو میر خلیل (مرحوم) کے گھر ٹھہرا کرتے تھے میں بھی ان کے گھر ٹھہرا کرتا تھا ان سے ایک ذاتی پرانا تعلق تو ہے۔ ٹھیک ہے انہوں نے لاہور آ کر اخبار نکالا مگر جب ہم لاہور سے کراچی گئے تو تھوڑے سے اختلافات شروع ہو گئے میں سمجھتا ہوں کہ بعد میں میر خلیل صاحب کو بھی اسکا کریڈٹ جاتا ہے انہوں نے سوچا کہ تھوڑی سی بقائے باہمی ہونی چاہئے مگر Competition اسی طرح کا ہے آپ یقین کریں اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ بہت بنتی ہے میرا نام تو جنگ والے کبھی کبھار چھاپ دیتے ہیں مگر وہ اپنے اخبار میں مجید نظامی صاحب کا نام تک نہیں چھاپتے انہیں جس رواداری کا مظاہرہ اپنے اخبار میں کرنا چاہیے وہ ایسا نہیں کرتے اس کے باوجود ہمارے ہاں جو پالیسی ہے اس کے مطابق ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ چاہے وہ ضیاء شاہد صاحب ہوں یا میر شکیل الرحمٰن صاحب ہوں ان کا اگر کوئی فنکشن ہوتا ہے تو ہم نہ صرف اسے شائع کرتے ہیں بلکہ ہم ان کو کریڈٹ بھی دیتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے میں چھوٹا دل نہیں ہونا چاہیے۔ ان تعلقات میں خرابی اور بہتری کا پس منظر آپ کو بتا رہا ہوں۔ ایک پی این او پی بن گئی ایک اے پی این ایس بن گئی، ایک سی پی این ای بن گئی اور ایک این سی ای پی بن گئی اس کی وجہ سے یہ ہمارے جو بزرگ تھے اس پر خاص طور پر غور وفکر کرتے تھے۔ مثلاً اور رینٹ کے ایس۔ ایچ ہاشمی صاحب (مرحوم) نے بھی کہا کہ یار اس سے پروفیشن کو نقصان پہنچ رہا ہے اس سلسلے کو ختم کریں اس لئے بھی ہم نے اس چیز کو ختم کیا کہ آپس میں لڑائی جھگڑے کی بجائے بقائے باہمی اور رواداری سے معاملات چلائے جائیں۔

س: اس دوران ایڈیٹر کونسل بھی بن گئی؟

ج: یہ ایڈیٹر کونسل کا بھی عجیب قصہ ہے کیا بتاؤں آپ کو۔ اب تو خیر یہ بھی ختم ہو گئی۔ ضیا صاحب نے اچھا ہی کیا۔ اب میر شکیل الرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ ضیا صاحب نے میرے خلاف مقدمے وغیرہ کر دیئے سارا کچھ

Marfat.com

ہوا بقول میر شکیل الرحمٰن کے ان کا قصور یہ تھا کہ الیکشن یوں نہیں ہونا چاہیے اتنے بندوں کو لینا چاہیے یہ ہونا چاہیے وہ ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ بہر حال دیر آید درست آید ہم نے انہیں خوش آمدید کہا اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سب کو اکٹھے مل کر چلنا چاہیے اس میں ضیا شاہد صاحب کا بھی حصہ ہے انہوں نے میری درخواست پر بہت اچھا کیا کہ پروفیشن کی خاطر اس کو ختم کر دیا۔

س: حکومت نے اشتہارات کے سلسلے میں نوائے وقت پر جو سختی کر رکھی ہے تو یہ اے پی این ایس آخر کس مرض کی دوا ہے آپ بطور صدر دوسرے ممبران کو ساتھ ملا کر حکومت سے اپنا جائز حق لینے کے لئے آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟

ج: یہ بات حمید ہارون صاحب نے بھی ایک دفعہ کہی تھی مگر میں نے پہلے بھی عرض کیا ہم ہاتھ نہیں پھیلاتے نہ ہی ہم نے صحافیوں کو کہہ کر جلوس نکلوائے ہیں ہم نے اس معاملے کو ایشو نہیں بنایا بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی سٹینڈ لیا جاتا ہے تو اس قسم کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اے پی این ایس میں بطور صدر ہونے کے مجھے تھوڑا سا Disadvantage یہ ہے کہ میں شد و مد سے یہ بات نہیں کر سکتا۔ بہر حال اے پی این ایس میں کچھ دوست ہیں جو یہ مسئلہ اٹھا رہے ہیں مگر یہ بات تو حکومت کو سوچنی چاہیے۔ دراصل پہلے دو سال تو پریس کے ساتھ حکومت کا بڑا اچھا معاملہ رہا مگر اس حکومت کے جو آخری دو سال ہیں خاص طور پر جب سے شیخ رشید آئے ہیں ان کا رویہ اخبارات کی طرح بڑا جارحانہ ہے انہوں نے خود ہی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلے انہوں نے کہا کہ ہم پریس کونسل بنائیں چنانچہ پریس کونسل بنا دی گئی Code of Ethetics بنا دیا۔ ہم نے انہیں انفارمیشن پر ایک مسودہ دیا پریس قوانین پر ہم نے ان سے تفصیلی مذاکرات کئے، سب پر اتفاق ہو گیا انہوں نے ماسوائے کہ پریس قوائین نافذ کر دیئے باقی جو چیزیں ہیں یعنی انفارمیشن لاء کو انہوں نے ایسا بنایا کہ وہ اخبارات کے لئے بیکار ہیں۔ Deferation لاء آپ دیکھ رہے ہیں یہ جو پریس کونسل ہے اس کا لاء بنا کر اسے تالے میں بند کر دیا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے جمالی صاحب کی کابینہ میں فیصلہ کیا کہ یہ جو اخبارات ہیں ان کے لئے جو سرکاری اشتہارات ہیں ان کو Centerlized کر دیا جائے۔ میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا کہ حکومت کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے ان کو مسترد کر دیا۔ پھر کہا گیا کہ اگرچہ یہ کیبنٹ کا فیصلہ ہے مگر ہم اسے نافذ نہیں کریں گے مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوا یعنی یہ سارے ہتھیار بڑے بھونڈے طریقے سے اخبارات کے خلاف استعمال کئے گئے۔

س: یہ ویج بورڈ کا کیا مسئلہ ہے بطور صدر اے پی این ایس آپ اس اہم مسئلے پر کیا کہنا

Marfat.com

چاہیں گے؟

ج: ویج بورڈ کے مسئلے کے بارے میں ہم شروع ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ یہ ویج بورڈ اخبارات کے لئے ہی کیوں، یہ بینکوں کے لئے کیوں نہیں ہے۔ انڈسٹری یا ٹیکسٹائل کے لئے ویج بورڈ بنائیں۔ آپ نے وہ سب ختم کر دیئے ادھر تو آپ لیبر لاز دیکھتے ہیں مگر آپ اخبارات کو دوہرے تہرے کھاتے میں کیوں جکڑتے ہیں پھر یہ کہ آپ نے جرنلسٹ اور نان جرنلسٹ سب کو ایک ہی سٹیج پر کھڑا کر دیا۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ ہمارے ہاں جو چپڑاسی ہے وہ عام مارکیٹ ریٹ سے تین گنا زیادہ تنخواہ لے رہا ہے۔ شعیب نظامی صاحب میرے بھائی ہیں ان کا مشین مین 10 ہزار لے رہا ہے تو یہاں ہمارے ہاں بیس ہزار لے رہا ہے یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے۔ جرنلسٹ کے لئے تو آپ Special Scale بنادیں۔ میں اس کے لئے بھی تیار ہوں میں شیخ رشید صاحب کو یہ آفر کرتا ہوں کہ وہ جو ویج بورڈ کے چیمپیئن بن کر اپنی دوکان چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ سب سے پہلے لال حویلی کے ملازمین کو ویج بورڈ کے مطابق تنخواہیں دے دیں تو میں بھی تیار ہوں۔

س: نظامی صاحب کیا یہ درست ہے کہ نیشن اور نوائے وقت اپنی پالیسیوں میں آزاد ہیں یہ سوال میں نے اس لئے کیا ایک عام خیال یہ ہے کہ مجید نظامی صاحب اور آپ کے درمیان اخبار کی پالیسی کے حوالے سے بعض معاملات میں اختلاف رائے موجود ہے؟

ج: ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ قطعی غلط بات ہے مجید نظامی صاحب مجھ سے جو کہہ دیں وہ میرے لئے حرف آخر ہوتا ہے۔ میں اس سلسلے میں مزید تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ دراصل یہ جو انگریزی اخبار ہے اس کی بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا سٹائل اردو سے مختلف ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک انڈیا ہے، کشمیر ہے اور جمہوریت ہے وہ ایک ہی پالیسی ہے۔

س: آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ بہت Reserve شخصیت کے مالک ہیں اپنے سٹاف ممبران سے کبھی کھلنے ملنے کی کوشش نہیں کرتے کیا یہ درست ہے؟

ج: ایسی بات نہیں ہے مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرا کوئی پی اے نہیں ہے آپ نے مجھے فون کیا میں نے براہِ راست آپ سے بات کی اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک صحافی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اسے عوامی ہونا چاہیے۔ آپ اگر ایسے اخبارات کے ایڈیٹروں سے ملنے کی کوشش کریں جو مالکان ہیں۔ مثلاً حمید ہارون سے بات کرتے ہوئے تو مجھے کئی دن لگ جاتے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سٹاف کے لئے بھی میرے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ سٹاف سے بے تکلفی بھی ہے مگر ہم سب پروفیشنل لوگ ہیں اس کے مطابق ہی چلنا

Marfat.com

پڑتا ہے مگر بعض اوقات ڈسپلن کا تقاضا ہوتا ہے کہ لائن ڈراپ کرنا پڑتی ہے وہ بہت ضروری ہوتا ہے۔

س: آپ کی فیملی جرنلزم کا سفر آپ تک ختم ہو گیا یا آپ اپنے بچوں کو بھی اس فیلڈ میں لائیں گے؟

ج: میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں اگر مستقبل میں آنا چاہیں گے تو بسم اللہ اگر نہیں آنا چاہیں گے تو میں مجبور نہیں کروں گا۔

س: آپ اپنے بچوں کے باپ تو ہیں کیا دوست بھی ہیں؟

ج: جی ہاں میں بالکل ان کا دوست ہوں۔ رعب اور دبدبے والی کوئی بات نہیں ہے مگر ادب اور احترام کو ضرور ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

س: آپ کے بہت سے چاہنے والے ہیں بہت سوں کے آپ آئیڈیل بھی ہوں گے۔ یہ بتائیں آپ کی آئیڈیل شخصیت کون ہے؟

ج: میں تو قائداعظمؒ کو ہی اپنی آئیڈیل شخصیت سمجھتا ہوں۔ وہ اصول پسند تھے اور جس پاکستان کا نقشہ دیکھا تھا آج کا پاکستان بالکل بھی اس کی تصویر نہیں ہے اور یہ ہماری کوتاہی ہے۔ بہر کیف آئیڈیل ڈیموکریسی اور فیئر پلے کے حوالے سے قائداعظم کی ذات ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی

Marfat.com

Marfat.com

میں نے تو خود عشق کے نتیجہ میں دوسری شادی کی

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

ممتاز دانشور اور اردو ڈائجسٹ کے بانی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کو اگر ''جرنلسٹ میکر'' کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا ان کے ادارے کو شاید اس لئے صحافی ساز ادارہ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے تربیت حاصل کرنے والے آج خود بڑے بڑے صحافتی اداروں کے مالک ہیں۔

اردو ڈائجسٹ فروغ ادب، ملکی سالمیت اور وقار کے تحفظ کیلئے گذشتہ ۴۴ سال سے جو بے لوث خدمات انجام دے رہا ہے اس میں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کے قومی شعور اور ملی جذبے کو غیر معمولی دخل ہے وہ آجکل ''کاروان علم فاؤنڈیشن'' کے پلیٹ فارم سے جس طرح سے ناخواندگی کے تدارک اور فروغ علم کیلئے کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں، اس اعتبار سے انہوں نے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا صحیح حق ادا کردیا ہے، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے ان کی صحافتی خدمات اور نجی زندگی کے حوالے سے ایک تفصیلی نشست ہوئی جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب ہم یہ چاہیں گے کہ وہ ابتدائی ماحول جس میں آپ نے آنکھ کھولی گردوپیش میں جو دیکھا اس حوالے سے آپ کچھ بتائیں گے؟

Marfat.com

ج: ہوش کے جب ابتدائی مراحل سامنے آئے تو گھر میں والد صاحب، والدہ، چار بہنیں اور تین بھائی تھے ایک نیم پختہ گھر تھا جس میں ہاتھ سے پانی نکالنے والا نل لگا ہوا تھا، والد صاحب محکمہ نہر میں پٹواری تھے جب میں نے ابتدائی ہوش سنبھالا تو وہاں کے میونسپل کمیٹی کے پرائمری سکول میں داخلہ لیا، پہلی جماعت وہاں پڑھی وہاں چار ہندو جبکہ ایک مسلمان استاد تھے، دوسری جماعت میں نے مسلمانوں کے ایک سکول سے پاس کی، یہ شیخ اللہ داد کا سکول تھا جو اس علاقے کے مسلمانوں نے بنایا تھا، شیخ اللہ داد ایک بزرگ تھے جن کا شہر سے ذرا باہر مزار تھا اس مزار کے ساتھ ہی پرائمری سکول تھا جس میں دیہی علاقوں کے مسلمان بچے تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے اس سکول سے ذرا آگے ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام خوشی محمد تھا تعلق خاکسار تحریک سے تھا، وہ مسلمانوں کے گھر میں جا کر ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو سکول میں داخل کروائیں، شہر کے مسلمانوں کے بچے عام طور پر نہیں پڑھتے تھے، یہ تو ہے میرا ابتدائی بچپن اس زمانے کا ایک دوسرا بہت بڑا پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک بہت بڑی جامع مسجد تھی اس میں شام کے وقت مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام تھا جہاں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا اور کچھ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا، چنانچہ میرے بڑے بھائی حافظ افروغ حسن صاحب نے قرآن پاک یہیں سے حفظ کیا شام کو ہم سکول سے آ کر مدرسے میں پڑھنے جایا کرتے تھے قاری محمد شفیع صاحب ایک لائق استاد تھے جو ہمیں قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے اللہ انہیں غریق رحمت کرے انہوں نے بہت اچھا قرآن پڑھنا سکھایا۔ یہ صاحب جوانی میں پولیس میں سپاہی تھے اور وہیں دین سے متاثر ہو کر قرآن مجید کا مطالعہ کیا قرآن پاک سیکھا اور پنشن پر جانے کے بعد وہاں کی جامع مسجد میں قرآن پاک پڑھانے کا کام اپنے ذمے لیا اور 1947ء تک وہ وہیں قرآن پاک پڑھاتے رہے، اس دور کا دوسرا اہم شعور یہ تھا کہ جو چند مسلمان اور خوشحال گھرانے تھے وہ وقتاً فوقتاً ختم قرآن مجید کی محفل بپا کیا کرتے تھے جس میں ہم مسجد کے تمام طلباء شریک ہوا کرتے تھے اور مقابلے میں زیادہ سے زیادہ قرآن پاک پڑھنے کی کوشش کیا کرتے تھے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قرآن پاک روانی سے پڑھنا آ گیا ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس مسجد میں جو جمعہ کا خطبہ دیتے تھے وہ صالح محمد صاحب تھے وہ دیوبندی مسلک کے تھے اور ہمارے قاری محمد شفیع صاحب جو امام مسجد تھے وہ بریلوی مسلک کے تھے وہاں ربیع الاول کے مہینے میں محفل میلاد ہوا کرتی تھی بریلوی اور دیوبندی کا کوئی جھگڑا نہیں تھا، وہاں ایک ہی مسجد تھی جہاں ایک ہی جمعہ ہوا کرتا تھا آس پاس کے لوگ بھی اس میں شریک ہوتے تھے اس مسجد کے درمیان کی دیوار اتنی چوڑی تھی کہ اس پر دو صفیں آ سکتی تھی۔

س: آپ کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے خالصتاً دینی ماحول میں آنکھ کھولی میں یہ پوچھنا

Marfat.com

چاہوں گا کہ اخلاقی اقدار کی پاسداری کے اس دور میں آپ کے یا آپ کے ساتھی طالب علموں کے کس طرح کے مشاغل ہوا کرتے تھے۔؟

ج: ہمارے والد صاحب ملازمت کے سلسلہ میں ہم سے دور تنہا رہتے تھے اور صرف میری تعلیم کیلئے انہوں نے پورے گھر کو شہر میں رکھا ہوا تھا، والد صاحب اگر چہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے انہوں نے اپنے زمانے میں اردو کی چھ جماعتیں پڑھی تھی کیونکہ وہ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے، وہ دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کے جو بچے ہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں وہ اکثر کہا کرتے تھے میں چاہتا ہوں کہ میری اولاد میں سے کوئی مولانا ظفر علی خان بنے کیونکہ وہ بھی ایک پٹواری کے بیٹے تھے اور تم بھی ایک پٹواری کے بیٹے ہو جب ہم پڑھا کرتے تھے تو اس قسم کا جوش و جذبہ ہوا کرتا تھا، اتفاق سے جس گورنمنٹ ہائی سکول میں مجھے داخلہ ملا اس میں طلباء کی تعداد مختصر ہوتی تھی مگر اس زمانے میں جو اساتذہ تھے وہ بہت محنت سے پڑھایا کرتے تھے۔

ہمیں اکثر ہندو اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا البتہ جب میں نویں اور دسویں جماعت میں گیا تب کچھ مسلمان اساتذہ بھی ملے، لہٰذا اسکول کا میٹرک تک ماحول بڑا صاف ستھرا تھا وہاں اس قسم کے امکانات ہی نہیں تھے کہ ہم طلباء غلط قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیں ہماری والدہ اس معاملے میں ہم پر بہت گہری نظر رکھتی تھیں چنانچہ ان کی نگاہ ہمارے دوستوں پر بھی تھی اور ان کو معلوم تھا کہ کون کون سے میرے دوست ہیں چونکہ زیادہ تر مسلمان بچے اور آس پاس کے رہنے والے ہوتے تھے اس لئے وہ ان کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھیں، انہوں نے ہم سب گھر کے بچوں کو تاش کھیلنے دیا نہ کیرم بورڈ کھیلنے دیا بلکہ ایک دفعہ کچھ دوستوں کے ساتھ گھر میں گروپ کی شکل میں کیرم بورڈ کھیل رہتے تھے مگر جب والدہ صاحبہ کو آواز آئی تو انہوں نے دروازے میں جھانک کر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے جس پر انہوں نے میرے دوستوں سے سختی سے کہا کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں کیرم بورڈ توڑ دوں گی کیونکہ یہ شیطانی کام سخت ناپسندیدہ ہیں، ان کا یہ کہنا تھا کہ کیرم بورڈ یا شطرنج جیسے کھیل کھیلنے میں ذہن میں آوارگی پیدا ہوتی ہے، وقت ضائع ہوتا ہے اور غلط صحبت میں جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

س: والدہ کی تعلیم کتنی تھی۔؟

ج: والدہ قرآن پڑھی ہوئی تھی اردو پڑھ لیتی تھیں مگر لکھ نہیں سکتی تھیں، قرآن بھی انہوں نے اپنے والد سے پڑھا تھا اس وقت سکول سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا مشغلہ یہ تھا کہ ہم کھیل کے میدان میں جاتے تھے وہاں سے واپس آتے تھے تو مغرب کی اذان ہو جایا کرتی تھی تب مسجد میں نماز پڑھنے چلے جایا کرتے تھے پھر

Marfat.com

واپس آ کر کچھ پڑھ لیا کرتے تھے یا عشاء کی نماز پڑھ کر سو جایا کرتے تھے۔

س: یہ کس زمانے کی بات ہے۔؟

ج غالباً یہ 40ء کے عشرے کی بات ہے۔

س: آپ کی اس وقت عمر کتنی تھی۔؟

ج: اس وقت میری عمر 19 سال تھی۔

س: گویا پاکستان آپ سے خاصا چھوٹا ہے۔؟

ج: جی ہاں بالکل اس وقت میں انیس بیس برس کا تھا۔

س: سکول کے بعد آپ کالج اور یونیورسٹی میں آ گئے کیا اس وقت مخلوط ایجوکیشن تھی؟

ج: بات یہ ہے کہ سکول کے بعد ایک سال مجھے مالی تنگدستی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنا پڑی، میں نے میٹرک میں اس زمانے میں 653 نمبر لئے تھے مگر مالی وسائل کی وجہ سے آگے داخلہ نہ لے سکا، پھر یہ کہ علاقہ میں کوئی کالج بھی نہیں تھا اس لئے پڑھنے کی غرض سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ اس دوران کوشش کی کہ کوئی کاروبار کر لیا جائے چنانچہ بڑے بھائی صاحب کے ساتھ مل کر ایک دکان ڈال لی مگر اس میں نقصان ہو گیا مگر میرے جغرافیہ کے ایک استاد تھے علی گڑھ سے پڑھ کر آئے تھے ان کا نام شہاب الدین خان تھا وہ مجھے اس بات پر اکساتے رہے کہ میں علی گڑھ جاؤں چنانچہ میں ان کی ترغیب پر 1945ء میں علی گڑھ چلا گیا اور وہاں میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا یہ اس ادارے کی بڑی عظمت ہے کہ داخلہ لیتے وقت جو بورڈ بیٹھا ہوا تھا اس نے میرے مالی حالات کا بھی پوچھا اور جب میں نے ان کو بتایا کہ میں سو روپے لے کر آیا ہوں اور اس میں پڑھنے کا ارادہ ہے میرے مزید مالی وسائل نہیں ہیں تو انہوں نے بڑی مہربانی سے میری فیس بھی معاف کر دی اپنی سوسائٹی سے چار ہزار قرض حسنہ بھی دے دیا، کتابوں کا ایک بینک تھا وہاں سے کتابیں بھی مل گئیں اور بیس روپے ماہوار ایک ٹیوشن کا بندوبست بھی کر دیا اور اس کے سہارے میں دو سال یعنی 1947ء تک میں علی گڑھ میں رہا، علی گڑھ میں مخلوط تعلیم نہیں تھی، وہاں طالبات کیلئے علیحدہ گرلز کالج تھا اور بہت پردے کا اہتمام تھا اور کوئی بچی وہاں علی گڑھ کی سڑکوں پر نظر نہیں آتی تھی لہٰذا مخلوط طرز تعلیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

س: موسیقی سے کوئی شوق تھا ؟

ج: مجھے قطعی طور پر موسیقی سے کوئی شوق نہیں رہا۔

Marfat.com

س: فلمیں دیکھتے تھے۔؟

ج: شاید دو ایک مرتبہ کوئی فلم دیکھی ہو مگر شوق نہیں تھا ایک تو ہمارے شہر میں سینما نہیں تھا کبھی کبھار جانا ہوتا تھا تو پیسے بھی نہیں ہوا کرتے تھے اس وقت فلم دیکھنے کیلئے دو آنے کی ضرورت ہوتی تھی مگر اس زمانے وہ بھی نہیں ہوا کرتے تھے تب فلم کو منڈوا کہا جاتا تھا۔

س: زمانہ طالب علمی میں کبھی آپ نے تھری پیس سوٹ پہنا۔؟

ج: اس زمانے میں ہم تھری پیس سوٹ کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے خاص طور پر ایسا صبر وقناعت کا ماحول تھا اسطرف کبھی توجہ ہی نہیں دی ہم تو جوڑی کی جوتی پہنا کرتے تھے میں نے جب میٹرک میں اول پوزیشن لی تو مجھے دس روپے انعام ملے تھے۔ اس دس روپے کی میں نے چمڑے کی جوتی بنوائی اور وہ پہن کر میں علی گڑھ گیا علی گڑھ میں بھی اپنے ماحول کو میں سادا رکھا کرتا تھا، شیروانی پہننے کی اجازت تھی مگر کپڑے کی قلت کے باعث اس سے بھی ہمیں مستثنیٰ قرار دیدیا تھا، زیادہ سے زیادہ پتلون اور شرٹ پہنی جاتی تھی جبکہ سردیوں میں سویٹر پہن لیا جاتا تھا۔

س: آپ نے تحریک پاکستان بھی دیکھی اور پاکستان بنتے بھی دیکھا اس زمانے میں پاکستان کے قیام کے بارے میں جو تصورات تھے کیا آج کا پاکستان دیکھ کر آپ کو دھچکہ سا نہیں لگتا ؟

ج: وہ ہمارا طالب علمی کا ابتدائی دور تھا، دین اور اسلامی ریاست کے بارے ہمارے ذہن میں کوئی واضح تصور نہیں تھا گو کہ میں مولانا مودودی کی کتابیں دسویں جماعت تک بہت زیادہ پڑھ چکا تھا۔ علی گڑھ میں بھی ہمارا گروپ تھا جو مولانا مودودی کی کتابوں اور تحریروں کا مطالعہ کیا کرتا تھا لیکن اس وقت یہی ایک تصور تھا کہ ہمارا ملک آزاد پاکستان بنے گا اور اس میں ہم دین کی باتیں کریں گے ہمارے اس زمانے میں سرگودھا کے ایک ملک صاحب تھے وہ کبھی کبھار مسجد میں جب جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے تو ایک محفل میں لگ جایا کرتی تھی اس محفل میں جب تحریک پاکستان کے بارے میں باتیں ہوتی تھیں تو ملک صاحب کہا کرتے تھے یہ تو ہمارا اور آپ کا جذبہ ہے کہ ایک آزاد اسلامی ملک پاکستان بنے گا مگر میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ جن لوگوں کو حکومت ملے گی اور وہاں جو لوگ ہیں وہ اتنے کم ظرف لوگ ہونگے آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے مظالم کی داستان کیا ہوگی، ہم چونکہ اس وقت طالب علم تھے ہماری سوچ میں اتنی گہرائی نہیں تھی مگر اب آ کر اندازہ ہوا کہ وہ ملک صاحب واقعی صحیح کہتے تھے۔

س: پاکستان نے آپ کو عزت شہرت اور نام ومقام دیا، آپ سے پوچھا جائے کہ جواب میں آپ نے

Marfat.com

اس کو کیا لوٹایا تو آپ کا جواب کیا ہوگا۔؟

ج: آپ نے بالکل صحیح سوال کیا ہے میں تو ہر وقت سجدہ ریز ہوں اور شکر گزار ہوں اپنے رب کا کہ اس کی مہربانی سے اس ملک کیلئے کچھ نہ کچھ کیا اور کچھ نہ کچھ ضرور لوٹایا ہے ہم گزشتہ 44 سال سے اردو ڈائجسٹ کے ذریعے نہ صرف قومی زبان کو فروغ دے رہے ہیں بلکہ پاکستان کی محبت پاکستان کی اہمیت اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اپنی قوم کو اپنی زبان میں بتا رہے ہیں اپنی زبان کی اہمیت کا احساس دلا رہے ہیں جس مقصد کے لئے یہ ملک بنا تھا اسلامی تہذیب کے خدوخال کو واضح کر رہے ہیں اس کے علاوہ اسلام کے مدمقابل جو مغربی تہذیب ہے عیسائی تہذیب ہے اس کے نقصانات کے بارے میں قوم کو بتا رہے ہیں خاص طور پر کیمونزم کا جو ایک بہت بڑا طوفان آ رہا تھا اس کے خلاف ہم سینہ سپر ہوئے ہم نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس کے بارے میں ہم نے اس وقت اس کے خلاف لکھا اور بتایا جب صحافت کی دنیا میں ان کے خلاف کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں غیر اسلامی نظام کو تہس نہس کیا۔

س: ڈاکٹر صاحب ایک مسلم لیگ وہ تھی جس نے پاکستان بنا دیا مگر اس کے بعد مسلم لیگ کے اتنے زیادہ ٹکڑے ہوئے ہیں جنہیں انگلیوں پر نہیں گنا جا سکتا۔ مثلاً مسلم لیگ کنونشن پگاڑہ لیگ (ق) لیگ (ن) لیگ (ض) لیگ وغیرہ...... آپ یہ بتائیں کہ اس وقت صحیح مسلم لیگ کا وارث کون ہے۔؟

ج: میں نے مسلم لیگ کی تحریک میں تو نہیں البتہ پاکستان کی تحریک میں بہت قریب سے مسلم لیگ کی قیادت کو دیکھا ہے سندھ اور پنجاب کی قیادت کو دیکھا ہے اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ پاکستان بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں ٹھیک ہے وہ ایک ذریعہ بنے ہیں انہوں نے ایک ذریعہ بننا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ملک کو بنانا تھا اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے قائداعظمؒ کی شخصیت کو تیار کیا ان کے ذریعے اس ملک کا قیام ممکن ہوا۔ مسلم لیگ کا جو حال آج ہے وہ حال اس وقت بھی تھا، مجھے تو کم از کم اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، جو کردار میں نے 46ء اور 48ء میں سندھ اور پنجاب میں دیکھے ہیں ان کی آل اولاد آج بھی موجود ہے میں آپ کو بتاؤں کہ 45ء میں سندھ کے انتخابات میں ایک انتخابی حلقے میں گیا مسلم لیگ کیطرف سے سید نور احمد شاہ ہمارے امیدوار تھے ان کا بیٹا ابھی بھی سندھ کا وزیر تھا، سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس زمانے کے وہی لوگ تھے جی ایم سید وغیرہ جنہوں نے قائداعظمؒ سے بغاوت کی تھی اب وہی ان کی آل اولاد آگے چل رہی ہے۔

س: چلئے اب ہم ایک اور موضوع کیطرف آتے ہیں آپ کے ادارے کو ایک صحافی ساز ادارہ کہا جاتا ہے یہ بھی ایسا صحافتی ٹکسال ہے جہاں سے صحافت دنیا کے چمکتے کھنکتے سکے وجود میں آئے کیا یہ سب کھرے سکے تھے

Marfat.com

یاان میں سے بھی کچھ کھوٹے سکے سامنے آئے مقصد یہ کہ آپ کے صحافی ساز ادارے سے تربیت حاصل کرنے والوں نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا یا وہ ذاتی مفادات کیلئے ٹریک سے اتر گئے۔؟

ج: ایک حد تک تو میں بہت مطمئن ہوں کہ ہمارے ہاں سے کافی لوگ صحافت کی تربیت حاصل کر کے نکلے ہیں ان میں نظریات کے لحاظ سے کمیونزم کے تقریباً سبھی مخالف تھے اور آخری وقت تک خلاف رہے، انہوں نے کمیونزم کے خلاف اس ملک میں بہت کام کیا، یہ تو خوشی کی بات ہے، باقی مفادات کے معاملے میں تو اس معاشرے میں ہمارے ہاں جو حالات ہیں اس میں اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ذرا مشکل ہی کام تھا، کافی لوگ ہمارے ادارے سے وابستہ رہے ہیں لیکن پھر بھی بہر حال انہوں نے منفی اور مثبت نام پیدا کیا ہے البتہ میں ضرور کہوں گا کہ انہوں نے قلم چلانا سیکھا بات کہنے کا انداز سیکھا اور ماشاء اللہ انہوں نے بڑے بڑے صحافتی ادارے قائم کئے انہوں نے سینکڑوں لوگوں کو روزگار فراہم کیا اور اب وہ اپنے ظرف اور سوچ کے مطابق اپنی راہ پر لگے ہوئے ہیں۔

س: آپ کے کام سے نظر آتا ہے کہ آپ بہت اچھے منتظم ہیں جب آپ کے کسی سٹاف ممبر سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے آپ اسے ڈانٹتے ہیں، درگزر کرتے ہیں یا کسی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کو سامنے پا کر سٹاف خوف زدہ ہوتا ہے یا اسے خوشی کا احساس ہوتا ہے۔؟

ج: ہمارا ادارہ محدود سے سٹاف پر مشتمل ہے اور میں نے اسے فکر اور عمل کی پوری آزادی دے رکھی ہے ہمارے ہاں وہ لوگ بھی تھے جو ذہنی طور پر ہم سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی چلے ہیں اور ہم نے اس وجہ سے انہیں نہیں نکالا کہ وہ ذہنی طور پر ہمارے مخالف ہیں، اگر ہم میں کوئی کمزوری ہے تو انہوں نے ہمارے خلاف بھی لکھا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے اوپر بھٹو دور میں آزمائش کے بہت سے مراحل آئے جب ساتھیوں نے ہمارے خلاف بھٹو صاحب کو ایک عرض داشت پیش کی کہ ہم نے بڑے کنٹریکٹ بنائے ہوئے ہیں اور بڑے فائدے اٹھائے ہوئے ہیں جس پر بھٹو صاحب نے اس معاملے کی تفتیش کیلئے ہمارے پچھلے چھ سالوں کے حسابات کی چھان بین کروائی مگر ہم نے اس کا بھرپور دفاع کیا اور بقول ہمارے ایک آئی ٹی او کے جو ہمارا مقدمہ ہر روز بار بار سنتا تھا ایک دن وہ کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب اگر اتنی تحقیق و تفتیش کسی اخباری فرد کے خلاف بھی ہوتی تو اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا جس پر میں نے کہا بھائی اس نے پھر بھٹو سے پنگا کیوں لیا ہوتا مگر ہمیں اس بات کا ضرور افسوس ہوا کہ ہمارے بعض ساتھی جبکہ آزمائش کے دور میں تھے اور ہم ایک جابر حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے تھے اس وقت انہوں نے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی، مگر میں

Marfat.com

نے انہیں بھی معاف کر دیا، ٹھیک ہے غلطیاں بھی ہوتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے خلاف وہ کوئی ایک بھی الزام ثابت نہ کر سکے اور ہم اس سے باعزت طور پر سرخرو ہو کر نکلے اور جب محکمہ کو ہمارے خلاف کچھ نہ ملا تو ہمیں جیل میں ڈال دیا گیا اور یک طرفہ طور پر ہمارے خلاف فیصلہ کر کے تین لاکھ کی ڈگری جاری کی گئی۔

س: ڈاکٹر صاحب آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ اکثر معاملات پر آپ کو بہت جلد غصہ آ جاتا ہے آخر کس بات پر آپ کو غصہ آتا ہے۔؟

ج: غصہ آتا بھی ہے مگر میں نے ایک بات اپنے ذہن میں رکھی ہوئی ہے کہ میں نے اپنے آپ کو بحیثیت ایک معلم رکھنا ہے، کیونکہ میں سکول ٹیچر اور یونیورسٹی کا استاد بھی ہوں، میرے ذہن میں ہمیشہ یہ بات بھی ہوتی ہے کہ یہ کام مجھے بھی نہیں آتا تھا لہٰذا مجھے اپنے سٹاف کو بھی یہ کام بتانا اور سکھانا چاہئے۔

س: آپ اپنے ادارے کے تو بہت اچھے ایڈمنسٹریٹر ہیں کیا گھر پر بھی اچھے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔؟

ج: جی ہاں میں بالکل ہوں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور آپ سن کر خوش ہوں گے کہ میر۔ دو خاندان ہیں میری دو بیگمات ہیں اور ماشاء اللہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کثرت اولاد سے نوازا ہے میرے بارہ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں کا یہ معاملہ ہے کہ کوئی بیٹا سگریٹ تک نہیں پیتا اور پاکستان سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ سوائے ایک بیٹے یاسر کے جو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر گیا باقی میرا کوئی بیٹا باہر جانے کیلئے تیار نہیں ہوا، ان کو بڑے مواقع ملے اس غرض سے ان کو شادیوں کی پیشکش بھی ہوئی مگر کوئی بھی ملک سے باہر جانے کو تیار نہیں ہوا حالانکہ میں نے تعلیمی اعتبار سے انہیں زیادہ ناز و نعم سے نہیں پالا، میں نے انہیں بہت ٹف تربیت اور ماحول سے گزارا ہے تاکہ انہیں احساس رہے کہ وہ ایک امیر باپ کے بیٹے نہیں ہیں، میں نے انہیں کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں امیر ہوں یا وہ امیر باپ کے بیٹے ہیں میں نے اولاد کو ایک سادہ زندگی دی ہے سادہ ماحول میں اس کی پرورش کی ہے انہیں عام سکول میں تعلیم دلائی ہے کسی کو میں کیتھڈرل میں نہیں بھجوایا جس پر انہیں بھی فخر ہے اور مجھے بھی فخر ہے انہیں کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ وہ بہت اونچے سکولوں میں نہیں پڑھے۔

س: آپ اپنے بچوں کے باپ ہیں یا ان سے دوستی کا ماحول بھی ہے۔؟

ج: میں ان کا دوست بھی ہوں۔

س: جب آپ طالب علم تھے تب آپ کی سوچ کیا تھی کہ آپ ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے یا جو کچھ بن چکے ہیں یہی آپ کا خواب اور عزم تھا اور آپ قلم کے مزدور ہی بننا چاہتے تھے۔؟

ج: بات یہ ہے کہ جس کلاس اور ماحول سے ہم نکل کر آئے ہیں وہاں یہ چیزیں اہمیت نہیں رکھتیں نہ اس

Marfat.com

دور میں والدین کیلئے اور نہ طالب علموں کیلئے یہ تو پاکستان بننے کے بہت بعد کی بات ہے اس وقت صرف رزق حلال اور قناعت پسندی کا تصور تھا جب میں علی گڑھ گیا تو انہوں نے اس لحاظ سے مجھے ایف ایس سی میں داخلہ دیا تاکہ سائنس پڑھ سکیں کیونکہ سائنس کی بہت ڈیمانڈ تھی مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں ڈاکٹر اور انجینئر بننا چاہتا تھا یہ جو بھی ہمارا نظام ہے میں قدرتی طور پر سوچتا ہوں کہ یہ میرے رب کی طرف سے ایک نظام تھا میرا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا میں نے کسی کام میں کوئی منصوبہ بندی کی اور نہ پیش بندی کی۔ میرے رب نے ہی مجھے علی گڑھ بھیج دیا میرے رب کے فضل سے ہی اتفاق سے پاکستان بنا تو ہم لاہور آ گئے اور میرا رب ہی واپس مجھے تعلیم کی طرف لے آیا میں آپ کو ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں میں یہاں محکمہ صحت میں ملازم تھا جہاں آج کل پرانی انارکلی ہے، میں رحمٰن پورہ میں رہتا تھا اور سائیکل پر آتا جاتا تھا جبکہ الطاف اس زمانے میں مرالہ میں تھا ایک روز الطاف لاہور آئے اور مجھے کہنے لگے بھائی یہ 17 روپے لے لو اور میرا یہ ادیب فاضل کا فارم ہے یہ کسی سے تصدیق کروا کر یونیورسٹی میں جمع کروا دو۔ الطاف تو مجھے فارم دے کر چلے گئے اور میں رحمٰن پورہ سے سائیکل پر چلا آ رہا ہوں پھر جب میں جین مندر کے پاس پہنچا تو میرے خیال میں آیا کہ یار تو کیوں نہیں ادیب فاضل کر سکتا، چنانچہ میں دفتر میں آیا اور بڑے بھائی سے کہا، بھائی مجھے سترہ روپے دے دو، انہوں نے کہا کیا کرو گے میں نے کہا ''ادیب فاضل میں داخلہ لوں گا، وہ کہنے لگے یار الطاف! تو اس سلسلے میں بڑی تیاری کر رہا ہے مگر تمہیں کیا فائدہ ہوگا، بہرکیف انہوں نے 17 روپے دے دیئے میں فوراً فارم لے کر آیا اور اس کی تصدیق کروا کر دونوں فارم اکٹھے ہی جمع کروا دیئے، ہم دونوں نے آگے پیچھے بیٹھ کر امتحان دیا اور میرے ان سے چار نمبر زیادہ تھے، مزے کی بات یہ ہے کہ جس دن میں نے داخلہ جمع کروایا اسی دن سے میں نے پڑھنا شروع کیا پھر جب ادیب فاضل کا نتیجہ نکلا تو وہ آخری تاریخ تھی ایف ایس سی سپلیمنٹری فارم جمع کروانے کی' میں نے اگلے دن داخلہ لے لیا۔ الطاف مرالہ میں تھا وہ ایسا نہ کر سکا اور مجھ سے ایک سال پیچھے رہ گیا میں نے پہلے ایف اے اور پھر بی اے کر لیا اور ایم اے کا داخلہ لے لیا، ایم اے کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرتا، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، ایک اور عجیب واقعہ آپ کو سناتا چلوں کہ میں حافظ آباد میں ان ٹرینڈ ٹیچر تھا اور سکول میں ہیڈ ماسٹر لگا ہوا تھا، میں ایک دن تعلیمی معاملات پر گفتگو کر رہا تھا اس وقت ایک ماسٹر عزیز صاحب تھے وہ کہنے لگے ''اعجاز صاحب آپ تو ان ٹرینڈ آدمی ہیں آپ کو کیا معلوم کہ پڑھانا کیا ہوتا ہے، اس کی بات سن کر مجھے بہت محسوس ہوا اور میں نے اس دن فیصلہ کیا اب ٹیچنگ کرنی ہے تو ٹرینڈ ہو کر کرنی ہے پھر جب میں حافظ آباد سے لاہور آیا تو اخبار میں بی ٹی کے داخلے کا اشتہار آیا ہوا تھا میں نے

Marfat.com

درخواست دے دی اور داخلہ لے لیا، بی ٹی کے ساتھ ہی میں نے ایم اے ہسٹری کیا اور ابھی ایم اے ہسٹری کا نتیجہ نہیں نکلا تھا مجھے میرے استاد نے جرمنی کے وظیفے کی جو پیشکش آئی ہوئی تھی وہ میرے گھر پہنچائی، انہوں نے دو طالب علموں کیلئے وظیفہ بھجوایا تھا، دوسرا طالب علم نہیں گیا مگر میں جرمن جا کر پی ایچ ڈی کر آیا، مجھے ایک سال تک جو وظیفہ ملا تھا وہ بڑھتا بڑھتا تین سال تک چلا گیا، اب یہ جو کچھ بھی ہے وہ بلاشبہ اللہ کی طرف سے ہے، اسی طرح ہم نے اردو ڈائجسٹ نکالا اس کا بھی کوئی خیال نہیں تھا، ہمارے ایک ساتھی عبداللہ ہوا کرتے تھے جو ہمارے استاد محترم ملک نصراللہ خان کے صاحبزادے ہیں جب ایوب خان کا 1958ء میں مارشل لاء لگا تو تسنیم بند ہو گیا۔ 1958ء میں ہی یورپ سے واپس آیا تو یہ صاحب 1960ء میں میرے پاس آئے پرچہ بند ہو گیا، اس زمانے میں رانا نذر الرحمٰن ہوا کرتے تھے ان سے مشورہ کیا اور ڈائجسٹ کی طرز پر اردو ڈائجسٹ نکالنے کا فیصلہ کیا اور چند ہزار بلکہ چند سو روپے سے کام شروع کر دیا، اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوئے اور ہمارا کیریئر بن گیا لہٰذا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوا، اب ہم نے جو ''کاروانِ علم فاؤنڈیشن'' شروع کی ہے، اسے بھی آپ اتفاق کہہ لیجئے، اخبار میں ایک خبر چھپی کہ میٹرک میں 810 نمبر لینے والی جو بچی ہے اس کو کنیئرڈ کالج میں اس لئے داخلہ نہیں مل رہا کیونکہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں، یہ خبر پڑھ کر مجھے اچانک خیال آیا کہ بھئی غلامی کے دور میں جب ہم پڑھا کرتے تھے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہوا کرتے تھے اور بہت نمبر لئے تھے اس وقت تو آزادی نہیں تھی مگر آج تو آزادی ہے چنانچہ میں نے گھو آ کر الطاف سے بات کی کہ بچے جو اتنے زیادہ نمبر لیتے ہیں ان کی عزت افزائی کی جائے، انہوں نے کہا بالکل ٹھیک ہے اس وقت میں دفتر آیا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا میرا دل چاہتا ہے کہ ہم یہ نیک کام کریں اور اس سلسلے میں کوئی پروگرام مرتب کریں، انہوں نے کہا بالکل ٹھیک ہے حالانکہ اس دوران میں گر گیا اور میرا فریکچر ہو گیا، بہرحال اس کے باوجود ہم نے اس پروگرام کو حتمی شکل دے دی اور اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی اور آج یہ پورے ملک میں ایک تحریک بن گئی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے کہ میں بڑا کچھ ہوں اور میں نے بڑا تیر مارا ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔

س: آپ نے انٹرویو کے شروع میں بتایا تھا کہ گھر کا ماحول بڑا سخت تھا والدہ کیرم بورڈ تک نہیں کھیلنے دیا کرتی تھیں مگر جب آپ باپ بن گئے تو آپ نے اپنے بچوں کے ذاتی مشاغل اور غیر نصابی سرگرمیوں میں مداخلت کی یا حالات اور وقت کے مطابق انہیں پوری آزادی دی ؟

ج: اس میں دو بنیادی باتیں ہیں، ایک تو رزق حلال اور ایک رزق حرام ہوتا ہے جس کا اثر خود بخود اولاد میں آ جاتا ہے، بحیثیت انسان مجھ میں بھی بڑی کمزوریاں رہی ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے کوشش یہ کی ہے

Marfat.com

کہ میری اولاد غلط راہ پر نہ چل نکلے لوگ تو عام طور پر اپنی بیٹیوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر میں نے اپنے بیٹوں کی حفاظت کی ہے، ہم نے کوشش یہی کی ہے کہ اولاد کو رزق حلال دیں۔

س: آپ کے ماشاءاللہ 12 بیٹے ہیں ظاہر ہے آپ کی تربیت ہے اور وہ سبھی اچھے ہوں گے مگر کوئی ایسا بیٹا جس پر آپ کی زیادہ توجہ رہی ہو۔؟

ج: ہر بندے میں صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً میری خواہش تھی کہ میرا ایک بیٹا ڈاکٹر ہو وہ خود بخود ہی ہو گیا میں بڑا مطمئن ہوں، باقی بچوں کے بارے میں کبھی میں نے نہیں سوچا کہ یہ کوئی بہت بڑی چیز بن جائیں نہ میں نے کبھی اس کی خواہش کی، البتہ میں نے یہی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے قدموں پر کھڑا کر دے، البتہ میں نے ان کے لئے سرکاری ملازمت نہیں چاہی اس وقت میرا کوئی بیٹا سرکاری ملازم نہیں ہے، اور وہ اپنا اپنا رزق حلال کما رہے ہیں وہ جہاں اور جس شعبے میں بھی ہیں انہوں نے نام پیدا کیا ہے میرے ایک بیٹے نے خود سبزیوں اور پھلوں کی ایکسپورٹ سے آغاز کیا تھا ماشاءاللہ اب وہ ٹرافی ہولڈر ہے اس فیلڈ میں ان کی ایک ساکھ ہے انہیں مسلسل آٹھ سال ہو گئے ہیں، اسی طرح دوسرے بیٹے بھی ایکسپورٹ کا کام کر رہے ہیں ان کی بھی ایک ساکھ ہے انہوں نے بھی نام پیدا کیا ہے میں تو ہمیشہ اپنے بیٹوں کو یہ سمجھاتا ہوں کہ آپ کو ملک کی خدمت کرنا ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب اس بات سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ عشق و محبت دو فطری جذبے ہیں چاہے وہ کسی بھی معنوں میں ہو، جوانی کے عالم میں آپ کبھی جذبہ عشق سے آشنا ہوئے؟

ج: میں آپ کو ایک کام کی بات بتاؤں کہ دنیا میں جتنی بھی باصلاحیت غیر معمولی چیلنج قبول کرنے والی شخصیات تھیں انہوں نے ضرور عشق کیا اور عشق وہی شخص کر سکتا ہے جو میڈیا کا نہ ہو جو میں نے مطالعہ کیا ہے اور جو سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے میڈیا کا نام اس لئے لیا کیونکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو عام لوگوں میں پیدا نہیں ہوتا، میں نے تو خود عشق کے نتیجہ میں دوسری شادی کی اور میں سمجھتا ہوں یہ عجیب بات ہے کہ عشق جس شخصیت سے ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عجیب phenomina ہے جہاں جسمانی ریز جا کر ملتی ہیں اس کے بغیر عشق نہیں ہوتا۔

س: آپ نے عشق کے نتیجہ میں دوسری شادی کی کیا اس سے معاملہ کچھ گڑبڑ نہیں ہوا۔؟

ج: چھوٹی موٹی پیچیدگیاں ضرور ہوتی ہیں کیونکہ ہم لوگ ذہنی لحاظ سے ہندو تہذیب کے اثرات تلے دبے ہوئے ہیں مگر میں نے کوشش کی دوسری شادی کے ساتھ ساتھ پہلی شادی کو بھی نبھاؤں اور میں نے دونوں

Marfat.com

بیویوں کی اولادوں کو اچھی تعلیم دلوائی ان کو کاروبار لگا کر ان کا مستقبل سنوارا۔

س: اگر آپ کا کوئی بیٹا کہے کہ پاپا میں نے لڑکی پسند کرلی ہے اور میں نے اپنی پسند کی شادی کرنی ہے تو کیا آپ اسے اس کی اجازت دیدیں گے یا اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے۔؟

ج: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میں تو کہوں گا کہ بھئی میری تو مشکل آسان ہوگئی ہے (قہقہہ) اگر میں نے بارہ بیٹوں کیلئے دلہنوں کی تلاش میں نکلوں گا میرے لئے تو مشکل ہو جائے گی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ بچیاں شریف ہوں۔

س: کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو۔؟

ج: اللہ کا شکر ہے اس نے مجھ پر بڑی کرم نوازی کی ہے اس لئے اب میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ جہاں تک دولت اکٹھی کرنے کی ہوس ہے تو وہ کبھی مجھ میں تھی ہی نہیں، میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہوتا صرف اتنی سی خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس ملک کے غریب عوام کی خدمت کرنے کا موقع دے اب میں ایک اور پروگرام شروع کر رہا ہوں تعلیم بڑھاؤ غربت مٹاؤ۔

س: آپ کے بہت سے چاہنے والے اور پرستار ہیں آپ کی آئیڈیل شخصیت کون ہوسکتی ہے ؟

ج: سوائے سرکار دوعالم حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے میری کوئی آئیڈیل شخصیت نہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

علی سفیان آفاقی

Marfat.com

Marfat.com

فلم کی طرح صحافت میں بھی دو نمبر مافیا کا غلبہ ہے

علی سفیان آفاقی

اگر صحافتی دنیا میں کسی کو ''آل راؤنڈر'' کا خطاب یا ایوارڈ دینے کے لئے بزرگ صحافیوں کی کوئی جیوری بٹھائی جائے تو یقیناً اس جیوری کا فیصلہ علی سفیان آفاقی کے حق میں ہوگا، جنہوں نے ایک ہی وقت میں ادب، فلم اور صحافت کی دنیا میں اپنا ایک ایسا مقام بنایا ہے جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا، جہاں تک علی سفیان آفاقی کی فلمی خدمات کا تعلق ہے تو جس قدر اچھی فلمیں لکھنے اور پروڈیوس کرنے پر انہیں ایوارڈز سے نوازا گیا، اس حوالے سے آج بھی وہ شوبز پر ایک اتھارٹی تصور کئے جاتے ہیں، علی سفیان آفاقی کو ان کی فلمی خدمات پر بطور فلمساز، ہدایت کار، مصنف، مکالمہ نگار 9 ایوارڈز، 7 گریجویٹ ایوارڈز اور ایک کریٹکس ایوارڈ مل چکا ہے۔ آفاقی صاحب کی ادبی خدمات کا پلڑا فلمی خدمات سے بھی بھاری ہے، آپ کی قابل ذکر تصانیف میں کنندیں (طنز و مزاح کا مجموعہ)، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (امیر جماعت اسلامی کی پہلی سوانح)، سیاسی باتیں، سیاسی لوگ ،اس کے علاوہ سفرناموں کی 11 کتابیں بھی رقم کیں جن میں دیکھ لیا امریکہ، ذرا سا انگلستان، طلسمات فرنگ، نیل کنارے اور پیرس کی گلیاں قابل ذکر ہیں، زیر طبع سفرناموں میں فلمی الف لیلہ (خود نوشت) سفرنامہ ایران اور سفرنامہ سپین شامل ہیں۔

Marfat.com

آپ نے صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1951ء میں جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار "تسنیم" لاہور سے کیا، اس اخبار کی بندش کے بعد ہفت روزہ چٹان اور پھر 1953ء میں روزنامہ نوائے وقت سے وابستہ ہوئے، اس کے بعد آفاق سے وابستگی رہی، آفاق سے فلمی صفحے کی اشاعت کی روایت بھی آپ نے قائم کی، آفاق کے دوسرے دور میں جو سعید سہگل کی زیرادارت نکلا، اس میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ ہوئے، اس کے بعد م۔ش کے ہفت روزہ "اقوام" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے، اس دوران جب "روزنامہ زمیندار" کی بندش ہوئی تو آپ مولانا اختر علی خان کے صاحبزادے منصور علی خان کے زیراہتمام "روزنامہ آثار" میں بطور جوائنٹ ایڈیٹر وابستہ ہوئے۔ مختلف اخبارات میں ادارتی ذمہ داریاں نبھانے کے علاوہ آپ نے آفاق، نوائے وقت، امروز اور احسان میں "دام خیال" اور "دریچے" کے عنوان سے کالم نگاری بھی کی۔ پاکستان ٹائمز، امروز، احسان کے علاوہ نہ صرف لاہور اور کراچی بلکہ بھارت سے شائع ہونے والے پرچوں میں بھی مضمون نویسی کی۔ 1985ء تا 1990ء لاہور کے معروف ادبی جریدے سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر رہے، جبکہ گذشتہ 16 برس سے روزنامہ نوائے وقت کے فیملی میگزین کے ایڈیٹر کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مذکورہ بالا صحافتی پس منظر اور فلمی خدمات کی روشنی میں علی سفیان آفاقی سے جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

س: آفاقی صاحب آپ کی شخصیت کے بے شمار حوالے اور بہت سے پہلو ہیں، فلم، ادب، صحافت کا بھی حوالہ ہے۔ آپ نے دوپہر کا اخبار "نوروز" جاری کیا، اس کے علاوہ ایک خوبصورت ڈائجسٹ ہوشربا بھی نکالا۔ اگر اسلام کے حوالے سے آپ کی خدمات دیکھیں تو وہ بھی پڑھنے والے کو چونکا دیتی ہیں۔ آپ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت پر ایک کتاب بھی لکھی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اگر فلمی خدمات دیکھیں تو بحیثیت فلمی رائٹر آپ نے فلم بیٹوں کو ایاز، کنیز، آبرو اور آس جیسی یادگار فلمیں دیں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنی شخصیت کے کس حوالے پر ناز ہے؟

ج: میں آپ کو اس بات کا جواب تو نہیں دے سکتا کہ میری شخصیت کا کون سا حوالہ مضبوط ہے مگر بات صرف یہ ہے کہ میں نے جو بھی کام کیا بڑے شوق سے کیا، اب وہ کام میری شناخت بنے یا نہ بنے یہ الگ بات ہے مگر میں نے ہر کام اسی شوق سے کیا جس طرح کہ کرنا چاہیے تھا۔ بنیادی طور پر تو میں صحافی ہوں، آغاز میں نے ایک صحافی کے طور پر کیا تھا۔ اس کے بعد میں روزنامہ سعادت کے علاوہ دیگر اخبارات میں بھی کام کرتا رہا۔

Marfat.com

میں نے زیادہ تر آفاق میں کام کیا، کالم بھی لکھتا رہا، کراچی کے پرچوں میں بھی بہت زیادہ لکھا، پھر 1959ء میں جب ایوب خان کا مارشل لا لگا تو اس کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اخبارات کے لئے حالات مشکل ہو گئے ہیں۔ پولیس اور آرمی والے آجایا کرتے تھے۔ انہیں کسی کے مقام اور مرتبے کا پتہ نہیں تھا وہ ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے تھے، چنانچہ میں نے جب اس طرح کے واقعات دیکھے اور اسی دوران سنسر بھی لگ گیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحافت فی الحال ایسا شعبہ نہیں رہا کہ جس سے وابستہ رہا جا سکے۔ اسی دوران جب میں صحافی تھا تو مجھے فلموں کا بھی شوق تھا۔ مجھے بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا، اس کے بعد جب ذرا شعور آیا تو میں نے زیادہ غور سے فلمیں دیکھنا شروع کیں، میں نے اس بارے میں کتابیں بھی پڑھیں کہ فلم کیسے بنتی ہے اور اس میں کیا کچھ ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں ہالی ووڈ سے بہت اچھی اچھی فلمیں آیا کرتی تھیں، چنانچہ انہیں دیکھ کر بھی ہمیں خاصی معلومات ملتی تھیں کہ ان کے بنانے میں کیا کیا تکنیکس استعمال کی گئیں اور ڈائریکٹر نے اسے کیسے بنایا۔ آپ کو شاید علم ہوگا کہ ڈیلی صحافت میں سب سے پہلے فلم کا صفحہ میں نے ہی رائج کیا تھا، اس سے پہلی ڈیلی اخبارات میں کبھی ایک آدھ فلم سے متعلق سطر بھی مشکل سے ہی شائع ہوا کرتی تھی یعنی اس دور میں فلمی خبریں چھاپنے کا رواج تھا اور نہ ہی لوگوں کا مزاج تھا، فلمی تصاویر بھی کم کم شائع ہوا کرتی تھیں، چنانچہ میں نے روزنامہ آفاق میں باقاعدہ فلم کا صفحہ شروع کیا، جب فلم کا صفحہ شروع کیا تو اس بہانے میرا فلم والوں سے واسطہ پڑا لوگ میرے پاس بھی آتے تھے، پھر اس بارے میں مجھے پتہ چلا کہ یہ تو ایک الگ ہی دنیا ہے۔ اگر اس میں اچھے لوگ آئیں تو یہاں اچھا کام ہو سکتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ فلم کے شعبے میں میری دلچسپی بڑھی، یہاں میرے کچھ ہم خیال دوست بھی بن گئے۔ فارغ اوقات میں نے ان کے ساتھ گزارنے شروع کر دیئے کیونکہ ابھی میری شادی تو ہوئی نہیں تھی۔ اس زمانے کے جن پروڈیوسروں، ہدایتکاروں سے میری دوستی ہوئی، وہ آخری وقت تک ویسی ہی رہی۔ ہر کسی کے کام آنا یا کسی کو فائدہ پہنچا کر خوشی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ایک دوست تھے ہدایت کار لقمان صاحب، جب ان کی فلم بنتی تھی تو میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا وہ ڈائریکشن وغیرہ میں ہم سے مشورے بھی لیا کرتے تھے۔ آخر ایک روز لقمان صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لکھتے کیوں نہیں۔ ہماری فلم کے لئے کوئی کہانی یا سکرین پلے لکھیں۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں چار پانچ رائیٹرز ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی لکھا کرتا تھا جبکہ باقی اس پر Discussions کیا کرتے تھے۔ یعنی کہانی کا آئیڈیا تو یہ پانچوں افراد دیتے تھے مگر جب فائنل ہو جاتا تھا تو لکھتا ایک ہی آدمی تھا مگر اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ پردہ سکرین پر مختلف لوگوں کے نام

Marfat.com

آجایا کرتے تھے۔ مثلاً مصنف کون ہے اور ڈائیلاگ کس نے لکھے ہیں۔ اس طرح جب فلم ایاز بنی تو اس کے مکالمے میرزا ادیب نے لکھے ہوئے تھے۔ ان کی ایک تو اس دوران طبیعت خراب ہوگئی دوسرا انہوں نے جب دیکھا کہ یہ سب تکا ہے تو انہوں نے اس کام میں دلچسپی بھی نہ لی کیونکہ فلم ایک تخلیق نہیں ہوتی بلکہ اس میں آپ کو بہت سی چیزیں دوسری کی پسند کی ڈالنا ہوتی ہیں، جبکہ ایک عام افسانہ نگار اپنی مرضی سے لکھنے کا عادی ہوتا ہے، میرزا ادیب کو شاید اس طرح کی پابندیاں ناگوار گزری تھیں چنانچہ لقمان صاحب نے مجھے کہا کہ آپ فلم ایاز کے مکالمے لکھیں، ظہور حسین ڈار اس موقع پر موجود تھے، میں بھی تھا اس کے علاوہ ایک اور صاحب تھے۔ چنانچہ ایاز فلم کے مکالمے ہم نے لکھ دیئے اس طرح فلم ایاز کے مکالمہ نگار کے طور پر میرا نام آ گیا۔ اس کے بعد ہدایت کار لقمان صاحب نے دوسری فلم ''آدمی'' بنائی۔ اس کے سکرین پلے، ڈائیلاگ بھی لکھے، اس دوران میں میں نے سوچا کہ اب اخبارات میں تو کچھ رہا نہیں سنسر کی پابندیاں وغیرہ ہیں ویسے بھی شوق فلم کا تھا، لکھنا بھی آتا تھا یوں اخبار میں نے مکمل چھوڑ دیا اور اپنے فلم کے دوستوں کی تجویز پر باقاعدہ فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوگیا مگر اس کے باوجود صحافی دوستوں سے ملتا رہا اور اخبارات میں مضامین بھی لکھتا رہا یعنی کسی نہ کسی طرح اخباری دنیا سے بھی وابستہ رہا۔ مگر فلم ایسا شعبہ ہے کہ جس میں آپ کو مکمل وقت دینا پڑتا ہے۔ یہ پارٹ ٹائم جاب نہیں ہے بہرکیف اس کے بعد کئی فلموں کے سکرپٹس لکھے پھر کہانی کی طرف آ گیا، یوں جب میں مسلمہ کہانی نویس بن گیا تو میں نے محسوس کیا کہ کہانی لکھنے میں کچھ پابندیاں ہیں یعنی جو لکھنے والا چاہتا ہے وہ لکھ نہیں سکتا۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کی طرف سے اسے بہت سی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ ان حالات میں اچھا ہے کہ آدمی اپنی فلم بنائے لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کے لئے میں نے اپنی ذاتی فلم بنائی، رائیٹر تو میں پہلے ہی تھا سارا تجربہ میرے ساتھ تھا چنانچہ بطور پروڈیوسر میں نے اپنی فلم بنائی جبکہ اس کے ڈائریکٹر حسن طارق تھے، اس فلم کا نام کنیز تھا۔ فلم جب کامیاب ہوئی تو ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی اور بعد میں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔

آپ نے سوال کیا تھا کہ فلمیں لکھنے والے شخص نے مولانا مودودیؒ پر کتاب کیسے لکھ دی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا اسلامی گھرانہ ہے۔ ہمارے گھر کا ماحول خاصا مذہبی تھا، بچپن میں ہی اسلامی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ ابھی میں آٹھویں جماعت میں تھا تو میں نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبی ﷺ ساری پڑھ ڈالی تھی، جب میں نے صحافت میں قدم رکھا تو روزنامہ ''تسنیم'' سے صحافت کی ابتداء کی، یہ رسالہ جماعت اسلامی کا آفیشل آرگن تھا۔ چنانچہ میں اس ماحول سے بڑا متاثر ہوا، وہیں مولانا مودودیؒ سے میری ملاقات ہوئی، انہیں دیکھنے اور پھر ان سے ملنے کا متعدد مرتبہ شرف حاصل ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ ان کا انٹرویو بھی لیا تھا، ان کے گھر پر

Marfat.com

جانے کا اتفاق ہوا وہ بہت شفقت کیا کرتے تھے، اگرچہ اس کے بعد میں جب صحافت چھوڑ کر فلم میں آ گیا مگر اس کے باوجود جب بھی ان کے پاس جاتا تھا مجھ پر بہت اعتماد کیا کرتے تھے۔ مولانا مودودی پر لکھی میری کتاب 1953ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس کتاب میں یہ لکھا تھا کہ میں نے کیا دیکھا؟ یہ لوگ صاحب کردار تو بہت ہیں مگر ان لوگوں میں انتہا پسندی بہت زیادہ ہے۔ اس میں ایک طبقہ ایسا ہے جو بہت زیادہ شدت پسند ہے، اپنی دانست میں ان لوگوں کا میں نے جائزہ بھی لیا، جہاں تک مولانا مودودی کی کتاب کا تعلق ہے تو میں نے چونکہ دیانتداری سے تنقید کی تھی اس لئے کسی نے اس کا برا نہ منایا، اس کے بعد جب کتاب کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن چھپا تو اس میں نعیم صدیقی صاحب نے بھی اس کام کو سراہا اور کہا کہ ایک ایسا آدمی آیا جس نے پوری دیانتداری سے کام کیا، اتفاق یہ ہے کہ کتاب میں مولانا مودودی کے بارے میں جو باتیں میں نے لکھی تھیں بعد میں درست ثابت ہو گئیں، صحافت کے زمانے میں تو مولانا مودودی سے اس قسم کے انٹرویوز ہوتے رہتے تھے مگر جب روزنامہ ''تسنیم'' بند ہو گیا تو یہی پرچہ ''قاصد'' کے نام سے نکلا مگر بعد میں جب وہ بھی بند ہو گیا تو ہم لوگ بیکار ہو گئے۔ قاصد کے بعد میری اگلی منزل ''چٹان'' تھی، جب چٹان میں گیا تب مجھے ویکلی جرنلزم سے آگاہی ہوئی۔ آغا شورش کاشمیری جیسے نابغہ روزگار شخص کے ساتھ کام کرنا میرے لئے ایک اعزاز تھا، رفتہ رفتہ تو انہوں نے اپنے مخصوص کالم کے علاوہ سارا کام ہی مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ چٹان میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے ویکلی میگزین کا پتہ چلا۔ اسی طرح میاں شفیع صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے وہ بہت سکھانے والے تھے انہوں نے ایک پرچہ ''اقدام'' نکالا تھا ممتاز احمد خان بھی اس میں تھے، میاں شفیع نے مجھے کہا کہ آفاقی! تم اس کے ایڈیٹر بن جاؤ، میں نے کہا ''شفیع صاحب! یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔'' اس وقت میں بہت کم عمر اور نوجوان سا تھا مگر میاں شفیع کہنے لگے کہ اس کام کا عمر سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ تمہارا تجربہ اچھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے چلا لو گے۔ مجھے یاد ہے کہ ایبٹ آباد کے قریب ان کا ایک پریس ہوا کرتا تھا وہیں پر ''اقدام'' کا دفتر تھا، میں نے وہاں کام شروع کر دیا۔ اس دوران کراچی اور لاہور کے پرچوں میں بھی کام کیا بلکہ پاکستان ٹائمز اور امروز میں بھی کالم وغیرہ لکھے۔

س: آپ نے صحافت میں قدم رکھا اور فلم سے ہوتے ہوئے دوبارہ صحافت میں آ گئے یہ کیا کہانی ہے؟

ج: میں جب فلم میں تھا تو مجھے شوق ہوا کہ میں ایک ڈائجسٹ نکالوں، میرا کہنا یہ تھا کہ جب کراچی سے ڈائجسٹ نکلتے ہیں تو لاہور سے ایک اچھا ڈائجسٹ کیوں نہیں نکل سکتا، چنانچہ پھر میں نے ''ہوشربا ڈائجسٹ'' نکالا۔ ندیم صاحب! قابل ذکر بات یہ ہے کہ میں نے جتنے بھی کام کئے کسی دوسرے کے سرمائے سے نہیں کئے

Marfat.com

خود پیسہ جمع کر کے یہ سب کچھ کیا، بہر حال وہ تجربہ بڑا کامیاب رہا مگر پھر کاغذ کی پابندی لگ گئی جس وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ ہمارے پاس کاغذ کا لائسنس نہیں تھا، اس دوران مجھے انگلینڈ جانا پڑا، انگلینڈ سے واپس آیا تو ایڈورٹائزنگ کے شعبہ میں چلا گیا۔ مڈاس والے ہمارے دوست غلام اکبر ہیں انہوں نے مجھے کام کی پیشکش کی میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں، انہوں نے کہا جب اس فیلڈ میں آئیں گے تو تجربہ بھی ہو جائے گا، آدمی کو صرف لکھنے کا ہنر آنا چاہیے باقی کام خود بخود ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں سیارہ ڈائجسٹ کی ادارت مجھے مل گئی، مگر بعد میں غلام اکبر مجھے پھر ''مڈاس'' لے گئے۔ بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مجھے فلم میں کام آئیں، پریشانی صرف یہ ہوتی تھی کہ ایڈورٹائزنگ کی فیلڈ میں کلائنٹ اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط ہو مگر ان کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ ان کی بات مانی جائے، انہیں قائل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح فلم کے بھی اپنے ضابطے ہوتے ہیں، پھر جب میری شادی ہو گئی تو بیگم بچوں کے ساتھ بیرون ملک جاتا رہا، اس طرح صحافت سے میں سیاحت کی طرف آ گیا اور بہت سے سفرنامے لکھے۔

س: آپ نے شام کا اخبار بھی تو نکالا تھا ''نوروز'' اس کا کیا بنا؟

ج: جس زمانے میں ''مڈاس'' سے وابستہ تھا، اس زمانے میں مجھے شوق ہوا کہ شام کا ڈیلی اخبار بھی نکالا جائے۔ وہ اخبار میں نے اور میرے بھانجے نے مل کر نکالا جو انگلینڈ میں رہتا ہے۔ تھوڑا بہت پیسہ جمع کیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں پیسے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی تھی مگر مجھے تجربہ تھا، اس لئے شام کا ڈیلی اخبار ''نوروز'' نکالا۔ یہ تجربہ بھی بڑا کامیاب رہا مگر میں نے دیکھا کہ ہمیں ہاکرز نہیں ملتے تھے۔

س: نوروز کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ اس میں 75 فیصد فلمی میٹریل ہوتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات اس کی لیڈ بھی فلم سے متعلق ہوا کرتی تھی؟

ج: یہ بات نہیں تھی۔ وہ بہت اچھا پرچہ تھا، اس میں ہم تازہ ترین خبریں دیا کرتے تھے جیسے آج کل شام کے اخبارات ہوتے ہیں، وہ بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ اس میں 11 بجے تک موصول ہونے والی Latest خبریں دیا کرتے تھے۔ مگر جیسا میں نے کہا ہمیں ہاکرز نہیں ملتے تھے۔ میرا اپنا خیال تھا کہ اس کی سرکولیشن کم از کم 50 ہزار ہونی چاہیے۔ ہم نے ہاکرز کو تنخواہوں اور کمیشن کا لالچ بھی دیا مگر وہ کہتے تھے کہ ہمیں شام کا اخبار بیچتے ہوئے شرم آتی ہے لاہوریوں کا مزاج نہیں ہے۔ لہٰذا ان حالات میں ''نوروز'' بھی میں نے بند کر دیا، اس زمانے میں ''جنگ'' کراچی میں کالم لکھا کرتا تھا، اسی دوران مجید نظامی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ وہ ہفت روزہ پرچہ نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ بتائیں ان دنوں کیا کر رہے ہیں، میں نے کہا ''نظامی صاحب! میں جو بھی

Marfat.com

کررہا ہوں، وہ میں چھوڑ دوں گا۔" نظامی صاحب نے کہا کہ میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ لاہور سے ایک اچھا ہفت روزہ نکلے۔تب 1990ء سے میں بطور ایڈیٹر فیملی میگزین کام کررہا ہوں۔

س: آپ کے بارے میں دو باتیں کہی جاتی ہیں، پہلی یہ کہ آپ کے پاس جو بھی صحافت کا طالب علم یا آپ کا کوئی کارکن آتا ہے آپ ضروری کام چھوڑ کر اسے صحافت کے بارے میں بتانے لگتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ بہت سخت گیر ایڈیٹر ہیں، آپ کی ٹیم کے کارکن ہر وقت سہمے سہمے رہتے ہیں ،بقول شاعران کا آپ کے بارے میں یہ کہنا ہے:

جو غضب میں آئے تو قہر ہے
جو ہو مہرباں تو قرار ہے

آپ اس بات کی کیا وضاحت کریں گے۔

ج: ایسی باتیں عموماً وہ کہتے ہیں جو نئے آتے ہیں مگر جو لوگ کچھ عرصہ تک میرے ساتھ کام کر لیتے ہیں وہ مجھ سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی میں انہیں ڈراتا ہوں بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کے ذاتی معاملات میں بھی دلچسپی لیتا ہوں۔ رفتہ رفتہ انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں میں جو ڈانٹتا ہوں وہ بلا جواز نہیں تھا۔ایک زمانے میں میرا بہت شارٹ ٹمپر تھا مجھے جلدی غصہ آجاتا تھا۔ نئے نئے لوگ ہوتے تھے، جب بار بار سمجھانے پر وہ نہیں سمجھتے تھے تو غصہ آجایا کرتا تھا یا انہیں ڈانٹ دیا کرتا تھا مگر یہ بھی میرے بارے میں شروع شروع میں تصور تھا اب نہیں ہے۔اب تک میرے ساتھ بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے، ان میں سے کچھ بڑے بڑے افسر بن گئے۔

س: آپ صحافتی میدان کے ایک مانے ہوئے شہسوار ہیں، جیسا میں نے خود شروع میں کہا آپ کی شخصیت کا ہر حوالہ بڑا مضبوط و توانا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے والدین جو آپ کو بنانا چاہتے تھے، آپ نے ویسا ہی بن کر دکھایا یا محض اتفاقات نے آپ کو اس مقام پر لا کھڑا کیا۔

ج: بات یہ ہے کہ میرے والدین تو مجھے کچھ اور ہی بنانا چاہتے تھے، انہوں نے مجھ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں کیا بنوں مگر کم از کم وہ مجھے صحافی نہیں بنانا چاہتے تھے کیونکہ میں جس زمانے میں صحافی بنا، اس زمانے میں صحافت کا حال بہت خراب تھا، ہمارے خاندان میں بھی اگرچہ کچھ لوگ صحافت میں رہے تھے۔میرے جو بڑے ماموں تھے سید ہاشم فرید آبادی صاحب وہ اچھے صحافی تھے مگر اس زمانے میں واقعی صحافیوں کو تنخواہیں نہیں ملا کرتی تھیں۔ایسے ہی شوقیہ اور فرمائشی قسم کے پرچے چھپتے رہتے تھے۔مگر مجھے صحافت کا بچپن سے ہی شوق تھا، اسی لئے صحافت کے تاریک مستقبل کے باوجود میں اس طرف آیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہماری فیملی کے تمام لوگ ایک جگہ

Marfat.com

پر رہتے تھے۔ یہ عمارت محل کہلاتی تھی، اس میں ہماری فیملی کے کئی خاندان آباد تھے۔ میں نے وہاں سے روزنامہ ''چغل خور'' نکالا، اس میں سارے گھروں کی لڑائیاں، جھگڑے اور تنازع چھاپ دیا کرتا تھا، جسے سب فیملی والے پسند کرتے تھے۔ دراصل صحافت کا مجھے جنون کی حد تک شوق تھا۔ میں نے فلم، صحافت اور ایڈورٹائزنگ کے شعبوں میں اس لئے کام کیا کہ ہر شعبے کا اپنا ایک مزہ ہے۔

س: آپ ادیب بھی ہیں آپ کی بعض کہانیاں اور سفرنامے آپ کی صحافت پر حاوی نظر آتے ہیں، آپ نے اپنے اندر کے ادیب کو مکمل طور پر لکھنے کی آزادی کیوں نہیں دی؟

ج: جیسا میں نے کہا کہ ادب، صحافت اور فلم یہ سب بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہیں، اس وقت تک کوئی شخص صحافی، کہانی نویس یا ڈائریکٹر نہیں بن سکتا جب تک اس کے پاس علم نہ ہو۔ میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ سات سال کی عمر میں میں نے پہلی کہانی لکھی تھی، اپنی عمر کے حساب سے میں نے ادب کی مختلف اصناف کے مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ لہٰذا میری اصل بنیاد تو ادب ہی ہے اگر میرا ادب سے تعلق نہ ہوتا تو صحافت اور فلم میں مجھے کوئی ٹھہرنے نہ دیتا۔

س: آپ نے فلم کو اس لئے خیر آباد کہہ دیا تھا کہ اس کا تخلیق یا فن سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسی طرح آج کا جو جرنلزم ہے جس میں کرپشن کے علاوہ دیگر کافی برائیاں موجود ہیں، جس میں اچھی خبر سے زیادہ اشتہار حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہے تو کیا آپ کے خیال میں فلم کی طرح صحافت میں بھی اسی طرح کا دو نمبر مافیا نہیں آ گیا ؟

ج: آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری ہر چیز میں ہر شعبے میں زوال آیا ہے، انحطاط آیا ہے۔ آپ صرف صحافت کے شعبہ کی بات نہ کریں، بدقسمتی سے جرنلزم کا شعبہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ حالانکہ صحافت تو ریاست کا چوتھا ستون کہلاتا ہے، ہم جس زمانے میں صحافت میں آئے تب ہم لوگوں کا کوئی اور مشن اور مقصد تھا۔ اب چونکہ کمرشلزم ہو گیا ہے، اس لئے پیسے کمانا مقصد ہو گیا ہے۔ مالک کی یہ سوچ ہے کہ کس طرح سے پیسے کمائے جائیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اب بھی خاص نظریئے کے تحت کام کر رہے ہیں کیونکہ مسائل کے لئے وسائل پیدا کرنا بھی ضروری ہے مگر جو عام صحافی ہے اس کا معیار بہت گر گیا ہے۔ وہ پڑھتا ہے نہ وہ لکھتا ہے اس کے پاس خاص علم بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ صحافت میں بہت زیادہ گراوٹ آ گئی ہے۔

س: اس کا مطلب ہے نوجوان صحافیوں کی موجودہ لاٹ سے ہم یہ توقع نہ کریں کہ ان میں سے کوئی حمید نظامی، عنایت اللہ، میر خلیل الرحمٰن اور آغا شورش کاشمیری سامنے آئے گا؟

ج: میں نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ زندگی کے ہر شعبے میں زوال آیا ہے اگرچہ صحافت میں

Marfat.com

نہیں آنا چاہیئے تھا مگر اس میں بھی آ گیا۔ آج کا صحافی اپنے فرض سے غافل ہے۔

س: آپ کی پیشہ ورانہ زندگی کا جو ٹارگٹ تھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کو حاصل ہو چکا ہے، یا اب بھی آپ کی سوچ ہے کہ اگر مزید موقع ملے گا تو فلاں کام بھی آپ کر لیں گے یا کوئی چینل وغیرہ شروع کرنے کا ارادہ ہے ؟

ج: چینل وغیرہ کھولنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا اور نہ مجھے زیادہ پیسے کمانے کی کوئی خواہش ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عزت کے ساتھ جو مل جاتا ہے میرے لئے وہی کافی ہے۔ میں نے جس شعبے میں بھی کام کیا اس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا۔

مجھے جو کچھ بھی ملا وہ میری قسمت میں تھا، میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت زیادہ اپنی رحمت سے نوازا زبردستی کچھ حاصل کرنے کی میں نے کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ کیونکہ میں بہت قناعت پسند شخص ہوں۔

س: آپ کے اتنے چاہنے والے اور پرستار ہیں، آپ کا آئیڈیل کون ہے صرف ایک نام لیں؟

ج: میرا آئیڈیل کبھی کوئی نہیں رہا، مختلف شعبوں میں بے شمار لوگ ہیں جو آئیڈیل ہیں میں ان کا معتقد بھی ہوں۔ جن لوگوں کے ساتھ میں نے کام کیا یا جن کو میں نے پڑھا، ان سب سے میں متاثر ہوا لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ آئیڈیل کے طور پر کسی ایک شخصیت کا نام لوں تو ایسا میرا کوئی آئیڈیل نہیں۔ تاہم اگر آپ انفرادی طور پر پوچھیں تو سیاست میں قائداعظم میرے آئیڈیل تھے، اسی طرح شاعری میں علامہ اقبال میرے آئیڈیل ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا۔ شاید یہ قدرتی طور پر ایسا ہے کہ میں کسی کو اپنا آئیڈیل نہیں بنا سکا، البتہ ان شخصیات سے متاثر ضرور ہوا ہوں مگر کبھی کسی کے لئے دیوانہ نہیں ہوا۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

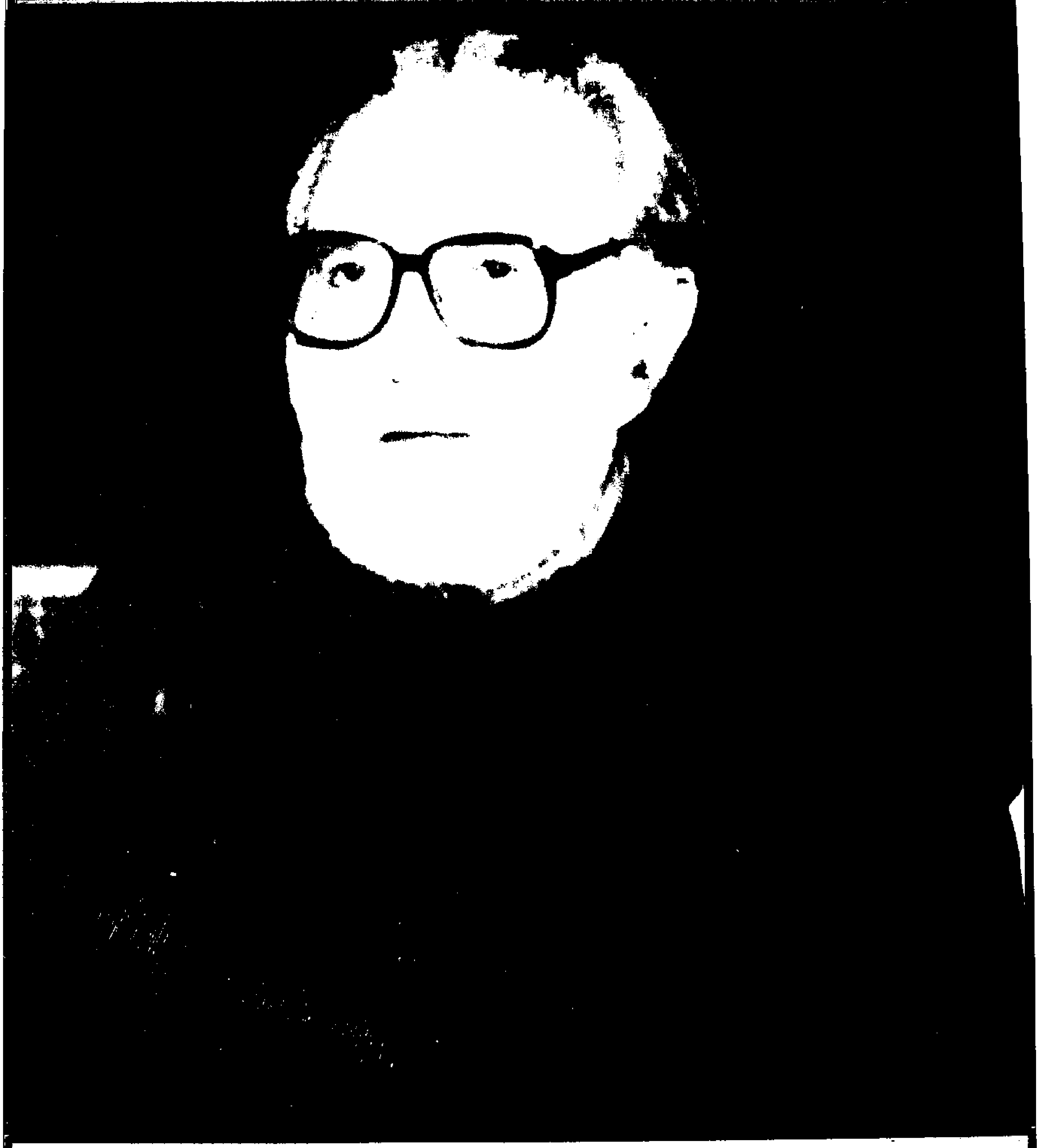

Marfat.com

Marfat.com

خاکروب اس ملک کا سب سے بڑا خادم ہے

اشفاق احمد

اشفاق احمد کی موت کو میں اردو ادب کی موت کہوں، اسے اکیسویں صدی کے آخری دانشور کی موت کا نام دوں، اسے ''تلقین شاہ'' کا سفر آخرت کہوں' ڈرامے کی دنیا کا اختتام کہوں یا ان کی موت کو علم و ادب کی دنیا کے ایک عہد کا خاتمہ قرار دوں، ان کی شخصیت کا ہر حوالہ اور ان کی ذات کا ہر پہلو اس قدر مضبوط اور مکمل ہے کہ ان کی کسی ایک صفت کو دوسرے پر حاوی نہیں کیا جا سکتا۔ اشفاق احمد جنہیں بہر حال میں ایک عظیم انسان کہوں گا کیونکہ میرے نزدیک ان کی ذات کا یہی ایک حوالہ سب سے مضبوط اور خوبصورت ہے، اگر وہ عظیم انسان نہ ہوتے تو ان کی موت پر ملک کے لاکھوں ادب نواز ہم وطنوں کی آنکھیں اشکبار نہ ہوتیں، دنیائے ادب کی کوئی ایسی آنکھ نہیں تھی جو اشفاق احمد کی رحلت پر نم نہ ہوئی ہو، وہ کون سا دل ہے جو ''تلقین شاہ'' کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے پر اشکبار نہ ہوا ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ اشفاق احمد کی رحلت سے اگلے روز تمام قومی اخبارات نے جو کچھ لکھا ممکن ہے لکھنے والوں کی دانست میں وہ بہت زیادہ ہو مگر میرے نزدیک وہ بہت کم ہے۔ ہمارے ہاں ایک روایت رہی ہے کہ جب بھی دنیائے ادب کی کوئی عہد ساز شخصیت اس دنیا سے اٹھتی ہے، بہت سے اخبارات و رسائل اگلے ہی روز

Marfat.com

اس کے انٹرویو شائع کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مرحوم شخصیت کا آخری انٹرویو ہے جسے وہ چھاپنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں یا لکھا جاتا ہے کہ مرحوم کے یہ آخری الفاظ ہیں جوانہوں نے بستر مرگ پر ان کے اخبار یا جریدے کے لئے کہے تھے۔اشفاق احمد کے ساتھ بھی یہی ہوا جس دن ان کی آنکھ بند ہوئی، اس سے اگلی صبح کچھ اخبارات نے اپنی رنگین اشاعت میں ان کے آخری انٹرویوز شائع کئے، حالانکہ اشفاق احمد گذشتہ چار ماہ سے کسی کو بھی انٹرویو دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے تقریباً اتنے ہی عرصہ پہلے راقم نے اپنے اخبار کے لئے علم وادب واور سیاست کی نامور شخصیات کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ان شخصیات کی لسٹ میں اشفاق احمد کا نام بھی سرفہرست تھا۔

یہ اشفاق احمد کی موت سے تقریباً چار ماہ پہلے کی بات ہے، راقم نے جب ٹیلی فون پر اشفاق احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو بانو آپا نے کہا ''بیٹا خان صاحب کی طبیعت ناساز ضرور ہے مگر ایسی تشویش کی کوئی بات نہیں، ڈاکٹر نے انہیں بولنے سے منع کر رکھا ہے ذرا طبیعت سنبھلے گی تو وہ آپ کے اخبار کے لئے ضرور وقت نکالیں گے۔ان دنوں اخبارات میں اشفاق احمد کی علالت کے بارے میں اکا دکا خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اشفاق احمد کو پہلے فون کے بعد دوسرا فون تقریباً پندرہ روز بعد کیا، فون پھر بانو آپا نے اٹھایا اور انہوں نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔''بیٹا ڈاکٹر نے خان صاحب کو سخت آرام کی ہدایت فرمائی ہے، بولنے سے بھی منع کر رکھا ہے آپ بس دعا کریں۔''

جب بانو آپا نے دوسری مرتبہ بھی خان صاحب کی صحت اور زندگی کے بارے میں دعا کرنے کے لئے کہا، تب میری چھٹی حس نے خبردار کر دیا کہ شاید دنیائے ادب کا یہ برگد اپنے سائے سے جدا ہونے والا ہے۔ میں نے بانو آپا سے بڑے اصرار کے ساتھ درخواست بلکہ التجا کی کہ راقم خان صاحب سے انٹرویو کے لئے نہیں آنا چاہتا بلکہ انہیں صرف پھول پیش کرنا چاہتا ہے۔میری یہ درخواست کارگر ثابت ہوئی اور بانو آپا نے مجھے اگلے روز آنے کا کہہ دیا، کیونکہ راقم اس سے پہلے بھی ادبی جریدے سیارہ ڈائجسٹ اور ماضی میں خبریں وصحافت کے لئے اشفاق صاحب کے تفصیلی انٹرویوز کر چکا تھا۔

تھوڑے سے پرانے تعلق واسطے نے کام دکھایا اور خان صاحب نے مجھے دیکھتے ہی تکیے سے ٹیک لگائے مخصوص انداز میں کہا ''اُپل! کیا حال ہے تمہارا''

''جی اللہ کا کرم ہے'' میں نے کہا، میں تو صرف آپ کی خیریت دریافت کرنے حاضر ہوا تھا۔ان دنوں خان صاحب کی طبیعت ناساز ضرور تھی، نحیف بھی کافی ہو چکے تھے مگر بات چیت ٹھہر ٹھہر کر بہرحال کر سکتے

Marfat.com

تھے۔ میرے ساتھ فوٹو گرافر بھی تھا مگر بانو آپا نے مجھے خان صاحب کی تصویر بنانے سے منع کر دیا اور دھیرے سے کہا ''آپ کچھ باتیں کر لیں خان صاحب کی تصویر نہ بنائیں، جب صحت یاب ہو جائیں تو یہ کام پھر کر لیجئے گا بانو آپا کے حکم کے احترام میں میں نے اپنے ساتھ آئے فوٹو گرافر کو کیمرے کی آنکھ بند رکھنے کی ہدایت کی، اشفاق صاحب سے پہلا سوال جب ان کی تیزی سے بگڑتی صحت کے بارے میں پوچھا تو قدرے ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگے ''میں بالکل ٹھیک ہوں، بس تھوڑی سی نقاہت ہے، تم سناؤ ''انصاف کیسا چل رہا ہے''

''جی بالکل ٹھیک جا رہا ہے'' میں نے کہا جس پر اشفاق احمد نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ''چلئے اچھی بات ہے نا انصافی کے اس دور میں آپ کو اس ملک میں ''انصاف نظر آتا ہے؟''

''خان صاحب آپ کو اس کیفیت میں اپنے دوست تو بہت یاد آتے ہوں گے؟'' میں نے تیمارداری کے ضابطے میں رہتے ہوئے رسمی سا سوال کیا جس پر وہ ٹیبل پر رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بولے ''ہر عہد کے لوگ میرے دوست رہے ہیں، دوستی کی کوئی عمر نہیں ہوتی، داستان سرائے میں رونقیں لگانے والے ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین اور ابن انشاء بھی میرے دوست تھے، یہ پچھلی صدی کے میرے دوست تھے اگر اس صدی کی آپ بات کرتے ہیں تو ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' میں آنے والے اور میری باتیں سننے والے بھی تو میرے نوجوان دوست ہی ہیں، اُپلی! میں تو خوش نصیب ہوں کہ ہر عہد میں دوستوں میں گھرا رہا ہوں۔''

''ممتاز مفتی سے آپ کی بڑی یاری تھی'' میں نے کہا

'' ہاں وہ علی پور کا ایلی حقیقت میں خود ہی تھا مگر جب اس نے یہ کردار لکھا تب وہ تسلیم نہیں کرتا تھا شاید اس لئے کہ جوانی میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا اچھا نہیں لگتا مگر جب ممتاز مفتی بوڑھا ہوا تب اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ علی پور کا ایلی وہ خود تھا اور اس نے اپنے ہی کردار پر یہ کتاب لکھی تھی، بڑا پیارا دوست تھا، ایک بار جب میں اٹلی میں تھا تو وہ مجھے ملا اور کہنے لگا کہ یہاں کس جگہ رہتے ہو، میں نے پنجابی میں کہا مفتی صاحب! گوالیاں دے محلے وچ رہناواں'' جس پر وہ میرے تھری پیس سوٹ کی طرف اشارہ کر کے پنجابی زبان میں ہی مخاطب ہوا ''یار اشفاق جدوں اسی انگریزی کپڑے پاکے پنجابی بولنے آں تے انج لگدا اے جیویں اسی جھوٹ پئے بولدے آں''

''خان صاحب ہم آجکل ان شخصیات کے انٹرویوز چھاپ رہے ہیں جو پاکستان کی ہم عمر یا ہم عصر تھیں، ان سے ہم یہی سوال کرتے ہیں کہ جس پاکستان کا خواب انہوں نے آزادی سے پہلے دیکھا تھا، کیا واقعی

Marfat.com

یہ وہی پاکستان ہے اور کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ آپ تو اس اعتبار سے پاکستان کے بڑے بھائی ہیں کیونکہ یہ آپ کی بھرپور جوانی میں معرض وجود میں آیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا واقعی آج کل ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں؟

میرے اس سوال پر خان صاحب کافی دیر خاموش رہے، ان کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت تکلیف دہ سوال کر دیا ہے، قریب کھڑی بانو آپا کے چہرے کے تاثرات بھی یہی بتا رہے تھے کہ میں تیمارداری کے چکر میں خان صاحب کا انٹرویو ختم کروں، مگر خان صاحب کچھ بولنا چاہ رہے تھے۔ میں بھی کاغذ پنسل تھامے ہمہ تن گوش تھا بالآخر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگے...... "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے آزادی کی صورت میں پایا کم مگر کھویا زیادہ ہے، کیونکہ ہم نے آزادی کے وقت 14 کروڑ عوام سے زیادہ اپنے لئے سوچا تھا۔ یہاں مولوی اسلام کی بات کرتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کا مطلب بولنا نہیں بلکہ عمل کرنا ہے مگر پچھلی نصف صدی کے دوران صرف بولا گیا ہے مگر عمل نہیں کیا گیا، اس لئے میرے نزدیک اس قوم کے شاندار مستقبل کی توقع کم ہے۔ اب تو اللہ ہی ایسا رخ دکھائے اور ہمارے حال پر مہربانی فرمائے۔ جہاں تک آزادی کے سانسوں کا تعلق ہے تو میرے خیال میں آجکل ہم آزادی کے ڈھکوسلے لے رہے ہیں۔"

خان صاحب یہ غالباً 1987ء کی بات ہے، جب میں نے اور علی سفیان آفاقی نے سیارہ ڈائجسٹ کے لئے آپ کا انٹرویو کیا تھا، آفاقی صاحب کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا تھا کہ جو مولوی داڑھی رکھ کر انگریزی بولتا ہے وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس وقت کے حالات کے مطابق تو شاید آپ کا کہنا درست ہو مگر آج کل تو داڑھی رکھنے والا تقریباً ہر شخص ہی انگریزی بول لیتا ہے مگر ہم اسے خطرناک تو نہیں کہہ سکتے؟

میرے اس سوال کے جواب میں خان صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا "جب میں نے یہ بات کہی تھی اس وقت ملکی حالات شائد اتنے خطرناک نہیں تھے مگر آج جبکہ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہر داڑھی رکھنے والا انگریزی بول لیتا ہے مگر آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ حالات اس قدر خطرناک ہو چکے ہیں کہ کوئی گھر کی چار دیواری کے اندر بھی محفوظ نہیں جب اللہ سے دوری اور حکمرانوں سے قربت ہوگی، حالات تو پھر ایسے ہی ہوں گے میں تو اکثر "زاویہ" میں نوجوانوں سے یہی کہتا ہوں کہ اگر کچھ پانا چاہتے ہیں تو اللہ کے نزدیک ہو جائیں۔"

"خان صاحب ! اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے، انسانی خواہشات کا گھوڑا تو بے لگام ہوتا ہے، آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو؟" مجھے ان کی طبیعت کو پیش نظر ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا مگر پھر بھی میں نے ہمت کر لی جس پر خان صاحب یوں گویا ہوئے۔

Marfat.com

''جب آدمی خواہشات کا اظہار کرنے لگے تو سمجھو کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہے، کیونکہ خواہشیں عموماً انسان کی زندگی میں پوری نہیں ہوتیں، یہ تو لفظ ہی نامناسب ہے، ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا عزم اور ارادہ کیا ہے۔ واصف علی واصفؒ فرمایا کرتے تھے یقین، استقامت اور عمل جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں وہ کبھی اپنے لئے خواہش کا لفظ استعمال نہیں کرتا کیونکہ جس کے پاس یقین، عمل اور استقامت ہے، دنیا کی ہر چیز خود اس کے پاس چل کر آ جاتی ہے پھر خواہش کیسی؟

آپ نے واصف علی واصف کا ذکر فرمایا، آپ بھی ان کی محفلوں میں بہت جایا کرتے تھے، یہ غالباً 1965ء کی بات ہے، واصف علی واصف کا نابھہ روڈ لاہور پر ایک ''لاہور انگلش کالج'' ہوا کرتا تھا۔ جس کے وہ پرنسپل بھی تھے، اس زمانے میں وہ انتہائی ماڈرن تھے، سفاری سوٹ اور انگریزی لباس پہنا کرتے تھے، انگریزی بھی خوب بولتے تھے، تب کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے وقت کے مشہور صوفی بزرگ قرار پائیں گے، ان کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً تیرہ برس ہو چکے ہیں ہر سال باقاعدہ ان کے مزار پر عرس بھی ہوتا ہے، ڈھول بجتا ہے اور ملنگ دھمال بھی ڈالتے ہیں، میں نے اتنا تفصیلی سوال اس لئے کیا کہ آپ انہیں اپنا مرشد کہا کرتے تھے، مجھے موقع نہیں مل سکا کہ واصف علی واصف کی زندگی میں ان سے سوال کرتا۔ مگر آپ سے آپ کی ذات کے بارے میں تو یقیناً سوال کیا جا سکتا ہے کہ صوفی ازم کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟

ج: اُپل صاحب ! آپ مجھ سے زیادہ شاید اس لئے بول رہے ہیں کہ میں صحت کے اعتبار سے زیادہ نہیں بول سکتا، مگر آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میرے حصے کا بھی بول رہے ہیں، آپ نے واصف علی واصفؒ کی بات کی۔ میں واقعی ان کی شخصیت اور علم و فضل سے بڑا متاثر ہوں، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوفی ضرور تھے مگر مولوی نہیں تھے، ان کے پاس علم کا سمندر تھا، مگر وہ علامہ نہیں کہلواتے تھے، وہ صوفیانہ رنگ میں بھی بوشرٹ پتلون اور تھری پیس سوٹ پہنا کرتے تھے۔ گاڑی بھی خود ہی ڈرائیو کیا کرتے تھے، انہوں نے دین کی، نیکی اور ہدایت کی بات کرنے کے لئے مذہب کی دوکان سجائی نہ مولویوں جیسا روپ اختیار کیا، اسی لئے میں انہیں اپنا مرشد مانتا ہوں۔ میں نے بھی ان کی لائین پر چلنے کی تھوڑی سی کوشش تو ضرور کی، تب ہی اچھی باتوں کی تلقین کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا، یہ جب سے ہے جب میں نے پروگرام ''تلقین شاہ'' کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور ہدایت اللہ (نذیر حسین) کو نیکی کی علامت کے طور پر پیش کیا، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ واصف علی واصف بہت بڑے صوفی بزرگ تھے، جب تک صحت ٹھیک تھی میں ان کے عرس پر بھی جایا کرتا تھا۔

'' آپ زاویہ میں جو کچھ کہتے ہیں کیا آپ کے خیال میں نوجوانوں یا سننے والوں پر اس کا اثر بھی ہوتا

Marfat.com

ہے؟ میں نے پوچھا

اشفاق صاحب کہنے لگے...... " زاویہ کا مقصد یہ تھا کہ اس میں وعظ نہ ہو، کتابی باتیں اور لیکچر نہ ہو، یہ تو میری زندگی کے تجربات اور مشاہدات تھے جو میں دوسروں تک پہنچاتا رہا تا کہ میری کسی بات سے وہ اپنے لئے اصلاح کا پہلو نکال سکیں۔ اس پروگرام میں شریک نوجوان جب مجھ سے سوال کیا کرتے تھے تب میں محسوس کرتا تھا کہ وہ خلوص نیت سے نیکی اور بھلائی کی راہ اپنانا چاہتے ہیں مگر ان کے اندر کی بات کوئی نہیں سنتا، وہ کسی سے کھل کر اپنے دل کا احوال نہیں کہہ سکتے، گھر میں وہ والدین کا لیکچر سنتے ہیں جبکہ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں استاد کا لیکچر سنتے ہیں مگر ان کی کوئی نہیں سنتا جبکہ "زاویہ" پروگرام اس لئے تھا کہ نوجوانوں کے دل کی بات سنی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوانوں کو لیکچر یا وعظ کا سیرپ پلا کر ان کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

" آپ کے خیال میں معاشرے کا کون سا کردار قوم کی سب سے زیادہ خدمت کر رہا ہے؟" یہ میرا سوال تھا۔

" خدمت کا لفظ بہت چھوٹا مگر اس کے پیچھے عمل بہت بڑا ہے۔" اشفاق احمد رک رک کر کہنے لگے

...... " پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آج کے دور میں کوئی بھی ایسا مخدوم نہیں جس کی خدمات بے لوث ہوں اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ اس قوم کی سب سے زیادہ خدمت "خاکروب" کر رہا ہے۔ جب ہم صبح ابھی سوئے موئے پڑے ہوتے ہیں تو وہ ہمارے گلی محلوں کی صفائی کر رہا ہوتا ہے۔ ہم دیر تک نحوست ڈالے سو رہے ہوتے ہیں اور وہ صبح اذانوں سے قبل جھاڑو دینے ہمارے گلی کوچے میں پہنچ جاتا ہے اگر صفائی نصف ایمان ہے تو اس کا کچھ انعام "خاکروب" کو بھی ملنا چاہیے۔

" اشفاق صاحب! کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ آپ کے بچوں میں سے کوئی اشفاق احمد، تلقین شاہ اور "باباجی" کے روپ میں سامنے آ سکتا ہے"...... میں نے پوچھا

" مجھے اللہ تعالیٰ نے بڑی نیک اور فرمانبردار اولاد عطا کی ہے، اس کی ذات نے مجھے بیٹی سے نہیں نوازا مگر بہوؤں کی صورت میں یہ کمی پوری کر دی ہے، رہا یہ سوال کہ میرے بیٹوں میں کوئی اشفاق احمد یا تلقین شاہ بن سکتا، اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ وراثت میں دولت اور عقل و ذہانت تو مل سکتی ہے مگر نام، مقام اور شہرت انسان کا اپنا نصیب ہوتا ہے لوگ میرے بچوں کو اس حوالے سے یقیناً جانیں گے کہ یہ اشفاق احمد کے بیٹے ہیں مگر نام، مقام اور شہرت ان کے اپنے نصیبوں کا ہے۔

☆☆ .... ☆☆☆ .... ☆☆

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

پورا ملک میرے مخالفین سے بھرا ہے

احمد ندیم قاسمی

اردو ادب کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی ہمارے ملک کی انتہائی محترم اور معتبر ادبی شخصیت ہیں، ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا عرصہ نصف صدی سے بھی زائد پر محیط ہے، وہ شعر و ادب کا ایک ایسا تناور درخت ہیں جس کے سائے میں ادیبوں اور شاعروں کی کئی نسلیں پروان چڑھیں، عہدِ حاضر کے کئی معتبر نام ایسے ہیں جنہیں قاسمی صاحب کی شاعری پڑھ کر شعر کہنے کی تحریک ہوئی، جب پاکستان میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پہلا باقاعدہ مارشل لاء لگایا، اس وقت قاسمی صاحب ''امروز'' اخبار کے ایڈیٹر تھے اور یہ اعزاز انہیں حاصل ہے کہ ایک جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں مگر انہوں نے مجاہدانہ انداز میں حق گوئی اور حق پرستی کا پرچار کرتے ہوئے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر قربان کر دیا۔ صحافت سے قطع نظر اگر قاسمی صاحب کی ادبی خدمات پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو آج ان کا شمار نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''رم جھم''، ''دشت وفا''، ''محیط دوام'' اور ''لوح خاک'' قابل ذکر ہیں جبکہ افسانوں کے پندرہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''چوپال''، ''بگولے''، ''طلوع و غروب''، ''آنچل''، ''آبلے''، ''دیوار''، ''بازار حیات'' اور

Marfat.com

''برگ حنا'' بھی عوام میں بے حد مقبول ہیں، تخلیق فن سے ان کے جنونی لگاؤ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آج جبکہ خرابی صحت کے باعث انہیں سخت آرام کی ضرورت ہے وہ نوجوانوں سے زیادہ کام کر رہے ہیں، قاسمی صاحب سے ان کے فن و سخن کے حوالے سے جو تفصیلی مکالمہ ہوا وہ نذر قارئین ہے۔

س: آپ بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر شاعروں کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہ حالات کے ستائے اور عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہوتے ہیں، جس کے باعث وہ شعر کہنے لگتے ہیں آپ کے اس بارے میں کیا تجربات و مشاہدات ہیں؟

ج: پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ شاعری برے حالات، مفلسی یا عشق کی کوکھ سے جنم نہیں لیتی بلکہ یہ قوت تو قدرت کی طرف سے انسان کو ودیعت ہوتی ہے۔ ہم میں سے وہ کون ہے کہ جسے کبھی عشق و محبت کا تجربہ نہیں ہوا مگر سبھی شاعر تو نہیں ہوتے۔ رہی یہ بات کہ برے حالات میں اچھی شاعری کی جا سکتی ہے تو یہ محض ایک پروپیگنڈا ہے جو بڑے باشعور طریقے سے پھیلایا گیا ہے دراصل اس نظریئے کو استحصالی قوتوں نے فروغ دیا ہے کہ اہل قلم ہمیشہ برے حالات میں ہی رہتے ہیں اور اگر انہیں اچھے حالات میسر ہو جائیں تو وہ تو اس سے دست کش ہو کر دوبارہ بدحالی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں جبکہ دنیائے ادب میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں کہ نہایت اچھے حالات میں بھی اچھا ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جرمنی کا ''گوئٹے'' ایک نواب زادہ تھا مگر اس نے جو کچھ تخلیق کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے، حتیٰ کہ ہمارے علامہ اقبالؒ نے بھی اس کا نوٹس لیا، شاعری تو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ البتہ حالات ایسے ضرور ہونے چاہئیں کہ آدمی اپنے اندر کی قوت کو سامنے لا سکے، میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ان پڑھ لوگ ایسی کمال کی گفتگو کرتے ہیں کہ جس کا تصور ایک پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں کر سکتا مگر شہر کے لوگ اس لئے دیہات والوں کو اہمیت نہیں دیتے کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ دیہاتی لوگ اپنی دانائیاں ایسے سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ تو آسمان پر ستاروں کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کل کا موسم کیسا ہوگا ان سے تو کسی بھی اچھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

س: آپ کا شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج: قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے سرپرست میرے چچا پیر حیدر شاہ تھے، میں جب تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا لہٰذا میں نے اپنے چچا کی سرپرستی میں ہی تعلیم حاصل کی اگرچہ وہ سول سروس میں تھے مگر انہیں علم و ادب کا بے حد شوق تھا، ان کے کتب خانے میں اعلیٰ درجے کی کتابیں ہوتی

Marfat.com

تھیں، اس کے علاوہ اس زمانے میں ہمارے گھر میں بھی اپنے وقت کے معروف رسائل ''نگار''، ''صوفی'' اور ''ہمایوں'' آیا کرتے تھے۔ ہمارے چچا ہمیں صبح سویرے عبدالحق محدث کی لکھی ہوئی ''تفسیر حقانی'' پڑھایا کرتے تھے، میرا رجحان شروع سے ہی شعر اور اچھے ادب کی جانب تھا، میں نے پہلی نظم اس وقت لکھی جب میں ابھی میٹرک میں تھا۔ ہوا یوں کہ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہوگیا اور مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر ہمارے بہت بڑے راہنما ہیں اور انگریز حکمرانوں کے لئے شمشیر برہنہ کا درجہ رکھتے تھے، اگرچہ اس وقت میری عمر چودہ پندرہ برس تھی مگر مجھے ان کی موت کا بے حد صدمہ ہوا، میں نے سوچا کہ لوگ بڑی اور نامور ہستیوں کی رحلت پر نوحے اور مرثیے لکھتے ہیں لہٰذا کچھ مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے چنانچہ میں نے چند اشعار لکھ کر جب چچا کو دکھائے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

اس وقت لاہور سے ایک روزنامہ سیاست نکلا کرتا تھا جس کے مدیر صحافتی دنیا کی مشہور شخصیت سید حبیب تھے، چچا نے وہ نظم ان کے حوالے کردی، جو اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں پورے صفحے پر مختلف رنگوں کے ساتھ شائع ہوئی، اس سے آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ خوشی سے میری کیا حالت ہوئی ہوگی پھر میں کالج چلا گیا اور چار سال تک کالج میں شاعری کرتا رہا۔ کالج میں محمد خالد اختر میرے گروپ فیلو تھے یہ وہی خالد اختر ہیں جن کا شمار ہمارے معروف مزاح نگاروں میں ہوتا ہے اور وہ انگلش فکشن کے بہت فدائی تھے۔ انہوں نے مجھے ''سٹیون'' پڑھنے کو دیا اور ساتھ ہی مجھے افسانہ نگاری پر بھی اکسایا، چنانچہ جب میں تعلیم سے فارغ ہوا تو میں نے پہلی کہانی اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' میں لکھی جس کا عنوان تھا ''بدنصیب بت تراش'' اس زمانے میں اس قسم کے عنوانات ہی ہوا کرتے تھے غالباً یہ 1938,39ء کی بات ہے۔

س: تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے بطور روزگار کیا شعبہ اپنایا؟

ج: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میرے چچا ہی میرے سرپرست تھے جب میں تھرڈ ائیر میں تھا تو ان کا انتقال ہوگیا، اب میرے اقتصادی حالات ایسے نہ تھے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا، جب ان کے انتقال کے بعد میں گاؤں گیا تو مجھے بتایا گیا کہ چچا تو میرے فورتھ ایئر کے آخری مہینے تک کی فیسیں ایک عزیزہ کے پاس جمع کروا گئے ہیں، جس پر میں دوبارہ گاؤں سے واپس آ گیا، یوں میں نے گریجویشن کی لیکن مرحوم اگر ایسا بندوبست نہ کرتے تو میں ایف سے آگے تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔ پھر جب میں نے بی۔ اے پاس کرلیا تو تلاش روزگار میں لگ گیا، چھوٹی چھوٹی نوکریاں ڈھونڈنے کے پیچھے لگا رہا کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ ٹائپ سیکھ لو، لہٰذا راولپنڈی میں مقیم ایک عزیز کی مہربانی سے ٹائپ سیکھی، پھر میں لاہور آ گیا، نظمیں وغیرہ تو میں پہلے ہی لکھ رہا تھا

Marfat.com

ایک روز جب میں مولانا عبدالمجید سالک (مرحوم) سے ملا جنہیں میں اپنا استاد مانتا ہوں تو وہ کہنے لگے "بھائی تم کوئی اچھی سی ملازمت کرو یہ کیا ٹائپسٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو" میں نے کہا "جناب! میرے حالات اچھے نہیں ہیں، میں کس سے کہوں۔" ان دنوں لاہور میں میرے ایک عزیز اچھی ملازمت پر فائز تھے ان کی مدد سے مجھے محکمہ آبکاری میں بطور سب انسپکٹر بھرتی کر لیا گیا۔

س: ایک شاعر اور ادیب ہونے کے ناطے کیا یہ ملازمت آپ کے مزاج کے خلاف نہ تھی؟

ج: جی ہاں! یہ بالکل میرے ذوق کے خلاف تھی، میرے بعض معروف ادبی دوستوں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ کرشن چندر نے مجھے خط لکھا "بیکاری سے آبکاری تک" دوسرے لوگوں نے بھی اسی طرح کے Comments دیئے مگر مجبوری تھی اس نوکری میں مجھے چھاپے مارنا پڑتے تھے، نہایت ہی غریب اور مفلس لوگ خوانچے لگاتے تھے، میں وہاں جا کر چھاپے مارتا اور انہیں فوراً پولیس کے حوالے کر دیتا تھا۔ میرے عزیز دوست خان عبدالحمید اللہ خان ان دنوں پولیس میں تھے، میں نے اپنے ان قطعات کا مجموعہ "رم جھم" انہی کے نام منسوب کر رکھا ہے۔ انہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ آج یہ چھاپے مارنے گیا ہوا ہے کل آ کر استعفیٰ دے دے گا، اس طرح دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ پھر میں نے مولانا سالک کو لکھا کہ میں گزارا نہیں کر سکتا یہاں تو میرا مقابلہ شرابیوں سے ہے۔ کچھ لوگ اپنے کھیتوں میں شراب کی بھٹیاں لگاتے ہیں اور بندوقیں نیزے لے کر پہرہ دیتے ہیں میں اکثر پولیس کو وہاں لے کر جاتا ہوں مگر کسی بھی وقت خون خرابے کا اندیشہ موجود رہتا ہے ویسے بھی یہ گندی بات ہے کہ میں افیون، شراب اور چرس بنانے والوں کی چیکنگ کرتا پھروں۔ مولانا سالک نے کہا کہ وہ اس کا بندوبست کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں امتیاز علی تاج نے "دارالاشاعت پنجاب" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جس کے تحت دو پرچے شائع ہوتے تھے، ان میں سے ایک بچوں کا رسالہ "پھول" اور دوسرا خواتین کا "تہذیب نسواں" تھا۔ یہ دونوں پرچے ہفتہ وار تھے، ان کی ادارت مجھے سونپ دی گئی، ان دنوں رسالہ ادب لطیف بھی نکلا کرتا تھا، جس کا ادبی دنیا میں ایک مقام تھا، ایک زمانے میں فیض احمد فیض اور راجندر سنگھ بیدی بھی اس کے مدیر رہ چکے تھے مگر اب اس کے مدیر میرے پاس آئے کہ تم ادب لطیف کو بھی ایڈٹ کر دو، چنانچہ میں نے "ادب لطیف" کی ادارت بھی سنبھال لی، اس سلسلے میں بعض مقدمات میں بھی پھنسنا پڑا۔ ان دنوں زیادہ کام کرنے کی وجہ سے میرا بریک نروس ڈاؤن ہو گیا جب شہر میں بھی علاج وغیرہ سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو مایوس ہو کر گاؤں چلا گیا جہاں آہستہ آہستہ میری صحت پھر سے بحال ہونے لگی، اس زمانے میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی میں نے اپنے علاقے میں تحریک پاکستان کے لئے بہت زیادہ کام کیا میرا علاقہ

Marfat.com

سنیسکر بہت مشہور جگہ ہے اس کی چوٹی پر راڈار سٹیشن اور نیچے وادی ہے۔ میرا گاؤں بھی اسی وادی میں ہے، وہاں میں نے دوستوں کے ہمراہ تحریک پاکستان بڑے زور و شور سے چلائی، جلسے جلوس نکالے، ہم نے ان جلسوں میں اپنے زمانے کے نامور لیڈروں کو بلوایا، جن میں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات، راجہ غضنفر خان اور فیروز خان نون شامل تھے، جو بڑی زوردار تقریریں کیا کرتے تھے، ہم اس وقت نوجوان تھے اور سمجھتے تھے کہ لیڈر جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں مگر یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ یہ لوگ جن کے میں نے لمبے جلوس نکالے تھے انہوں نے ہی میری گرفتاری کے وارنٹ پر دستخط فرمائے۔

س: گرفتاری کی اصل وجہ کیا بتائی گئی؟

ج: اس کے لئے تو سرکار کو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے ہوتا تھا، ہمیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا، اس زمانے میں پنڈی سازش کیس بھی ہوا تھا، جس میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر صاحب پکڑے گئے تھے، حکومت کو ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ شور نہ مچائیں کیونکہ ان کے ہاتھوں میں قلم ہے، انہوں نے ایک طرف کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کو گرفتار کر لیا جبکہ دوسری جانب ہم جیسے ترقی پسندوں کو بھی پکڑ لیا، پھر جب میں رہا ہوا تو ایک دن تانگے میں اسمبلی ہال کی عمارت کے قریب سے گزر رہا تھا، میں پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک جانب سے جھنڈے والی کار نمودار ہوئی کار تانگے کے پیچھے آ کر ذرا آہستہ ہو گئی، میں نے اندر جھانکا تو ممتاز دولتانہ بیٹھے تھے، ان دنوں وہ وزیر اعلیٰ تھے انہوں نے تانگہ روکنے کا اشارہ کیا میں نے تانگہ رکوایا وہ کار سے باہر نکل کر کہنے لگے "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں جیل جانا پڑا مگر یہ سب مرکز والوں کا کیا دھرا ہے۔" بہر حال میں نے ان کی معذرت قبول کر لی۔ یوں میری جدوجہد جاری رہی۔

اسی دوران ریڈیو پاکستان پشاور سے میرا لکھا ہوا پہلا قومی نغمہ نشر ہوا، جسے گلوکارہ ناہید نیازی کے والد سجاد سرور نیازی نے گایا تھا۔ پھر مارچ 1948ء کے آغاز میں پشاور ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے لاہور آ گیا، یہاں پر میں نے رسالہ نقوش جاری کیا اور اس کی ادارت بھی کرنے لگا۔ محمد طفیل ہمارے منیجر تھے، ڈیکلریشن انہی کے نام کا تھا، تنخواہ تو ہماری مقرر نہیں ہوئی تھی، البتہ طے یہ ہوا تھا کہ ہم برابر کے حصہ دار ہوں گے، ہم نے ڈیڑھ سال تک یہ پرچہ چلایا مگر پھر حکومت نے اسے بند کر دیا۔ کیونکہ میں نے اس میں منٹو کی کہانی "کھول دو" شائع کر دی تھی اس وقت جو فسادات ہو رہے تھے یہ انہی کے پس منظر میں لکھی گئی تھی، بڑی مؤثر کہانی تھی مگر حکومت نے اسی بناء پر نقوش کو چھ ماہ کے لئے بند کر دیا جس پر ادیب برادری نے بڑا شور مچایا، وہ ادیب جو ہمارے ساتھ متفق نہیں تھے اس مسئلے پر انہوں نے بھی پروگریسو رائیٹرز کے ساتھ مل کر بھرپور احتجاج کیا، ان

Marfat.com

میں ایک نمایاں ترین نام محمد حسن عسکری کا تھا، اس سلسلے میں ہم نے باغ جناح اوپن ایئر تھیٹر لاہور میں آل پاکستان پروگریسو رائیٹرز کی کانفرنس منعقد کی جو بڑی ہنگامہ خیز رہی، اس پر حملہ کرنے کے لئے ہمارے دوست شورش کاشمیری (مرحوم) اور ریاض شاہد (مرحوم) اپنے غنڈہ ٹائپ آدمی لے کر آ گئے۔

س: ان لوگوں کو کانفرنس کے انعقاد پر کیا اعتراض تھا؟

ج: دراصل یہ لوگ ہمارے خیالات سے متفق نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے اور ایسا روس کی ایماء پر کیا جا رہا ہے۔ جب یہ لوگ غنڈے لے کر آئے تو وہاں پر ہمارے ورکرز بھی موجود تھے، اب صورتحال یہ تھی کہ نیچے ہاکیوں سے لڑائی ہو رہی تھی اور اوپر ہم لوگ مشاعرہ کر رہے تھے، بعد میں ریاض شاہد تو ہمارے ساتھ آ ملا مگر شورش کاشمیری اپنے مخصوص نظریئے پر قائم رہے۔ ہم نے کانفرنس منعقد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ آخر فلکار برادری کب تک بیکاری اور بے روزگاری کا شکار رہے گی، میں ان دنوں نقوش کی ادارت بھی کر رہا تھا کہ ایک روز محمد طفیل نے آ کر مجھے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں چل سکتے، کیونکہ روزانہ سی آئی ڈی والے بلوا لیتے ہیں، انہوں نے مزید کہا کہ آپ کے نظریات تو ٹھیک ہوں گے مگر میں ان نظریات کا متحمل نہیں ہو سکتا، میں نے کہا کہ ہم نے بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ نقوش کے لئے کام کیا ہے اگر یہ بند ہوا تو ہمیں بہت صدمہ ہوگا۔ اس پر محمد طفیل نے کہا پھر آپ اس کو چلا لیجئے۔ میں نے کہا ہم تو تہی دست ہیں ہم تو اس کو چلانے سے رہے، اس زمانے میں روزنامہ ''امروز'' کے مدیر چراغ حسرت تھے، وہ کسی وجہ سے خفا ہو کر جب الگ ہوئے تو پھر میاں افتخار الدین (مرحوم) نے مجھ سے کہا کہ تم اس کی ادارت سنبھال لو، میں تو بیکار بھی تھا اور دوسرا امروز اخبار ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق بھی تھا۔ لہٰذا میں 1953ء سے 1959ء تک اس کا مدیر رہا۔ اس دوران ایوب خان نے حکومت سنبھالی اور مارشل لاء لگ گیا، اس پر میں نے اپنے سٹاف کی میٹنگ بلوائی۔ میں نے کہا ہم لوگ تو یہاں بیٹھ کر عرب اور افریقی ممالک پر ہنسا کرتے تھے کہ یہ لوگ حکومت نہیں چلا سکتے، اگر کوئی وزیراعظم بھی آتا ہے تو ایک ہفتے بعد کوئی فوجی آ کر اس کو ذبح کر دیتا ہے اور خود اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، مگر اب تو ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو بڑی خطرناک صورتحال ہے اس دوران مجھے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک مضمون ملا اس کا عنوان تھا ''کیا یہ مارشل لاء ہے؟'' مطلب یہ تھا کہ یہ تو نعمت خداوندی ہے، میں نے جواب میں محکمہ اطلاعات کو عرض کیا کہ میں یہ مضمون نہیں چھاپ سکتا جس پر مجھے اوپر سے پیغام ملا۔ ''ہم اپنے آدمی بھیج دیں۔''

میں نے کہا ''جناب! بھیج دیجئے''

Marfat.com

چنانچہ ادھر ایک آدمی مضمون واپس لے کر گیا اور ادھر دوسرا آدمی میرا وارنٹ گرفتاری لے کر آیا اور مجھے پکڑ کر اندر کر دیا گیا۔ پہلے میں لاہور جیل اور پھر راولپنڈی جیل چلا گیا، وہاں دو تین مہینے رہنے کے بعد مجھے شاہی قلعہ لاہور میں لایا گیا، جہاں مجھے خطرہ تھا کہ دوسرے ملزموں کی طرح کہیں مجھے بھی ٹارچر نہ کیا جائے اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ مجھے ٹارچر وغیرہ تو نہ کیا گیا البتہ چند دن تنہائی میں ضرور رکھا گیا۔ ایک چھوٹا سا اندھیرا کمرا تھا جس سے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کمرے میں اینٹوں اور سیمنٹ کا ایک تھڑا بنا ہوا تھا، اس پر بیٹھتے اور اسی پر سوتے تھے، ٹارچر اگر مجھے کیا گیا تو صرف اس حد تک کہ آدھی رات کو ایک دو بجے سپاہی آ کر کہتا تھا:

''اٹھیے جی! آپ کو بلا رہے ہیں''

جب میں اوپر جاتا تھا تو وہاں سی آئی ڈی کے کوئی سپرنٹنڈنٹ بیٹھے ہوئے تھے وہ پھر مجھ سے سوال کرتے تھے کہ آپ کو جو گرفتار کیا گیا ہے تو آپ کو کس کے بارے میں شبہ ہے کہ کون آپ کی رپورٹ کرے گا۔ میں نے کہا میرا تو کوئی دشمن ہے ہی نہیں۔ پھر سپرنٹنڈنٹ باقاعدہ نام لیتے تھے شورش کاشمیری نے آپ کی رپورٹ کی ہے۔ میں کہتا تھا کہ وہ تو میرے نہایت محترم دوست ہیں جس کے بعد وہ دوسروں کے نام گنوانے لگتے تھے پھر بھی جب بات نہ بنتی تھی تو کہتے اچھا یہ چلغوزے کھائیے، مونگ پھلیاں کھائیے۔ تو وہ کچھ اس انداز سے مجھے ٹارچر کرتے تھے۔ میں دس بارہ روز تک شاہی قلعہ میں رہا تو پھر انہوں نے مجھے یہ کہہ کر رہا کر دیا کہ یہ کیس Hopeless ہے۔ رہائی کے کچھ روز بعد میں نے دوبارہ امروز کی ادارت سنبھال لی۔

یہ مارچ 1959ء کی بات ہے جب صبح کو مجھے گھر پر ٹیلی فون ملا کہ پولیس اور فوج نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کر لیا ہے، میں جب دفتر گیا تو وہاں پولیس اور فوج کا پہرہ تھا۔ میرے دفتر کے اندر بھی پولیس والے بیٹھے تھے، میں نے پوچھا کیا بات ہے جس پر مجھے بتایا گیا کہ نہ صرف امروز کو ٹیک اوور کر لیا گیا ہے بلکہ (Essential Service ACT) بھی لگا دیا گیا ہے جس کے تحت ملازمت سے غیر حاضر رہنے والے شخص کو پکڑا جا سکتا ہے، میں چند دن پہلے ہی رہا ہو کر آیا تھا، اب میں نے سوچا کہ یہ تو اور بھی بڑی مصیبت آ گئی ہے۔ لہٰذا میں نے وہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے کہہ دیا کہ ''میں یہاں پر کام نہیں کروں گا'' انہوں نے کہا ''اس صورت میں آپ کو پکڑ لیا جائے گا، میں نے کہا ''جناب یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں آزادی سے اخبار کے اداریے لکھتا رہوں مگر اب پولیس والے آ کر مجھے ڈکٹیشن دیں گے کہ یہ نہ لکھو وہ نہ لکھو، یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ اس پر ایڈمنسٹریٹر صاحب نے قدرت اللہ شہاب کو فون کیا جو اس زمانے میں انفارمیشن سیکرٹری تھے وہ لاہور

Marfat.com

آ گئے، انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور مقبرہ نور جہاں کے ایک ویرانے میں لے گئے پھر شہاب صاحب کہنے لگے: "میں بھی ادیب ہوں اور آپ بھی ادیب ہیں، آپ میرے ساتھ بحث کیجئے ہم جو آپ کو کہہ رہے ہیں آپ اخبار کی ادارت جاری رکھئے تو آپ اسے کیوں رد کر رہے ہیں، پھر میں نے بحث کی اور وہ قائل ہو گئے، میں نے ان سے کہا کہ اگر میں یہاں بیٹھا رہوں گا تو اس کا مطلب یہ ہے، سبط الحسن لیل و نہار کے ایڈیٹر تھے ان کو تو برطرف کر دیا گیا مگر مظہر علی خان جو کہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہیں چونکہ وہ Well Connected ہیں اور ان کے ہم زلف جنرل شیخ وہاں ہوم منسٹر ہیں تو وہ اطمینان سے بیٹھے ہیں، مجھے آپ اس لئے پکڑ سکتے ہیں کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ اس پر قدرت اللہ شہاب نے کہا "ٹھیک ہے ہم آپ کا استعفیٰ قبول کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا اکرم ہوگا۔"

اس کے بعد میں بیکار ہو کر ایک بار پھر سڑک پر آ گیا۔

س: مجلس ترقی ادب کی ذمہ داریاں آپ کو کب سونپی گئیں؟

ج: یہ 1974ء کا واقعہ ہے جب یہاں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے، ایک روز ان کے پریس سیکرٹری پروفیسر فتح محمد ملک میرے پاس آئے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ پروفیسر حمید اللہ خان جو مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی جگہ ہم آپ کے بارے میں سوچ رہے ہیں کیونکہ یہ ادارہ خالصتاً کلاسیکل کتابیں چھاپتا ہے اس میں سیاست کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اس لئے اب یہ شعبہ تم سنبھال لو، تب سے میں یہاں بیٹھا ہوں ساتھ ہی فنون بھی جاری کئے ہوئے ہوں اور اخبارات میں کالم وغیرہ بھی لکھتا ہوں۔

س: آجکل ہمارے ادیب اور شاعر بہت سے گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں ان میں سے ایک طبقے کا یہ خیال ہے کہ قاسمی صاحب محض گل و بلبل اور رنگ و بو کے شاعر ہیں انہوں نے حبیب جالب کی طرح کبھی بے باک شاعری کی اور نہ ہی صاف گو شاعروں کی طرح دوٹوک انداز میں عوام کی نمائندگی کی، کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

ج: بات یہ ہے کہ جس طرح عوام کے جذبات کی نمائندگی میں نے کی میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس جیسی نمائندگی کسی اور نے نہیں کی، آپ میرے افسانے اور نظمیں پڑھ کر دیکھ لیجئے آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا، نہ جانے یہ غلط فہمیاں کن لوگوں نے پھیلائی ہیں میں جو کبھی یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ میرا کوئی مخالف ہی نہیں آج پورا ملک میرے مخالفوں سے بھرا ہوا ہے۔ تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے فیض احمد فیض کا بت بنا لیا

Marfat.com

ہے وہ سمجھتے تھے کہ ایک شخص تھا جو فیض کے مقابل آ سکتا تھا، اس لئے اس کی جتنی بھی مذمت کرو کم ہے، اس ڈر کی وجہ سے میرے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، دوسرا یہ کہ پچھلے تیس چالیس برسوں میں جب بھی ترقی پسند مصنفین پر کوئی حملہ ہوا تو صرف میں نے ہی اس کا جواب دیا، شاید یہی وجہ ہے کہ ایک مخصوص مذہبی جماعت کے جتنے پرچے ہیں وہ مجھ پر برستے رہتے ہیں، آج بھی میں انہیں جب کچھ نہیں کہتا تو وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ میں عوام الناس کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہوں۔ ضیاء الحق کی زندگی میں میرے جو کالم چھپتے رہے میرے مخالفین کی نظریں ان پر کیوں نہیں جاتیں، جس میں واضح طور پر میں نے کہا تھا کہ ریفرنڈم اور غیر جماعتی انتخابات سب فراڈ تھے، رہی حبیب جالب کی شاعری تو جس طرح مولانا ظفر علی خان کی شاعری تھی ویسی ہی حبیب جالب کی شاعری تھی وہ ایک بنگالی شاعر تھے اور جس دور میں ایسی شاعری کی جا رہی تھی انتہائی مفید تھی، سبھی جانتے ہیں کہ مولانا ظفر علی خان نے انگریزوں کے خلاف زبردست شاعری کی مگر اب کون جانتا ہے ان کی شاعری کو؟ جالب کی زندگی میں ان کی امداد کے لئے مشاعرہ ہوا تھا تو اس کی صدارت میں نے ہی کی تھی وہ یقیناً باہمت شخص تھے، لیکن یہ جو فن ہے یہ بڑی مختلف چیز ہے۔ آج کتنے بڑے نام ہیں جو مجھ سے ذرا سی کم عمر کے ہیں وہ سب کے سب میرے ہی ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں۔ میں نے ہی سب سے پہلے انہیں چھاپا تھا مگر آج وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، ڈرتے ہیں۔ احمد فراز کا کہنا ہے کہ میری پہلی نظم اس شخص (احمد ندیم قاسمی) نے چھاپی اگر یہ نہ چھاپتا تو مجھے شاعری اپنانے کی ہمت نہ ہوتی اب میں اور کتنے لوگوں کے نام لوں۔

س: ابھی آپ نے فیض صاحب کا ذکر فرمایا کہ لوگوں نے ان کا بت بنا لیا ہے اور ان کی شاعری کو یا عالمی سطح پر خود ان کو جو شہرت حاصل ہوئی اس بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں فیض احمد بہت شیریں میٹھا رومانٹک شاعر تھا، حسن اور محبت کے جذبات کو وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی نظم یا غزل میں لے آتا تھا مگر میں اسے غالب یا اقبال کی صف میں تو کھڑا نہیں کر سکتا وہ اتنا عظیم شاعر نہیں تھا جتنا اسے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ شاعروں میں جو فکر اور گہرائی ہوتی ہے، وہ اسے جان بوجھ کر اپنے کلام میں نہیں لاتے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اقبال کے دور میں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ جس سطح پر اقبال پہنچا ہے میں وہاں کس طرح پہنچوں گا۔ فیض نے جو کچھ بھی کہا وہ بڑے طریقے اور حسن سے کہا لیکن ان کے کلام میں گہرائی نہیں وہ بہت پڑھے لکھے تھے گہرائی میں بھی جا سکتے تھے اور بلندی پر بھی، مگر عام طور پر انہیں جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ اسی پر اکتفا کر کے بیٹھ گئے حالانکہ فیض صاحب سے بہت بڑی شاعری کی توقع کی جا

Marfat.com

سکتی تھی۔ مگر اب ان کو مزاحمتی شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ انہوں نے کون سی مزاحمتی شاعری کی اگر وہ فلسطین میں رہے تو اپنی نوکری کے سلسلے میں رہے۔

س: فیض صاحب کو تو لینن ایوارڈ بھی مل چکا تھا اس لئے عالمی سطح پر ان کی ایک شناخت تھی؟

ج: میں نے تو پہلے ہی کہا کہ وہ بہت اچھے میٹھے اور پیارے شاعر تھے لیکن انہیں عظیم شاعر نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ عظیم کہہ کر ہم عظمت کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔

س: آپ بڑے باکمال شاعر ہیں آپ نے بہت خوبصورت شاعری کی مگر یہ کیا وجہ ہے کہ بہت کم گلوکاروں نے آپ کا کلام گایا؟

ج: بات یہ ہے کہ جب میں اپنے شاعر بھائیوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ مجموعے اٹھائے گانے والوں کے پیچھے پھرتے ہیں اور ان کی منتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ میری فلاں غزل گا دیجئے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے، میری زندگی میں آج تک ایسا ایک واقعہ بھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی گانے والے سے کہا کہ یہ میری غزل گا دو سوائے ایک واقعہ کے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم ابھی زندہ تھیں میں راولپنڈی کسی کام سے گیا ہوا تھا، وہاں میں نے ٹیلی ویژن دیکھا تو وہ غزل گا رہی تھیں ایک نہایت کمزور اور معمولی سی غزل تھی، میرا ان سے تعارف تو پہلے بھی تھا چنانچہ میں نے انہیں لکھا ایک غزل بھجوا رہا ہوں، آپ کا آرٹ اپنی جگہ مسلمہ ہے مگر الفاظ بہر حال ٹھیک نہیں تھے، لہٰذا آپ یہ غزل گا دیجئے، انہوں نے میری پوری کی پوری غزل گا دی وہ آدھے گھنٹے تک مسلسل کلاسیکل انداز میں میری غزل گاتی رہیں جس کے بول یہ تھے:

انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا دیکھا
نکل کے گھر سے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

اس کے علاوہ ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں کہ میں نے مہدی حسن یا نور جہاں سے ان کی زندگی میں کہا ہو کہ خدا کے لئے میری غزل گا دیجئے، لیکن ایسے بہت بڑے لوگ ہیں جن کے نام لینا نہیں چاہتا ان میں سے کچھ مر گئے ہیں اور کچھ ابھی زندہ ہیں کہ وہ اپنے پورے کے پورے مجموعے گلوکاروں کی نذر کر دیتے ہیں کہ ان میں سے انہیں جو بھی اچھا لگے وہ گا دیں مگر ایسی شہرت مجھے اچھی نہیں لگتی، شہرت تو وہی ہوتی ہے جو ہو اور اسے ہی دوام حاصل ہوتا ہے۔ Printed

☆☆......☆......☆......☆☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

عبدالقادر حسن

Marfat.com

Marfat.com

اچھا کالم نگار حکومت اور ایڈیٹر کو بے وقوف بنا کر اپنی بات کہہ جاتا ہے

عبدالقادر حسن

عبدالقادر حسن صحافت کے ایک عہد کا نام ہے جبکہ کالم نگاری میں ان کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے، آپ کا تعلق پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں سنسکیسر (ضلع خوشاب) سے ہے تاہم گزشتہ نصف صدی سے لاہور میں بیٹھے عمدہ کالم نگاری کی سنچریوں کے ریکارڈ قائم کئے جا رہے ہیں، عبدالقادر حسن ابتداء میں ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے میدان میں آئے اور پھر بطور اخبار نویس عملی زندگی کا آغاز کیا، ان کے ذہن کی سکرین پر گذشتہ پچاس برس کے دوران آنے والے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے اچھے برے اعمال اب بھی محفوظ ہیں جس کا وقتاً فوقتاً موقع محل کی مناسبت سے اپنے کالموں میں اظہار خیال کرتے رہتے ہیں، عبدالقادر حسن کی کالم نگاری کے حوالے سے ان سے ایک طویل نشست ہوئی اس دوران ان سے سیاست اور صحافت کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں جو دلچسپ گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

س: آپ نے صحافت میں بطور رپورٹر قدم رکھا۔؟

ج: صحافت میں بطور اپرنٹس سب ایڈیٹر کے طور پر آیا اور نوائے وقت سے وابستہ ہوا، وہاں میں نے بطور اپرنٹس سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا ڈیڑھ دو سال کام کرنے کے بعد میں اس وقت کے ایک ویکلی

Marfat.com

پرچے ''لیل ونہار'' میں چلا گیا یہ ویکلی پرچہ پروگریسو پیپرز نے نکالا تھا، فیض احمد فیض صاحب اس کے ایڈیٹر تھے، میں وہاں ایوب خان کے مارشل لاء لگنے تک رہا پھر جب مارشل لاء نے پاکستان ٹائمز اور امروز وغیرہ کو اپنی تحویل میں لے کر نیشنل پریس ٹرسٹ بنایا تو میں پھر نوائے وقت میں بطور رپورٹر واپس آ گیا اگرچہ انہی دنوں میں کچھ کالم بھی لکھا کرتا تھا مگر بنیادی طور پر رپورٹر ہی تھا، کئی سال رپورٹنگ چلتی رہی پہلے میں یونین رپورٹر تھا پھر رفتہ رفتہ میں نوائے وقت کا چیف رپورٹر ہو گیا، وہاں میں نے 25 سال گزار دیئے، رپورٹرز سے میرا تجربہ کچھ یوں مختلف ہے کہ اس وقت صرف نوائے وقت ہی تھا جو اپوزیشن کی خبریں چھاپا کرتا تھا، دوسرے اخبارات میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبار تھے جبکہ لاہور مین نوائے وقت کے سوا کوئی اور آزاد خیال اخبار نہیں تھا اور اس کا میں چیف رپورٹر تھا اس لئے تمام سیاسی خبریں اور خاص طور پر اپوزیشن سے میرا پیشہ ورانہ تعلق تھا ان کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں کیونکہ میں ہی ان کی خبریں دیا کرتا تھا کوئی دوسرا اخبار ان کی خبریں نہیں دیتا تھا، لہذا یوں اپوزیشن لیڈروں سے میرے نہایت ہی قریبی تعلقات رہے اس کے بعد میں نے نوائے وقت میں ہی رپورٹنگ چھوڑ کر کالم نویسی شروع کر دی اور پھر کچھ عرصہ بعد میں جنگ میں چلا گیا۔ جنگ میں بطور کالم نگار میں نے کام شروع کیا یہ ضیاء الحق کا زمانہ تھا اس دوران جنگ چھوڑ کر میں امروز کا چیف ایڈیٹر بھی بنا مگر وہاں میں زیادہ عرصہ اس لئے نہیں رہا کہ وہاں کے ماحول میں Improvment بہت مشکل تھی، لہذا امروز کی چیف ایڈیٹری چھوڑ کر میں ایک بار پھر جنگ میں چلا آیا، بھٹو صاحب کے زمانے میں جب میں نوائے وقت سے الگ ہوا تو میں نے ایک ویکلی ''افریشیا'' نکالا مگر یہ ون مین شو تھا۔

س: آپ نے 1956ء میں صحافت کا آغاز کیا، بطور سب ایڈیٹر پورٹر چیف رپورٹر اور چیف ایڈیٹر وغیرہ یہ سارے مراحل طے کرتے ہوئے آج آپ صحافت کے ایک اہم مقام پر کھڑے ہیں ہمارا سوال یہ ہے کہ اس وقت کی صحافت اور آج کے جرنلزم میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج: ایک تو میں آپکو اپنی کوتاہی بتا تا چلوں کہ میرا اخبار کے دفتر سے تعلق نہیں تھا برسوں گزر جاتے ہیں کبھی جنگ کے دفتر جانا نہیں ہوتا، کالم لکھتا ہوں اور فیکس کر دیتا ہوں ورکنگ جرنلسٹس کے ساتھ کام نہ کرنے کی وجہ سے یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ کل کی اور آج کی صحافت میں کتنا بڑا فرق ہے لیکن فرق کی کوئی انتہا نہیں میں نے جب صحافت شروع کی تھی اس زمانے میں کالم نگار ہونا ملازمت نہیں بلکہ ذریعہ روزگار تھا بے شک تنخواہ بھی ملتی تھی اور اچھا برا گزارا بھی ہو جاتا تھا مگر تنخواہ کیلئے کوئی کام نہیں کرتا تھا، اسی زمانے میں اخبار نویس وہی بنتا تھا جو خلوص نیت سے اخبار نویس بننے کا جذبہ رکھتا ہو، اس میں روپے پیسے کو قطعی دخل نہیں تھا اب جو ہم لفافہ جرنلزم

Marfat.com

کا نام سنتے ہیں اس دور میں تو اس کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، بڑا کمال ہوتا تھا تو پریس کانفرنس میں اخبار والوں کو چائے پلا دی جاتی تھی بلکہ اکثر اخبار نویس کہہ دیا کرتے تھے کہ چائے وغیرہ نہ منگوایا کریں جو بات کرنی ہے وہ کریں، شاید یہی وجہ تھی کہ آج تک کبھی میری خبر کی Contradiction نہیں ہوئی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ موچی دروازہ میں جب لیڈر تقریر کرنا شروع ہوتا تھا اور زندہ باد کے نعرے لگتے تھے تو ایسے میں اس کے ہوش وحواس غائب ہو جایا کرتے تھے وہ کچھ اور الٹی پلٹی باتیں شروع کر دیا کرتے تھے اس میں اگر وضاحت آتی کہ میں نے تو یہ فقرہ کہا ہی نہیں تو نیوز ایڈیٹر اور دیگر ذمہ داران کو پتہ ہوتا تھا کہ اس نے بات تو وہی کہی تھی کیونکہ اس وقت ہم ان کی تقریریں جو نوٹ کر رہے ہوتے تھے انہیں انتہائی مستند تصور کیا جاتا تھا کیونکہ آپ کے پاس یہ گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کچھ اور کہہ رہا ہے اور آپ کچھ اور لکھ رہے ہیں، یہ تو ہندو کے بہی کھاتہ جیسا ہوتا تھا جو سپریم کورٹ تک مستند سمجھا جاتا تھا کہ اسی کھاتے میں جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے، اس وقت کوئی ایسی بات خود ہی نہیں لکھا کرتے تھے جس کے بارے میں ہمیں پتہ ہوتا تھا کہ اس نے عالم مدہوشی میں کہہ دی ہوگی اور جب وہ بلیک اینڈ وائٹ میں چھپا دیکھے گا تو اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا لہذا ایسی باتیں ہم خود ہی خبر سے غائب کر دیا کرتے تھے اس زمانے میں بعض مقررین ایسے بھی ہوتے تھے کہ ان کی تقریر میں ہوتا کچھ نہیں تھا۔ مثلاً آغا شورش کشمیری کی زبردست اور خوبصورت تقریر ہوتی تھی مگر جب خبر بنانے بیٹھتے تھے تو کام کی کوئی بات ہی نہیں ملتی تھی، ان کی تقریر سے ایک جملہ بھی نہیں نکلتا تھا چنانچہ حالات اور جلسے کے موضوع کے مطابق اور کچھ اپنی جانب سے ان کی تقریر پر خبر بنائی جاتی تھی، جس کا وہ ہر صبح شکریہ ادا کرتے تھے کہ آپ کی بڑی مہربانی، میرے زمانے میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہمارے جو سینئر تھے وہ سکھایا کرتے تھے جب ان کے پاس کوئی نیا بندہ آتا تھا پہلے تو وہ اس کو کہتے تھے کہ یہ کام بڑا مشکل ہے اس میں بڑی بھوک ننگ ہے، مصیبتیں ہیں وغیرہ وغیرہ مگر ان کے سمجھانے کے باوجود اگر کوئی ضد کرتا تھا پھر وہ اسے سکھاتے تھے وہ نئے بندے کو پوری ہدایات دیا کرتے تھے یعنی نئے آنے والے کو سکھانا وہ اپنی ڈیوٹی سمجھا کرتے تھے، یہ ایک ایسی بات تھی جو میرے خیال میں اب بالکل نہیں رہی ہے میں آپ سے عرض کروں کہ ظہور عالم شہید (مرحوم) جب نوائے وقت کے ایڈیٹر تھے تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب خبر بنانے لگتا تھا کہتے تھے میرے پاس آ جاؤ وہ اپنا کام کرتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ رپورٹ کو بھی دیکھتے جاتے تھے، اکثر مجھے ٹوک دیا کرتے تھے یہ کیا لکھا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا پڑھنے والے کی سمجھ میں کیا آئے گا، گویا وہ سکھایا کرتے تھے اس کے علاوہ جو نیوز سینس ہے وہ اخبار کے دفتر میں کام کئے بغیر آ ہی نہیں سکتی یہ نیوز سینس کسی کتاب یا لیکچر سے نہیں آ سکتی، اخبار کے دفتر

Marfat.com

میں بیٹھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ اس سارے واقعہ میں نیوز کیا ہے، مثلاً میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں، میرے ساتھ ہی ڈاکٹر مبشر حسن رہتے ہیں ان کے ہاں بھٹو صاحب کی تقریر تھی، ابھی اس وقت پیپلز پارٹی بنی نہیں تھی بلکہ بن رہی تھی، خواتین کا جلسہ تھا اور ان دنوں بھٹو صاحب سوشلزم کے علمبردار تھے مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب جعلی پروگرام ہے، بھٹو صاحب نے تقریر کے دوران کہا کہ سوشلزم کی پہلی اینٹ پیغمبر اسلام نے رکھی تھی، چنانچہ خبر بناتے بناتے کہیں درمیان میں یہ جملہ میں نے لکھ دیا، ظہور عالم شہید صاحب نے مجھے کہا اٹھ کھڑے ہو اور پھر مجھے کہنے لگے تقریریں تو بھٹو ہر روز کرتا ہے اس تقریر میں خاص بات کیا ہے میں نے کہا ''شہید صاحب یہ تقریر بھی اس کی پہلی تقریروں جیسی ہے''۔ جس پر وہ کہنے لگے، بھٹو کی ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر میں جملہ نیوز یہی ہے جو نوائے وقت کی سپر لیڈ بنا جس پر مولویوں نے بڑے فتوے دیئے، تقریریں کیں اور ہنگامہ آرائی کی، میری بات کا خلاصہ یہی ہے کہ نیوز سینس اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر ہی آتی ہے جو لوگ گھروں میں بیٹھ کر بہت اچھے مضامین لکھ لیتے ہیں وہ کالم نویس کبھی نہیں بن سکتے۔

س: آپ کو کم وبیش چالیس سال کالم لکھتے ہو گئے ہیں ان چالیس سالوں میں آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے قلم اپنے نظریات اور اپنے خیالات سے اس ملک کے سیاستدانوں حکمرانوں اور عوام کی کس حد تک اصلاح کر پائے ہیں ؟

ج: آپ پہلی بات نوٹ کر لیں جو کہ انتہائی بنیادی بات ہے کہ ورکنگ جرنلسٹ پالیسی میکر نہیں ہوتا، وہ اخبار کی پالیسی کا پابند ہوتا ہے اس کی اپنی اس لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں اس لئے وہی چھپے گا وہی کہے گا جو ایڈیٹر یا مالک کہے گا۔ (اب مالک ہوتے ہیں پہلے ایڈیٹر ہوتے تھے) جیسا کہ اب ''جنگ'' ہے ان کا اربوں کھربوں کا کاروبار ہے لہذا مجھے ان کی پالیسی کا پابند رہنا ہے اور اس کے اندر اپنا راستہ نکالنا ہے، گنجائش پیدا کرنی ہے اور لکھنے کا کوئی ایسا سٹائل بنانا ہے کہ ایڈیٹر کو بھی بے وقوف بناؤں حکومت کو بھی بے وقوف بناؤں اور اپنی بات کہہ دوں، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی کی اصلاح کر پایا ہوں مگر اتنی کوشش ضرور کی ہے کہ ایک تو بات صحیح کی جائے کہ اس میں کچھ ایمان کا عمل دخل ہو اور کوئی ایسی بات لکھنی پڑتی ہے جو آپ کے نظریات کے خلاف ہے تو وہ آپ نہ لکھیں خاموشی تو آپ کے اختیار میں ہے نا؟

س: پاکستان سے آپ کی دوستی کم وبیش پچاس سال پر محیط ہے آپ کو اس نے عزت دی شہرت اور نام دیا، آپ نے اپنے اس دوست کو جواب میں کیا لوٹایا ؟

ج: میں نے اس دوست کو جسے پاکستان کہتے ہیں مجھے فخر ہے کہ میں نے آج تک اس کے خلاف ایک لفظ

Marfat.com

نہیں لکھا اور ہمیشہ کوشش کی کہ لوگوں کے دل میں اس ملک کی محبت پیدا ہو مجھے جو فیڈ بیک ملتا ہے اس میں اگر میری کوئی تعریف کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک سے تمہیں بڑی محبت ہے، بھئی ہم تو اس وطن کو محبت ہی دے سکتے ہیں اور جو بدعنوان ہیں ان کی ممکن حد تک مذمت کر سکتے ہیں۔

س: جب آپ نے جرنلزم کا آغاز کیا تو اس کے فوراً بعد ایوب خان کا مارشل لاء آتا ہے آج ہم پھر تقریباً اسی طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں، ہم 50 سال بعد بھی وہیں کے وہیں کھڑے ہیں آخر آپ اس حوالے سے کیا محسوس کرتے ہیں۔؟

ج: ہم نے تقریباً 27 یا 28 سال مارشل لاء کے ساتھ گزارے ہیں اور جب مارشل لاء نہیں ہوتا تھا تو بھی علم تھا کہ جو وزیر اعظم ہے یہ فوج کی حکم عدولی نہیں کرتا یعنی ایک تو مارشل لاء براہ راست ہوا کرتا تھا مگر اب وہ صورت تو نہیں البتہ Indirect مارشل لاء تو یہاں ہمیشہ رہا ہے جس دن ایوب خان باوردی ہو کر کابینہ کے اجلاس میں بیٹھا تب سے اب تک Indirect مارشل لاء تو اس ملک سے اٹھا ہی نہیں۔

س: کبھی ایسا ہوا آپ نے کچھ لکھا ہو اور وہ آپ کیلئے باعث پریشانی بنا ہو۔؟

ج: بات یہ ہے کہ میری تو ملازمت کی حیثیت رہی، اسی لئے پریشانی ایڈیٹر کیلئے ہوتی تھی، نوائے وقت کے پہلے ایڈیٹر (مرحوم) حمید نظامی تھے ان کے بعد مجید نظامی آ گئے، لہٰذا عموماً بات انہی تک محدود رہتی تھی مجھے صرف یہ بتایا جاتا تھا کہ آپ نے جو لکھا ہے اس پر فلاں آدمی نے بڑا اعتراض کیا ہے یا کسی بڑے آدمی نے تعریف کی تو وہ بتا دی مگر ایسا کبھی کبھا ہوتا ہے کہ آپ کی کوئی تعریف کرے اور مالک وہ تعریف آپ تک پہنچا دے ایک خاص بات یہ ہے کہ میں جیل نہیں گیا، صرف سوار خان نے میرے خلاف ایک مقدمہ بنایا تھا مگر اس میں بھی میری ضمانت ہو گئی اور بات ختم ہو گئی، واقعہ کچھ یوں ہوا کہ میں جب ''افریشا'' نکالا کرتا تھا تو اس کا ایڈیٹر اور مالک میں تھا، اسی دور میں سوار خان کا ایک وزیر تھا جس کی فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں تقریر تھی جس میں اس وزیر نے کوئی واہیات گالی نکال دی تھی وہ بھی لڑکیوں کے سامنے، لہٰذا اس تقریر کی جب رپورٹنگ ہوئی تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا، سوار خان نے نقص امن عامہ کے تحت میرے خلاف ایک مقدمہ درج کروایا مگر میری اس میں ضمانت ہو گئی اور اس کے بعد حکومت نے یہ مقدمہ خود ہی واپس لے لیا کیونکہ اس میں جان نہیں تھی۔

س: جس دور میں آپ جرنلزم میں آئے اس دور میں صحافت میں کوئی charm نہیں تھا آج کی طرح جرنلزم کی کوئی لش پش بھی نہیں تھی پھر آپ نے یہ شعبہ کیوں اختیار کیا۔؟

Marfat.com

ج: اس سے پہلے میں جماعت اسلامی کا کارکن تھا اور سیاسی کارکن اور صحافت کا آپس میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے لہذا اس کی وجہ سے سوائے صحافت کے کوئی اور پیشہ میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

س: جامعہ اشرفیہ کے ساتھ بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔؟

ج: مفتی محمد حسن کے ساتھ میرا تھوڑا سا تعلق رہا اور وہ مرحوم و مغفور جب امرتسر سے ہاں تشریف لائے تو میں کچھ عرصہ ان سے پڑھتا رہا، بس وہی تعلق ہے، ویسے جامعہ اشرفیہ سے میرا اس طرح کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

س: مفتی حسن کے ساتھ آپکا ایک شاگرد کی حیثیت سے تعلق رہا۔؟

ج: جی ہاں بالکل اور مجھے اس پر فخر رہا...... مفتی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو پتہ نہیں اب کیوں پیدا نہیں ہوتے، وہ بہت بلند کردار انسان تھے۔

س: آپ نے خود فرمایا اب ایسے لوگ نہیں ہوتے اس حوالے سے میرا سوال ہے کہ جب ہم ماضی کو دیکھتے ہیں اور جیسے جیسے پیچھے چلے جاتے ہیں تو کلاس اور کردار کے حوالے سے بڑے لوگ ملتے ہیں، پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے حصے میں بونے لیڈر کیوں آئے؟

ج: اس کی وجوہات بہت زیادہ ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کمرشل ازم بہت زیادہ آ گیا ہے لہذا جب مادہ پرستی آتی ہے تو مادہ پرستی اور اصول پرستی کبھی دونوں اکٹھی نہیں ہوتیں۔

س: آپ کے جو ہم عصر تھے صحافت کے ساتھی تھے ان میں سے بہت سے مالکان بن گئے مگر آپ ابھی تک قلم کے مزدور ہیں ایسا کیوں ہے۔؟

ج: آپ یہی سمجھیں کہ مجھ میں اہلیت نہیں۔

س: آپ نے ''آواز جہاں'' بھی نکالا تھا اس کا کیا بنا ؟

ج: ''آواز جہاں'' سے پہلے میرا جو افریشیا تھا اس کی اس زمانے میں 70 یا 80 ہزار سرکولیشن تھی یہ بھٹو کے زمانے کی بات ہے مگر جب ضیاء الحق آئے تو انہوں نے سیاست پر پابندی لگادی اور افریشیا میں سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے اسے بند کرنا پڑا۔

س: قادر صاحب آپ نے ایوب خان کو دور دیکھا پھر 71ء کا سانحہ ہوا، ذوالفقار علی بھٹو آئے، ضیاء الحق آئے، نواز شریف اور بے نظیر کی باریاں لگیں پھر پرویز مشرف آئے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ حکمرانوں کی یہ جو ساری چین ہے آپ اس میں کوئی ایسا بندہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس نے پاکستان کو کچھ دیا ہو۔؟

ج: میں اس میں ایوب خان کو ایک مقام دیتا ہوں اگرچہ اس کے گناہ بے شمار ہیں سب سے پہلا گناہ

Marfat.com

تو فوج کو سیاست میں لانا ہی ہے جس کی بعد میں ہمیں بہت سزا ملی مگر ایوب نے اس ملک کی اقتصادی ترقی کیلئے بہت کام کیا اگر اس کا سلسلہ چلتا رہتا اور امریکہ اس کو اجازت دیتا تو ہمارا ملک بہت آگے جا چکا ہوتا، ایوب خان کے بعد جو حکمران آئے ان کا اس ملک کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں ہے بھٹو صاحب جب آئے تو انہوں نے صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر ایوب خان کا تمام اثاثہ تباہ کر دیا اس کے بعد تو آپ کے سامنے ہے کہ کسی نے کوئی بڑا کام کیا ہی نہیں، یہ بڑے لوگ ہوتے ہی نہیں، ان کے ذہن بہت محدود ہوتے ہیں ان سے کسی بڑے کام کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی۔

س: ضیاء الحق کے ساتھ تو آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے ان کو آپ نے کیسا پایا۔؟

ج: وہ نہایت ذہین باخبر تھے جو کرتے تھے انہیں پتہ تھا کہ میں ٹھیک کر رہا ہوں یا غلط کر رہا ہوں وہ کسی غلط فہمی میں نہیں تھے وہ غلطی کرتے تھے تو جان بوجھ کر کرتے تھے یعنی انہوں نے کبھی کوئی کام خوش فہمی میں نہیں کیا، بہر حال وہ بھی فوجی تھے ان میں وہ تمام کمزوریاں اور خامیاں تھیں جو ایک جرنیل یا فوج کے آدمی میں ہوتی ہیں، On the whole فوجیوں نے جتنے بھی کام کئے ہیں وہ سو فیصد ناکام ہوئے ہیں، اب اگر کسی جرنیل کو کسی کاروباری ادارے نے رکھ لیا تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ قابل اور زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے بلکہ اسے کام نکلوانے کیلئے رکھا جاتا ہے کیونکہ جرنیلوں کا اثر ورسوخ تو ہوتا ہے مگر ان جرنیلوں نے خود جو کام کیے اس میں وہ ہمیشہ ناکام رہے، جرنیل جب بھی Competition میں آتے ہیں مار کھا جاتے ہیں کیونکہ ان بے چاروں کو یہ کام آتا ہی نہیں ہے وہ حکومت کرتے ہیں اور ٹریجڈی یہ ہے کہ جب بھی وہ حکومت میں آتے ہیں ہمارے سیاستدان گروہ در گروہ جوق در جوق ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں یعنی حیرت کی بات ہے کہ ایک آدمی جو سیاست کا اور سیاستدانوں کا دشمن ہے یہ اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

س: ہمارے جو کالم نگار ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس کا جتنا بڑا نام ہو اخباری مالکان اس کی اتنی ہی بڑی قیمت لگاتے ہیں ایک ایک اخبار نے آٹھ آٹھ کالم نگاروں کو اپنی گرفت میں رکھا ہوا ہے ان کے ساتھ معاہدہ ہے کہ کہیں جانا بھی نہیں بس کام اتنا ہے کہ پالیسی اور نظریات مالک کے ہیں اور آپ کے قلم کو ان کے اشاروں پر ناچنا ہے۔

ج: میں جب ''جنگ'' میں آیا تو سوال پیدا ہوا تنخواہ کا۔ اس وقت میر شکیل الرحمٰن صاحب لاہور بیٹھتے تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ کے پہلے صفحے پر جو اتنا سا اشتہار چھپا ہے میری اتنی ہی تنخواہ ہوگی، میر شکیل الرحمٰن کہنے لگے ''یہ تو بہت زیادہ ہے'' میں نے کہا کہ نام کے مطابق قیمت لگتی تھی تو آج کے زمانے میں

Marfat.com

کاروباری اداروں میں تنخواہیں لاکھ سے اوپر شروع ہوتی ہیں یا ہزاروں میں پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ اتنی تنخواہیں ہیں، اب تو ملٹی نیشنل کمپنیوں میں تنخواہیں لاکھوں میں شروع ہوتی ہیں جبکہ مراعات اس کے علاوہ ہیں مگر اخباری صنعت میں ہزاروں میں ملتی ہیں۔

س: آپ نے ابتداء میں سیاسی کارکن کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا مگر بعد میں جب آپ کے حکمرانوں اور سیاستدانوں سے تعلقات بنے پھر آپ کو شوق نہیں ہوا کہ الیکشن میں حصہ لے کر عملی سیاست کی جائے ؟

ج: میرا اصل میں الیکشن والا مزاج ہی نہیں تھا، میں تو سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا جیسے دریاں بچھانے والے اور لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنے والے ہوتے ہیں میں تو ایسے کارکنوں میں شامل تھا، حالانکہ میرا ایک بھائی ایم پی اے اور دوسرا ایم این اے تھا مگر میں اس طرف نہیں آیا۔

س: آپ 1955ء سے لے کر 2004ء تک ایک پورے عہد کو جب دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں کیا صحافت میں آپ کے آنے کا فیصلہ درست تھا۔؟

ج: جرنلزم میں آنے کا میرا فیصلہ تو انتہائی درست تھا کیونکہ اس عرصہ میں اس ملک کو کبھی کوئی چین کا لمحہ میسر نہیں آیا، پاکستان جیسے اور جن مقاصد کے تحت بنا تھا اس کے بعد مسلم لیگ کی شروع کی حکومت سے لے کر اب تک اس کے خلاف کام ہوتا رہا اور ہو رہا ہے اب موجودہ حکومت نے تو بالکل ہی یوٹرن لیا ہوا ہے، سیکولرزم کا پرچار کر رہے ہیں ان کے پالیسی میکرز سیکولرزم ذہن کے تھے نواز شریف ذہن کے بغیر تھے، اب تازہ ترین نصاب کا معاملہ ہے لہذا یہ بات ہمارے لئے ایک جدوجہد بن گئی کہ لوگوں کو یہ یاد دلاتے رہیں کہ پاکستان کیا تھا تاہم اطمینان یہ ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

س: آئیڈیل ازم کو اگر آپ ایک طرف رکھ دیں یعنی اگر ہم چاہیں کہ کوئی آئیڈیل لیڈر ہو وہ تو اب ممکن نہیں ہے مگر جو دستیاب لیڈر ہیں ان میں سے ایسا کون ہے جو ملک کی موجودہ صورتحال سے بہتری کی طرف لے جاسکتا ہے۔

ج: اگر میں یہ عرض کروں کہ کوئی بھی نہیں ہے تو غلط نہ ہوگا بلکہ اس وقت تو یہ قوم کسی لیڈر کے انتظار میں ہے سیاست میں ہمارے سامنے جتنے لوگ ہیں جن کے امکانات ہوسکتا ہے لیڈر بننے کے ہوں مگر اس وقت کوئی لیڈر نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کوئی ملک نہیں ہے، یہ پچاس سال پہلے ہی تھا یعنی ہمیں آزادی نہیں ملی بلکہ ہمیں ملک ملا ہے، ہمیں قیام پاکستان کی بات کرنی چاہئے آزادی کی بات نہیں کرنی چاہئے لہذا وہ ملک جس

Marfat.com

کیلئے بنا تھا اور جس کی وجہ سے اسے زندہ رہنا اور جغرافیہ میں مستقل حیثیت حاصل کرنا تھی ہمارے لیڈروں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی چنانچہ کچھ دیر بعد خبر آتی ہے کہ پاکستان کی اتنی عمر ہے، یہ فلاں سال تک رہے گا اتنے سال تک چلے گا اب ہندوستان کے ساتھ ہماری جس طرح سے مصالحت چل رہی ہے یہ تو اور زیادہ خطرناک صورتحال اختیار کر گئی ہے۔

س: ان حالات میں آپ پاکستان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں۔؟

ج: پاکستان کا مستقبل اس کا جغرافیہ اور اس کے حالات ہیں ہندوستان یا امریکہ پاکستان کو کسی قیمت پر ختم کرنا نہیں چاہتے یعنی ہمارے دشمن ہمارا وجود تو برقرار رکھنا چاہتے ہیں مگر بڑا کمزور، ناتواں اور اکڑفوں سے خالی، کیونکہ ہندوستان کیلئے ممکن ہی نہیں کہ وہ اتنے زیادہ مسلمانوں کو سنبھال سکے، ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان اگر اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ سنبھال سکتا ہی نہیں پھر تو اور کئی پاکستان بن جائیں گے، اس لئے پاکستان کے جغرافیائی وجود کو کوئی مزید خطرہ نہیں ہے اور ہم جہاں واقعہ ہیں یہ جگہ ایسی ہے کہ اس کا رہنا بھی بہت ضروری ہے لیکن یہ کہ پوری کوشش ہے جس کیلئے ہمارے حکمران بھی تیار ہیں کہ ہم ایک سیکنڈ ریٹ ملک بن کر رہیں یا تھرڈ ریٹ ملک بن کر رہیں اور ہمارے اوپر امریکہ بٹھا رہے۔

س: اسی تناظر میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے دوست جن کو ہم آپ کی تحریر سے پہچانتے ہیں ان کے ساتھ جو بیت رہی ہے وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ ؟

ج: میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس ملک سے لوگوں کو محبت رہے عبدالقدیر خان بھی بھوپال کے رہنے والے تھے، کراچی سے وہ منتخب ہوئے اس کے بعد باہر چلے گئے پھر وہ یہاں آ گئے، میرا ان سے کسی لحاظ سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا، جیسے عام پاکستانی کو پتہ تھا کہ اس نام کا کوئی آدمی ہے اسی طرح جب ہمیں کوئی اطلاع ملی کہ ہم ایٹم بم کی تیاری کے قریب پہنچ گئے ہیں تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی تعریف میں کالم لکھا جس پر ان کا خط آیا جس کے بعد ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی اور پھر بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں، میری ان سے پہلی ملاقات 1980ء میں ہوئی اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر اب نہیں ہوسکتیں، البتہ اس سے پہلے مہینے میں دو ایک بار میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوسکتا، ان سے محض اس لئے ملنے جایا کرتا تھا کہ انہوں نے اس ملک کی اتنی بڑی خدمت کی ہے کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں ہے، یہ ہے ان سے میرا تعلق، اب جبکہ وہ اندر چلے گئے ہیں میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی دن اور کسی بہانے ان کا ذکر کرتا رہوں کہ اس قوم کا حافظہ بڑا کمزور ہے۔

Marfat.com

س: ڈاکٹر عبدالقدیر کا اس قوم پر جتنا بڑا احسان تھا قوم نے ان کے ساتھ ایسا React نہیں کیا جیسا کرنا چاہیے تھا؟ -

ج: اس میں دو باتیں ہیں، دل سے کچھ ہیں باہر سے کچھ ہیں، جب ڈاکٹر عبدالقدیر کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ ہوا تو پورا پاکستان افسردہ تھا مجھے ایسا کوئی آدمی نہیں ملا جس کے دل میں دکھ نہیں۔ لیڈر شپ چونکہ اس ملک میں نہیں ہے، عوام کو اگر بھوکا مار دیا جائے تو وہ بھوک برداشت کرتے جائیں گے، عوام کو تو لیڈر ہی باہر نکالتا ہے عوام کبھی خود بخود نہیں نکلتے دنیا میں ایسا کہیں نہیں ہوا کہ عوام خود بخود سڑکوں پر نکل آئیں، چونکہ کوئی لیڈر نہیں تھا اس لئے لوگ دکھ برداشت کر گئے وگرنہ قوم کو اس بات کا بہت زیادہ دکھ ہے۔

س: جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر کو جو معافی نامہ پڑھوایا گیا تھا اس کے بعد خطاب نما پریس کانفرنس بھی انہوں نے کی تھی، اس پریس کانفرنس میں جنرل پرویز مشرف نے ڈاکٹر صاحب پر یہ بھی الزام لگایا تھا کہ وہ بڑی بڑی رقمیں ادھر ادھر کرتے رہے ہیں؟

ج: اس میں ایک تو ان کی پارٹی کے لیڈر چودھری شجاعت حسین کے بیان کا حوالہ دوں گا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر پر کسی قسم کا کوئی مالی الزام نہیں ہے اور آج تک چودھری شجاعت نے اپنے اس بیان کی تردید نہیں کی، دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان انتہائی کھلے دل کے انسان ہیں ان کے پاس جو بھی ہوتا ہے وہ دے دیتے ہیں، کتنے انسٹی ٹیوشنز کتنے تعلیمی ادارے اور ڈسپنسریاں ہیں جن کی وہ مدد کرتے ہیں اس لئے عام لوگ بھی انہیں بہت پیسے دیا کرتے تھے جو ان کے ذریعے آگے جاتے تھے، لوگوں نے انہیں اس یقین کے ساتھ بے پناہ پیسہ دیا ہے اور یہ سب کچھ عوام کے سامنے تھا اس لئے انہیں پتہ نہیں تھا کہ کوئی شخص ڈاکٹر عبدالقدیر کی طرح فیاض بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ تو بغیر مفاد کے کسی کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔

س: قادر صاحب! اے کے نیازی نے آپ کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کیا تھا وہ کیا کہانی تھی۔؟

ج: وہ اب دنیا سے چلے گئے چھوڑیں اس بات کو، دراصل اس زمانے میں ایک خبر چھپی تھی کہ ڈیرہ دون کی جو بڑی اکیڈمی تھی اس میں اسکا وہ پستول تھا جو اس نے دیا تھا میں نے اس پر بات کی تھی، ان دنوں نیازی تقریریں وغیرہ کیا کرتا تھا میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ پستول مجھے لا دو جس پر نیازی نے میرے خلاف ایک کروڑ روپے کا ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا، میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے پستول لا دیں میں آپ کو ایک کروڑ روپے دیتا ہوں، میں نے یہ بھی کہا کہ باہر نکلوں گا اور لوگوں سے ایک کروڑ روپے مانگ کر آپ کو ادا کر دوں گا۔

Marfat.com

س: سنا ہے وہ پستول وہاں سے چوری ہو گیا تھا۔؟

ج: وہ چوری ہو یا نہ ہو البتہ وہ ہماری شکست کی علامت تھی ورنہ پستول کیا ہے وہ تو ہر فوجی جرنیل کے پاس ہوتا ہے۔

س: ہمارا تعلق اس نسل سے ہے جس نے 80ء کی دہائی کے شروع میں آپ لوگوں کے کالم پڑھ کر اس سے شعور حاصل کیا اور ہم میں سے بہت سے لوگ آپ کے کالموں سے متاثر ہو کر افغانستان بھی گئے کہ وہاں جہاد ہو رہا ہے اور ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو واپس نہ آ سکی، لیکن اب کہا جا رہا ہے کہ یہ تو امریکہ کی جنگ تھی افغانستان یا پاکستان کی نہیں تھی، سوال یہ ہے کہ ہمارے جو ماہ و سال گم ہو گئے یا ہمارے جو ساتھی گولیوں کا نشانہ بنے ان کا ذمہ دار کون ہے۔؟

ج: میں اس بارے میں چھوٹی سی عرض کرنا چاہتا ہوں آپ ذرا تاریخ کو ذہن میں رکھیں کہ امریکہ دو اڑھائی سال کے بعد اس جنگ میں شامل ہوا ہے، جب روس نے افغانستان پر قبضہ کیا تو اس کا قبضہ افغانستان نہیں تھا بلکہ یہ اس کا پہلا پڑاؤ تھا اور اس نے آگے سمندر تک پہنچنا تھا اور ضیاء الحق نے زندگی میں اگر کوئی کام کیا ہے تو یہی ہے کسی نے کہا کہ اگر روس کو یہاں نہ روکا گیا تو پھر خیر نہیں، چنانچہ ضیاء الحق نے آئی ایس آئی کو خطاب کیا جس کے دفتر میں افغانستان کا نقشہ ہی نہیں تھا اور ان کو کہا کہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور ہمیں روس کی مزاحمت کرنی ہے، افغانوں کو منظم کرنا ہے ان کو تربیت دینا ہے، ہمیں اپنے پاکستانیوں کو بھی تربیت دینا ہے اور روس کو آگے نہیں بڑھنے دینا، جب امریکہ نے دیکھا کہ یہ کام واقعی ہو رہا ہے تو دو اڑھائی سال کے بعد تب انہوں نے پیسے بھی نکالے اسلحہ بھی دیا اور سیاسی امداد بھی فراہم کی، چونکہ جو غالب فریق ہوتا ہے نام تو اسی کا چلتا ہے، لہذا نام امریکہ کا چل گیا جبکہ یہ کام شروع پاکستان نے کیا تھا، ہمیں فائدہ یہ ہوا کہ روس نے جنگ شروع کی امریکہ کا جو واحد مد مقابل تھا وہ ختم ہو گیا، ہم تو ایسی بدقسمت قوم ہیں کہ اتنی بڑی کامیابی کا اقرار کرنے کی ہمت نہیں کر رہے کہ سوویت یونین ہماری وجہ سے تباہ ہوا مگر ہمیں یہ کہتے ہوئے خوف آتا ہے کہ اتنا بڑا کام ہم نے نہیں کیا، حالانکہ ہم نے کیا، مجھے ذاتی طور پر بالکل یقین ہے کہ سوویت یونین کی جو تباہی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ پاکستان تھا۔

س: قادر صاحب! معروف کالم نگاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر کا تعلق ایجنسیوں سے ہوتا ہے جب ملک میں حکومتی یا سیاسی سطح پر کوئی تبدیلی آنے والی ہوتی ہے تو کالم نگاروں کے اطوار بدل جاتے ہیں ان کے کالم آنے والی متوقع تبدیلی کے بڑے واضح اشارے دینے لگتے ہیں، یہ کہاں تک درست ہے کہ

Marfat.com

کالم نگاروں کا تعلق ایجنسیوں سے ہوتا ہے یا ایجنسیاں انہیں رکھواتی ہیں۔؟

ج: اس سلسلے میں دو باتیں عرض کروں گا ، تعلق ہوتا ہوگا میں اس بارے میں کوئی واضح بات نہیں کر سکتا لیکن ایک بات ہمیں ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اخبار نویس کا سب سے بڑا جو اثاثہ ہوتا ہے وہ نیوز کا Source ہوتا ہے اور نیوز کا Source حکمران ہوتے ہیں، خبر حکمران کے پاس ہوتی ہے عوام کے پاس نہیں ہوتی، حکمرانوں سے تعلق اور واسطہ رکھنا ایک اخبار نویس کی ڈیوٹی ہے اگر وہ یہ نہیں کرتا تو وہ نا کام اخبار نویس ہے خبر تو دینی ہے چودھری پرویز الٰہی نے جمالی صاحب نے یا پرویز مشرف صاحب نے مگران سے جب آپ کا رابطہ ہی نہیں ہو تو پھر یہ کون سی اخبار نویسی ہے، حکمرانوں سے رابطہ نہ ہونا ایک اخبار نویس کی Disqualification ہے جس کو کہا جاتا ہے کہ حکمرانوں سے رابطہ شاید عیب کی بات ہے حالانکہ یہ عیب نہیں بلکہ یہ تو اس کی کوالیفیکشن ہے کہ اس کے Source کیا کیا ہیں، دوسرا یہ کہ ان کے کہنے پر کچھ کرنا یا لکھنا اپنے ضمیر کی بات ہے۔

س: بہت سے کالم نگار ہیں جو سابق صدور اور وزرائے اعظموں کی تقاریر لکھتے رہے، کئی ایک وزارتوں سے بھی نوازے گئے آپ کو کبھی ایسی آفر ہوئی ہے۔؟

ج: ضیاء الحق کے ساتھ میرا الگ تعلق رہا ہے، کیونکہ مجلس شوریٰ کے زمانے میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی ان کے ساتھ اسمبلی ہال میں ملاقات کا پروگرام تھا مگر ان کی مصروفیت ایسی نکل آئی کہ انہوں نے صدیق سالک سے کہا کہ عبدالقادر حسن سے کہو کہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو، میں اسلام آباد سے پنڈی تک ضیاء الحق کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا، گاڑی میں جب گفتگو ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں تہجد بھی پڑھتے ہیں نوافل بھی پڑھتے ہیں لہٰذا آپ کی نیکی تو مجھ تک پہنچے گی یہ تو آپ کی نیکی ہے، آپ کی نیکی تو عوام تک پہنچے گی تب ہی نیکی ہے، آپ کی ذات تک رہے گی تو یہ آپ کا اور اللہ کا معاملہ ہے چنانچہ جب ہم گاڑی سے اترے تو صدیق سالک نے کہا یار تم نے پہلی ملاقات میں ہی سارا معاملہ خراب کر دیا ہے، میں نے کہا جناب جب ایک حکمران سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میرا فرض تھا کہ اس موقع پر میں جو بھی غلط یا صحیح سمجھتا تھا اس پر بات کروں، ضیاء الحق کو میری وہ بات زندگی بھر یاد رہی، جب بھی کوئی ایسی بات ہوتی تھی تو مجھے الگ بلا کر وہ بات کرتے تھے انہیں میرے بارے میں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی رائے غلط ہو سکتی ہے مگر یہ جھوٹ نہیں بولتا، چنانچہ مجھے یاد ہے کہ جب انہوں نے جونیجو خان کو وزیر اعظم بنایا تو ضیاء الحق صاحب نے مجھے کہا کہ جونیجو صاحب سے ملوں، مجھے پی آئی ڈی والوں نے کہا کہ ہمیں صرف آپ

Marfat.com

کا نام آیا ہے، چنانچہ میں وہاں گیا اور جونیجو صاحب سے اسمبلی میں ملاقاتیں وغیرہ ہوئیں، کہنے لگے کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کہ پرسوں میں آپ کے ساتھ چین جا رہا ہوں جونیجو صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں آپ یہاں آئے ہیں ایک آدھ دن یہاں رہیں پھر دیکھیں گے، دراصل چین کا دورہ منسوخ ہو گیا تھا مگر انہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا، ضیاء الحق نے جونیجو کو میرے بارے میں اس لئے کہا تھا کیونکہ اس کو صحیح بات بتائے گا، ایک بار جونیجو دور میں مجھے اس قسم کی پیشکش بھی ہوئی تھی جس پر میں نے انہیں کہا تھا کہ آپ کے ساتھ رہ کر نہ مجھے فائدہ ہے نہ آپ کو فائدہ ہے، لہٰذا ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوا ویسے بھی میں توہین سمجھتا ہوں کہ سرکار میں کوئی عہدہ قبول کروں، میں جیسا بھی اخبار نویس ہوں کم از کم وزارتوں کے عہدے سے اپنے آپ سے دور رکھتا ہوں، یہ میری اپنی سوچ ہے خواہ مجھے کوئی چپراسی بھی نہ رکھے وہ ایک الگ بات ہے مگر میں اپنے آپ کو وزیروں سے دور رکھتا ہوں یعنی یہ وزیر ہیں کہ میں ان میں شامل ہو جاؤں یہ تو میری توہین ہے میری انسلٹ ہے۔

س: بہت سے کالم نگار اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں مگر وہ بہرحال کالم نگار ہیں میرا سوال یہ ہے کیا ایک کالم نگار کیلئے معقول تعلیم کا ہونا لازمی ہے یا ان کیلئے مطالعہ اور مشاہدہ ہی کافی ہے۔

ج: کالم نویسی کیلئے ایم اے، بی اے والی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی اس کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ کالم نویس کو زبان پر عبور ہو، اگر زبان صحیح نہیں ہے یا وہ ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا جس میں وہ اپنا مافی ضمیر بیان کر سکے ،دوسری خوبی یہ کہ اس کا کوئی اپنا دین ایمان ہونا چاہئے اس کے بغیر کوئی اچھا کالم نویس نہیں بن سکتا اس سے کوئی اتفاق کرے یا اختلاف کرے مگر اس کا ایک تعارف ہونا ضروری ہے لوگ کہیں کہ یہ اس مزاج اور ان نظریات کا بندہ ہے، ہمارے ہاں ایسے کالم نگار بھی ہیں جو وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کے دفتر میں بیٹھ کر کالم لکھتے ہیں اب وہ کیا لکھیں گے، گورنر صاحب کے ساتھ میں ایک بار گیا تھا، صبح نو بجے تیار ہو کر گورنر ہاؤس پہنچنا یعنی ہیلی کاپٹر کے ہنگامے میں جانا میرے نزدیک ناجائز کام ہے۔

س: والدین آپ کو کیا بنانا چاہتے تھے مگر آپ کیا بن گئے۔؟

ج: میری والدہ تو ان پڑھ خاتون تھیں، میرے والد بھی اس لحاظ سے ان پڑھ تھے، میں ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، رئیس کا مطلب یہ نہیں کہ روپے پیسے والا یعنی اپنے علاقے میں جو سرکردہ شخصیت تھی میں ان کا بیٹا ہوں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے بھائی ایم این اے اور ایم پی اے بھی رہے، ہماری زمین وغیرہ بھی ہے میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا والد مجھے عالم دین بنانا چاہتے تھے مگر میرے بچپن میں ہی والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

Marfat.com

س: آپ کی کالم نگاری کو آپ کے بیوی بچے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔؟

ج: بیوی بچے میری کالم نگاری کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ میرے کالم لکھنے سے ان کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

س: آپ کی شریک حیات سے آپ کی مزاج شناسی یا ذہنی ہم آہنگی کا کیا عالم ہے۔؟

ج: ٹھیک ٹھاک ہے بلکہ میرے کالم وہی سنبھال کر رکھتی ہے بلکہ ایک دن میں نے کچھ بوریاں دیکھیں تو اس نے کہا اسمیں تمہارے کالم پڑے ہیں۔

س: اپنے کام سے تو آپ کا عشق نظر آتا ہے کیا ویسے کبھی عشق کیا۔؟

ج: کون آدمی ہے جو عشق نہیں کرتا، کبھی میں بچہ تھا پھر جوان ہوا، خوبصورت لڑکیاں بھی دیکھیں پھر کسی سے تعلق کامیاب یا ناکام...... بے شک زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا ہے میری زندگی کوئی ایسی پاکباز نہیں ہے کہ میں کہوں توبہ توبہ۔

س: عشق اور محبت میں شادی ہوتی ہے۔؟

ج: اگر ہو جائے تو ہو جائے......میرا تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے، میری شادی میں جو عشق محبت تھا وہ شادی سے پہلے ہی تھا۔

س: آپ اپنے علاوہ کس کو بڑا کالم نگار مانتے ہیں۔؟

ج: پہلے تو ایک مشفق خواجہ ہوا کرتے تھے وہ بلاشبہ بڑا ماہر انسان تھا مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا، انہوں نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے ان دنوں عباس اطہر کالم لکھتا ہے جبکہ دوسرے مضامین لکھتے ہیں، میں خود آدھے مضامین اور آدھے کالم لکھتا ہوں۔

س: آپ کے نزدیک کالم نویس کی تعریف کیا ہے۔؟

ج: یہ بڑا مشکل ہے جب میں نے کالم نویسی سیکھی تو میں ایک رپورٹر تھا، مگر جب کالم نگاری شروع کی تو کالم نگار کے طور پر بہت سے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑا، کالم کی زبان وہ ہونی چاہیے جو دوسروں کو باآسانی سمجھ آجائے بلکہ زبان تو وہ ہونی چاہیے جو ان پڑھ بھی سمجھ سکے اگرچہ میں عربی اور فارسی کا ٹھیک ٹھاک طالب علم ہوں اور دونوں زبانیں مجھے معقول حد تک آتی ہیں لیکن کالم لکھتے وقت میں کوشش کرتا ہوں کہ اردو زبان کو آسان ترین الفاظ میں بیان کروں، جہاں تک مزاج کا تعلق ہے تو یہ صرف لطیفہ ہی نہیں ہوتا لطیفہ تو کسی اور کا بنا ہوا ہوتا ہے، دراصل عبارت میں شگفتگی اور تازگی ہونی چاہیے۔

Marfat.com

س: آپ گھریلو معاملات میں کس حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔؟

ج: میں نے اپنی زندگی بڑی محدود رکھی ہے، میرا حلقہ احباب بڑا محدود ہے میں غمی یا خوشی کے موقع پر ہی آتا جاتا ہوں اب تو تقریباً میں کہیں بھی نہیں جاتا، محدود سی زندگی گزارتا ہوں زیادہ تر وقت آپ مجھے گھر پر ہی پائیں گے، دوپہر بارہ سے دو بجے تک آواری میں ہماری ایک نشست ہوتی ہے وہاں سارے دوست احباب اکھٹے ہوتے ہیں یا پھر میں جم خانہ کلب میں چلا جاتا ہوں اس طرح آؤٹنگ ہو جاتی ہے یا کافی عرصہ بعد منصورہ گیا جہاں قاضی صاحب کی تقریب حلف برداری تھی، میری فیملی لائف ٹھیک ٹھاک اور پرامن ہے، میرے دو بچے ہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے، بیٹا پی آئی اے میں ملازم ہے جبکہ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اس کا میاں ڈاکٹر ہے۔

س: آپ کے تو ہزاروں لاکھوں پرستار ہیں آپ کا آئیڈیل کون ہے۔؟

ج: میری آئیڈیل شخصیات دو ہی ہیں ایک مولانا مودودی اور دوسرے ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

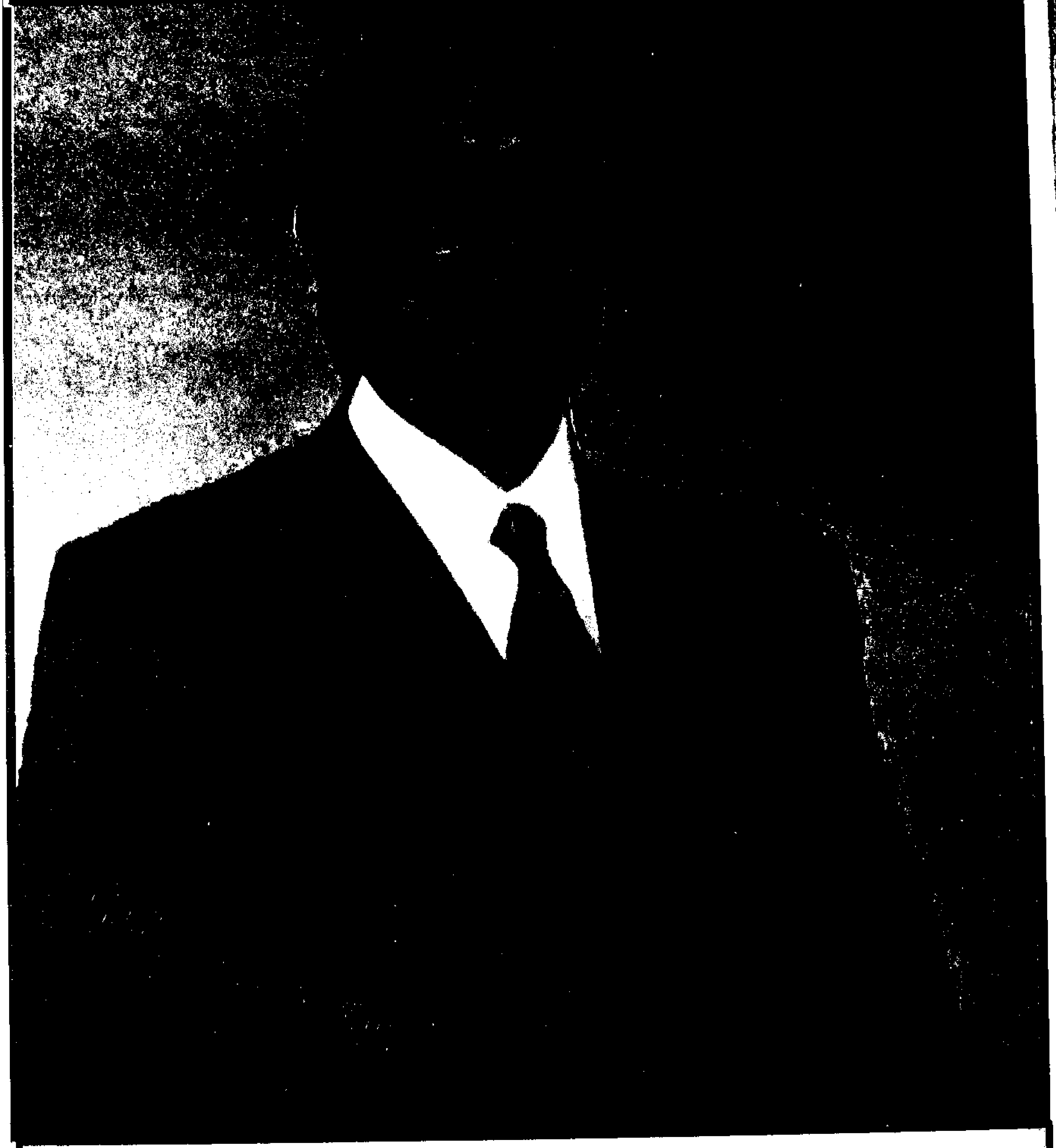

Marfat.com

Marfat.com

صدر پرویز مشرف محبّ وطن پاکستانی ہیں

ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر صفدر محمود ایک ایسے قومی دانشور اور محقق ہیں، جن کو تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان پر ایک اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، انہوں نے اپنی متعدد کتابوں میں تحریک پاکستان کے قائدین کے کردار، نظریات اور جذبات کے بارے میں حقائق کی روشنی میں جو کچھ تحریر کیا ہے اسے تاریخ اور سیاست کے طالب علم ایک مستند حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں، اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے بیوروکریسی میں بھی 39 برس گزارے ہیں مگر ان کی سوچ کا مرکز پاکستان اور اس کی ترقی وخوشحالی رہا ہے، قائداعظمؒ سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ دوران انٹرویو قائداعظمؒ کے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی آنکھوں کی نمی کوشش کے باوجود نہ چھپا سکے، قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان کے حوالے سے ان سے جو گفتگو ہوئی وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

س: آپ کی تاریخ پر گہری نظر ہے، آپ نے اس ملک کی تاریخ بنتے اور بگڑتے بھی دیکھی، اس کے علاوہ بطور بیوروکریٹ، آپ مختلف حکومتوں کے رازدان بھی رہے، میرا سوال یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے حوالے سے بعض قومی شخصیات جنہیں تاریخی اور نصابی کتب میں ہیرو بنا کر پیش کیا گیا، اب بعض مؤرخین اس کے برعکس حقائق پیش کر رہے ہیں، ان میں ایک نام چوہدری رحمت علی کا بھی ہے، جنہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا،

Marfat.com

ابھی حال ہی میں جب ان کا جسد خاکی پاکستان لانے کی خبر آئی تو چند شخصیات نے اس کی مخالفت کی، بطور تاریخ دان آپ اس سارے معاملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: آپ کے سوال سے جو میں سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ آپ چوہدری رحمت علی کے جسد خاکی کو پاکستان لانے کے بارے میں بات کر رہے ہیں، آپ کا سوال یہ ہے کہ ان کے جسد خاکی کو پاکستان لایا جائے یا نہیں۔ نیز یہ کہ تحریک پاکستان سے اس کا کیا حوالہ بنتا ہے، رہی بات اتھارٹی کی تو ایسا بالکل نہیں ہے میں تو تحریک پاکستان کا ایک ادنیٰ سا کارکن ہوں، سرکاری ملازمت کی وجہ سے مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ میں اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا سکوں، جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق ہے تو میری 39 سالہ سروس میں چند ایک برس الجھے ہوں گے کہ مجھے حکومتوں کے اندرونی معاملات کا پتہ چلا ہوتا یا ایک آدھ حکمران ایسا رہا ہوگا جس کے بارے میں مجھے کچھ ذاتی باتوں کا علم ہوگا، مجموعی طور پر میں نے اپنے آپ کو حکومتوں سے بہت دور رکھا میں ایسا Insider نہیں رہا کہ مجھے ان کے اندرونی معاملات کا علم ہو سکے۔ اب ہم چوہدری رحمت علی کی طرف آتے ہیں کہ جس بارے میں آپ نے کہا کہ ہم نے نصابی کتب میں ان کے بارے میں پڑھا لکھا اور جبکہ تاریخ کچھ اور بیان کر رہی ہے، جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے نام کا خالق چوہدری رحمت علی ہی بنتا ہے میں نے اس معاملے کو بڑی تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ یہ جو نام لیا جاتا ہے کہ کیمرج میں ان کے ساتھ خواجہ عبدالرحیم تھے اور وہ ایک شام سیر کر رہے تھے، میں یہ بات اس لئے کر رہا ہوں کہ پچھلے دنوں ڈاکٹر جہانگیر خان کا کوئی حلفیہ بیان کسی اخبار میں پڑھا ہے جو ان کے انتقال کے چودہ پندرہ برس بعد چھپا ہے، اس میں ڈاکٹر جہانگیر نے حلفیہ بیان میں کہا ہے کہ میں وہاں موجود تھا اور یہ بات خواجہ رحیم نے خود تجویز کی تھی، جو (ڈاکٹر جہانگیر خان) چوہدری رحمت علی اور اسلم خٹک ایک شام کر رہے تھے، ڈاکٹر جہانگیر بھی خواجہ عبدالرحیم کو کریڈٹ دیتے ہیں، ان سے میری خاصی ملاقاتیں بھی رہی ہیں، میں نے ان کے منہ سے اس بارے میں آج تک کوئی بات نہیں سنی، حالانکہ انہوں نے کیمبرج کے زمانے کی، قائداعظم اور لیاقت علی خان دور سے متعلق بے شمار باتیں کیں مگر انہوں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا کہ پاکستان کا نام انہوں نے تجویز کیا تھا، میری سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آ رہی جو اسلم خٹک نے اپنی کتاب میں کہی ہے کہ پاکستان کا نام انہوں (اسلم خٹک) نے تجویز کیا تھا۔

خواجہ عبدالرحیم کے بارے میں ڈاکٹر جہانگیر کہتے ہیں کہ یہ نام انہوں نے تجویز کیا تھا، وہ کہتے ہیں کہ یہ بات انہوں نے علامہ اقبال کو بتائی تھی، اگر یہ بات علامہ اقبال کو بتائی گئی تھی تو اس بارے میں کئی حوالوں سے

Marfat.com

جو میں نے پڑھی ہے کہ چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور چند دوست علامہ اقبال سے ملنے گئے، یہ لوگ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں گئے ہوئے تھے، وہاں انہوں نے علامہ اقبال سے کہا کہ ہمارے ذہن میں اس قسم کا نام آرہا ہے، بقول ان کے ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان سے یہ کہا کہ آپ اس لفظ کے تمام حروف کو الگ الگ لکھ کر میرے بیڈروم میں رکھ دیں، یعنی پاکستان کا ''پ'' وغیرہ، میں ان پر غور کروں گا، یہ دوست کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ تمام الفاظ لکھ کر علامہ اقبال کے بیڈروم میں رکھ دیئے۔

اب اس بارے میں علامہ اقبال نے کس رائے کا اظہار کیا، اس حوالے سے کچھ نہیں کہتے تاہم وہ یہ کہتے ہیں کہ جب علامہ اقبال کو یہ نام تجویز کیا گیا تو بہرحال انہوں نے اسے پسند کیا، انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس نام پر مزید غور کریں گے، مگر مزید غور کرنے کے بعد ان لوگوں نے کیا کہا، اس بارے میں یہ لوگ کچھ نہیں کہتے، البتہ ''لندن ٹائم'' میں علامہ اقبالؒ کا ایک خط چھپا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ ''پاکستان'' کی سکیم کا مصنف یا آرکیٹیکٹ میں نہیں ہوں، علامہ اقبال اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کیونکہ وہ کیمبرج کے سٹوڈنٹ کی ایک تجویز تھی، لندن میں جو گول میز کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی کہا گیا تھا کہ یہ تجویز مسلم لیگ کی نہیں بلکہ کیمبرج کے طالب علموں کا ایک خیال ہے اور یہ بات اس اعتبار سے درست ہے کہ اس وقت تک یہ مسلم لیگ کی تجویز بھی نہیں تھی۔ یہ تو سابق طالبعلموں کی تجویز تھی اور اس بارے میں انہوں نے ایک پمفلٹ بھی شائع کیا تھا۔

چوہدری رحمت علی نے پارلیمنٹ کے تمام ارکان کو اس پمفلٹ کی کاپیاں بھی بھجوائیں، وہ آدھی آدھی رات کو جا کر دیوانوں کی طرح لیٹر بکس میں خط پوسٹ کرتا رہتا تھا، بعض اوقات ایک لیٹر بکس بھر جاتا تھا تو دوسرے لیٹر بکس میں پمفلٹ پوسٹ کرنے چلا جایا کرتا تھا۔ اس سارے پس منظر کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کا نام پہلی بار چوہدری رحمت علی نے ہی تجویز کیا تھا مگر ڈاکٹر جہانگیر خان کی وفات کے چند برس بعد ان کا جو حلفیہ بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان کا نام خواجہ رحیم نے تجویز کیا تھا، خواجہ رحیم نے اگر یہ نام تجویز کیا تھا تو ان کا پچھلے دنوں انتقال ہوا تھا، میں ان کی نماز جنازہ میں بھی شریک ہوا، سوال یہ ہے کہ اگر خواجہ رحیم نے نام تجویز کیا تھا تو وہ اتنی دیر خاموش رہے لیکن اگر آپ چوہدری رحمت علی کی کتاب Now or Never پڑھیں تو وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے تو تجویز پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں علامہ اقبال کو اپنا ذہنی مرشد مانتا ہوں، جبکہ عقیدت کے لحاظ

Marfat.com

سے قائداعظم کو اپنا سیاسی مرشد مانتا ہوں، لہٰذا ہر وہ شخص جو قائداعظمؒ کی ذات سے گستاخی کرتا ہے اس کو میں عزت واحترام نہیں دے سکتا، اسے آپ میری مجبوری کہہ لیجئے، قائداعظم اور علامہ اقبال کے بعد باقی شخصیات تو چھوٹی چھوٹی لگتی ہیں، ان کا وہ قد ہی نہیں ہے۔

ایک بات میں اور کہنا چاہوں گا کہ جب چوہدری رحمت علی کو حضرت قائداعظمؒ سے اختلاف ہوا تو انہوں نے جو کتابچہ لکھا اس میں انہوں نے قائداعظمؒ پر غداری کا الزام لگایا، وہ میرے نزدیک ایک انتہائی غلط حرکت تھی، ایک غیر مہذب حرکت تھی، سیاست میں اختلافات ہوتے رہتے ہیں مگر انہیں قائداعظمؒ کی ذات، ان کی قیادت اور شخصیت کو پہچاننا چاہیے تھا، مسلم لیگ میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنہیں قائداعظمؒ کی پالیسیوں سے کچھ اختلاف تھا، مگر انہوں نے چوہدری رحمت علی کی طرح ان پر غداری کا الزام تو نہیں لگایا، یہ بہت بڑا ظلم اور چوہدری رحمت علی کی بڑی غلطی اور بچگانہ حرکت تھی۔ میں چوہدری رحمت علی کا اس حد تک قائل ہوں کہ انہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا مگر اس کے بعد وہ پٹری سے اتر گئے۔

س: قائداعظمؒ کا پاکستان کسی نہ کسی نے تو توڑا، مگر یہ بات جن پر الزام ہے انہوں نے نہ کبھی تسلیم کی اور نہ ہی ان کی اولادیں انہیں تسلیم کرتی ہیں، پچھلے دنوں یحییٰ خان کے بیٹے نے بھی اپنے والد کی ڈائری سے کچھ حوالہ جات پیش کئے تو جس میں یحییٰ خان کو اسی سلسلے میں بالکل معصوم قرار دیا گیا تھا، آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے، کیا ایک نظریاتی ریاست کو کوئی فرد واحد دولخت کر سکتا تھا؟

ج: میں نے تو اس موضوع پر بڑی تحقیق کر کے ایک کتاب لکھی ہے، اس موضوع کو چند الفاظ میں مکمل نہیں کیا جا سکتا، مگر میں اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ جب اس قسم کا سانحہ ہوتا ہے تو یہ چند برسوں کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے ایک لمبی تحریک ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا جو احساسِ محرومی تھا، اسی نے بالآخر بنگلہ دیش کی صورت اختیار کی، آپ کو یاد ہوگا کہ خواجہ ناظم الدین سے محمد علی بوگرہ تک کمیٹیوں کی جتنی بھی رپورٹیں آئیں، ان میں جھگڑا یہی تھا کہ مشرقی پاکستان ایک اکثریتی صوبہ سے اسے حکومت دی جائے، جبکہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے، اس سے پہلے انہیں ہر کام میں نمائندگی اور حصہ ملتا تھا، مگر جب خواجہ ناظم الدین کو غلام محمد نے ڈس مس کیا تو مشرقی پاکستان میں ردعمل یہ ہوا کہ ایک پنجابی کو ہمارے وزیراعظم نے بلاوجہ نکال دیا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے وہ اکثریتی ووٹ لے کر اسمبلی میں آیا تھا اور بجٹ بل پاس کروایا تھا۔ لہٰذا اس کو بلاوجہ نکال دینے سے مشرقی پاکستان میں احساس محرومی پیدا ہوا مگر یہ کریڈٹ چوہدری محمد علی کو جاتا ہے کہ انہوں نے ون یونٹ

Marfat.com

Create کر کے 1956ء میں آئین بنالیا، جسے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں حصوں نے قبول بھی کرلیا، اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ جب ایوب خان نازل ہو گئے تو مشرقی پاکستان میں احساس محرومی شدت اختیار کر گیا اور بنگالیوں کو یقین ہو گیا کہ فوج آنے کے بعد ان کا کبھی پورے پاکستان پر حکومت کرنے کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا پھر انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اگرتلہ سازش کیس میں اندر دے دیا، اس وجہ سے بنگالیوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو گئیں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس قوم پر بھی مارشل لاء آئے گا، وہاں کچھ طبقوں میں احساس محرومی کا ہونا ایک قدرتی بات ہے، ایوب خان کے بعد یحییٰ خان تشریف لے آئے، ایوب خان نے اپنا جو سکور بنایا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ون یونٹ والا سسٹم رکھا مگر یہ سب کچھ مصنوعی تھا جس میں لوگوں کی شرکت کا کوئی حصہ نہیں تھا کیونکہ اس وقت صحیح جمہوریت تو تھی نہیں ورنہ شاید بنگالیوں کی احساس محرومی کم ہو جاتا۔

ایوب خان کے بعد یحییٰ خان آ گیا، وہ ایک ایسا حکمران تھا جس کی عوام میں مقبولیت تھی اور نہ ہی اسے سیاست کی سمجھ تھی، شراب نوشی اس کا سب سے بڑا مشغلہ تھا، الیکشن اس نے اس وجہ سے کروائے کہ کسی جماعت کو واضح اکثریت نہیں ملے گی اور وہ کمزور سا وزیراعظم بنا کر خود ملک کا صدر بنا رہے گا مگر جب یحییٰ خان کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا اور اس سے صورتحال نہیں سنبھل سکی تو مشرقی پاکستان آپ کے ہاتھ سے الگ ہوا، بنگلہ دیش بن گیا، لہٰذا اس میں بہت بڑا کنٹری بیوشن یحییٰ خان کی نالائقی کا تھا، اس شخص میں اتنی بصیرت ہی نہیں تھی کہ وہ یہ سوچ سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، وہ یہی کہتا رہا کہ چین ہمیں بچا لے گا، فلاں ملک بچا لے گا مگر ایسا نہیں ہوا، مگر اس کے باوجود وہ لوگوں کو غلط خواب دکھاتا رہا وہ نااہل آدمی تھا جس کی وجہ سے یہ سارا ڈرامہ ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سقوط ڈھاکہ میں یحییٰ خان کا مرکزی رول ہے اگر اس کی جگہ کوئی سیاستدان ہوتا تو وہ اس ملک کو بچا لیتا۔ یہ ملک آرمی نے توڑا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ فوج کو جاتا ہے کیونکہ سیاست کرنا فوج کے بس کا روگ نہیں، فوج جب بھی تشریف لاتی ہے ملک کو نقصان ہی پہنچتا ہے۔

س: اب یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے آپس میں کچھ اختلافات تھے، جن کا تذکرہ ان کے ذاتی معالج کرنل الٰہی بخش کی کتاب کے دو ابواب ہیں جن پر حکومت وقت نے پابندی عائد کر دی تھی۔

ج: یہ بڑی دردناک بات ہے مگر میں نے اس پر جو تحقیق کی ہے یا جو بات سنی ہے، آج اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے مگر چند سال بعد شاید اس کی تصدیق بھی نہ ہو سکے، کیونکہ جب تاریخی شواہد نہیں ملتے تو ان کی تصدیق

Marfat.com

بھی نہیں ہوسکتی، کرنل الٰہی بخش کی کتاب کے دو ابواب والی بات تو محض ایک افسانہ لگتی ہے۔ ان کے بیٹوں کا بھی ایک انٹرویو آیا تھا، ان سے پوچھا گیا ہے کہ اگر وہ دو ابواب موجود ہیں تو انہیں منظر عام پر لائیے اگر وہ اس وقت نہیں چھپ سکتے تھے تو دس پندرہ برس بعد تو چھپ سکتے تھے۔ ابوالکلام آزاد اگر کوئی باب یا سو صفحات لکھ کر چھوڑ گئے تھے تو وہ چھپ گئے تھے۔ اگر کرنل الٰہی کا کچھ لکھا ہوتا تو وہ بھی چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا، عقل و فہم یہ کہتی ہے چونکہ وہ لیاقت علی خان کا دور تھا اس لئے ہوسکتا ہے کہ کرنل الٰہی بخش کی کتاب کی ایڈیٹنگ کی گئی ہو یا اس کے کچھ حصے نکالے گئے ہوں، یہ بالکل ممکن ہے، اب میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں، آپ میری یہ بات غور سے سنیں، ظاہر ہے جب پاکستان بنا تو میری عمر تین چار برس تھی، حتیٰ کہ مجھے زیارت کا بھی پتہ نہیں تھا، مجھے یہ بھی علم نہیں کہ قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان کے تعلقات خراب تھے یا نہیں، لیکن میں نے جو تحقیق کی ہے وہ پیش کئے دیتا ہوں، وہ ماضی کی کچھ باتیں ایسے ہوں گی، جو اس وقت قوم کے سامنے نہیں ہیں، لیکن میری خواہش ہے کہ قوم کو ان باتوں کا پتہ چلنا چاہیے، آپ ایک بات یاد رکھیں کسی حاکم یا کسی گورنر جنرل کے جو سب سے قریب حتیٰ کہ بیوی سے بھی قریب ہوتا ہے وہ اس کا اے۔ ڈی۔ سی ہوتا ہے، وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو اس کی زندگی کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے، قائداعظم کے اے۔ ڈی۔ سی بریگیڈیئر نواز حسین زندہ ہیں، وہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں اور پنڈی میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے بات کر کے دیکھئے ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں اور نہ ہی لیاقت علی خان سے ان کی کوئی رشتہ داری ہے کہ وہ ان کا دفاع کریں گے۔

وہ سچ بولتے ہیں اور صرف آنکھوں دیکھی بیان کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ لیاقت علی خان کے قائداعظمؒ سے کوئی اختلافات نہیں تھے، یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں، دراصل لیاقت علی خان کی مخالف لابی نے یہ باتیں مشہور کی تھیں، وہ بتاتے ہیں کہ لیاقت علی خان نے جب قائداعظم سے زیارت میں ملاقات کا وقت مانگا تو میں (اے ڈی سی) نے قائداعظمؒ سے جا کر اس کی اجازت طلب کی۔ قائداعظم نے فرمایا کہ آپ لیاقت علی خان کو وقت دیں اور انہیں بلائیں۔ لہٰذا میں نے قائداعظمؒ سے **Approval** لینے اور محترمہ فاطمہ جناح کو بتانے کے بعد لیاقت علی خان کو اس بارے میں اطلاع دی، اب جو بات میری سمجھ میں آئی ہے جس کی میں نے تحقیق کی ہے، وہ یہ ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان کے درمیان کچھ **Bitterness** تھی۔

محترمہ فاطمہ جناح لیاقت علی خان کو کسی وجہ سے ناپسند کرتی تھیں، لوگ بتاتے ہیں کہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان میں خراب تعلقات کی وجہ بیگم رعنا لیاقت علی خان تھیں، رعنا لیاقت علی اور محترمہ فاطمہ جناح کی

Marfat.com

آپس میں نہیں بنتی تھی، اس طرح کے سینکڑوں واقعات میں نے سیاستدانوں سے بھی سنے ہیں مثلاً مجھے سندھ کے ایک سیاستدان نے بتایا کہ ایک بار انہوں نے دعوت کی تھی، ایک بہت بڑا کھانا تھا، اس دعوت میں لیاقت علی خان نے بطور وزیر اعظم شرکت کی، رعنا لیاقت علی خان بھی موجود تھیں، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ فاطمہ جناح نے رعنا لیاقت علی خان کے ہاتھ سے کیک لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس قسم کے واقعات اس امر کا ثبوت ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح رعنا لیاقت علی خان کو ناپسند کرتی تھیں، جن کی میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، اس وجہ سے محترمہ فاطمہ جناح کو لیاقت علی خان سے بھی کچھ اختلافات تھے۔

اب بریگیڈیئر نور حسین کہتے ہیں کہ بطور اے ڈی سی تو قائداعظمؒ میں زیارت میں ان کے ساتھ تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے سامنے ہے، مجھے جب چوہدری محمد علی کی درخواست آئی جو اس وقت سیکرٹری جنرل تھے، انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان بابائے قوم سے ملنا چاہتے ہیں، لہٰذا میں اندر گیا اور قائداعظمؒ سے پوچھا کہ لیاقت علی خان ملاقات کرنا چاہتے ہیں، بقول اے ڈی سی نور حسین قائداعظم نے لیاقت علی خان کی آمد میں اس قدر دلچسپی لی کہ جس دن انہوں نے آنا تھا، قائداعظمؒ نے مجھے صبح پوچھا کہ آپ نے لیاقت علی خان کے کھانے کا کیا انتظام کیا ہے اور مینو کیا ہے۔ نور حسین کہتے ہیں کہ اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ قائداعظمؒ نے خود لیاقت علی خان کے کھانے کا مینو Approve کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ قائداعظمؒ کے دِل میں قائد ملت کے لئے کتنی محبت تھی، اے ڈی سی کہتے ہیں کہ چوہدری محمد علی اور لیاقت علی خان دونوں اکٹھے آتے۔ میں نے قائداعظمؒ کے Behalf انہیں خوش آمدید کہا، وہ میرے ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے اندر جا کر قائداعظمؒ کو اطلاع دی کہ چوہدری محمد علی اور لیاقت علی خان تشریف لاتے ہیں، اب آپ نوٹ کرلیں کہ یہ واقعہ وہ شخص بتا رہا ہے جو عینی شاہد ہے اور جس کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ یہ بات تو درحقیقت قوم کی امانت ہے جو وہ قوم کو بتا رہا ہے مگر قوم ایسی ہے کہ اصل بات پر یقین نہیں کرتی البتہ افواہوں پر کان دھر رہی ہے۔

اے ڈی سی نور حسین کہتے ہیں کہ جب میں نے اندر جا کر قائداعظمؒ کو اطلاع دی کہ لیاقت علی خان تشریف لائے ہیں تو قائداعظمؒ نے فرمایا آپ فوری طور پر لیاقت علی خان کو اندر لایئے۔ قائد کے اے ڈی سی کہتے ہیں کہ جب میں لیاقت علی خان کو لے کر اندر گیا تو قائداعظمؒ نے اپنی تمام تر جسمانی کمزوری کے باوجود بستر پر لیٹے لیٹے تھوڑا سا اوپر ہاتھ اٹھا کر اور مسکرا کر لیاقت علی خان کا استقبال کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے علالت اور کمزوری کے باوجود ایسا کیا، قائداعظمؒ نے ملاقات

Marfat.com

کے آخری لمحات میں چوہدری محمد علی کو بھی اندر بلالیا تھا، اے ڈی سی نور حسین کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ سے ملاقات کے بعد لیاقت علی خان اور چوہدری محمد علی میرے پاس آئے اور قائداعظمؒ کے Approved کردہ مینو کے مطابق ان لوگوں نے کھانا کھایا، کھانے میں مادرِ ملت بھی تھیں، بریگیڈیئر نور حسین بطور اے ڈی سی شریک تھے، چوہدری محمد علی اور لیاقت علی خان بھی تھے، ان چاروں افراد نے مل کر کھانا کھایا۔ اے ڈی سی نور حسین کہتے ہیں کہ کھانے کے دوران ان کے سامنے کی یہ بات ہے کہ لیاقت علی خان نے چوہدری محمد علی سے کہا کہ خواجہ ناظم الدین سے یہ کہیں کہ وہ ان سے فوراً ملیں۔ خواجہ ناظم الدین اس وقت مشرقی پاکستان کے وزیراعلیٰ تھے، انہوں نے کہا کہ بطور سیکرٹری جنرل چوہدری محمد علی کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ اے ڈی سی کے بقول لیاقت علی خان نے ان کے سامنے چوہدری محمد علی سے کہا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے بھی کہیں کہ وہ کراچی میں Available رہیں۔ اب اے ڈی سی کہتے ہیں کہ جب میں گہرائی میں جا کر سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ نے اپنی اس ملاقات میں لیاقت علی خان کو یہ دونوں ہدایات دی تھیں، یعنی اپنی نماز جنازہ کے لئے بھی انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام تجویز کیا تھا، کیونکہ قائداعظمؒ کو پتہ تھا کہ اب وہ چند روز کے مہمان ہیں، لہٰذا انہوں نے قوم کے وزیراعظم سے جو ان کا ساتھی تھا، راز میں یہ بات کہی کیونکہ مادرِ ملت تو اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھیں۔

اے ڈی سی نور حسین کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ سب باتیں اپنے کانوں سے سنیں، شاید جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شاید وہیں سے انہوں نے خواجہ ناظم الدین اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو بھی فون کیا کہ آپ Available رہیں۔ یہ سب باتیں تو بقول نور حسین ان کے سامنے ہوئیں، لہٰذا جب چوہدری محمد علی اور لیاقت علی خان چلے گئے تو اس بارے میں محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، جس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو لیاقت علی خان کا آنا اچھا نہیں لگا تھا، فاطمہ جناح یہ کہتی ہیں کہ جب وہ قائداعظمؒ کے کمرے میں گئیں تو وہ خاصے تھکے ہوئے تھے، اس موقع پر قائداعظمؒ نے لیاقت علی خان کے بارے میں کہا کہ وہ شاید یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں کتنے دن زندہ ہوں۔

اُپل صاحب ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اس بارے میں جب بریگیڈیئر نور حسین سے پوچھا تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اے ڈی سی کہتے ہیں کہ وہ خود چوہدری محمد علی کو لے کر آئے ہیں۔ میں نے خود سارے معاملات دیکھے اور ان کو رخصت کیا، بطور طالب علم تاریخ کے اس واقعہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ لیاقت علی خان اس وقت دیکھ رہے تھے کہ قائداعظمؒ کتنے شدید علیل ہیں اور یہ

Marfat.com

زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن زندہ رہیں گے۔تیسری بات یہ کہ آپ کرنل الٰہی بخش کی کتاب پڑھیے کیونکہ اس کھانے میں وہ بھی موجود تھے۔

کرنل الٰہی بخش کا یہ اپنا بیان ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان قائداعظمؒ کی صحت کے بارے میں اس قدر متفکر تھے کہ انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں جس دوائی کی بھی ضرورت ہے یا جس چیز کی بھی ضرورت ہے مجھے بتاؤ، دنیا کے جس خطے سے بھی وہ چیز ملے گی میں تمہیں منگوا کر دوں گا۔

کرنل الٰہی بخش کا بیان ہے کہ کھانے کے دوران تمام وقت وہ ان سے قائداعظمؒ کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہے اور پریشانی کا اظہار کرتے رہے۔انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ دنیا کے جس خطے میں بھی اگر کوئی بہترین ڈاکٹر ہو جو قائداعظمؒ کا علاج بہتر کر سکتا ہو تو تم مجھے بتاؤ میں اس کو بلواتا ہوں۔

ندیم صاحب ! غور طلب بات یہ ہے کہ کرنل الٰہی بخش کہہ رہے ہیں کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان قائداعظمؒ کی صحت کے بارے میں متفکر تھے۔اے ڈی سی کہتے ہیں کہ جب وہ لیاقت علی خان کو قائداعظمؒ کے کمرے میں چھوڑ کر آئے تو انہوں نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور بڑی گہری باتیں کیں اور میرا یہ تاثر ہے کہ قائداعظمؒ نے اس ملاقات میں لیاقت علی خان سے کہا ''میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں لہٰذا آپ یہ انتظامات کر لیں۔مثلاً لوگ پوچھتے ہیں کہ خواجہ ناظم الدین کیسے گورنر جنرل بنے؟

وہ کہتے ہیں کہ اس سوال کا سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ قائداعظمؒ نے خود یہ نام تجویز کیا تھا اور بابائے قوم نے لیاقت علی خان کو اپنے ساتھی کے طور پر ہدایات جاری کی تھیں کہ ان کے مرنے کے بعد خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا جائے۔لیاقت علی خان کوئی بیوقوف آدمی نہیں تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی ذہانت دی تھی، وہ بڑے قد آور لیڈر تھے، یہ بات بھی غور کرنے والی ہے کہ لیاقت علی خان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ قائداعظمؒ کس قدر علیل ہیں، اور چند دن کے مہمان ہیں۔لہٰذا اس بات سے لیاقت علی خان کا کیا مفاد تھا کہ قائداعظمؒ کتنے دن زندہ رہیں گے۔وہ قائداعظم تو نہیں بن سکتے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی وزیر اعظم تھے ویسے بھی سارے اختیارات انہی کے پاس تھے۔کیونکہ گورنر جنرل کے پاس اختیارات ہوتے ہی نہیں ہیں، قائداعظمؒ کے پاس اختیارات تو بانی پاکستان کی حیثیت سے تھے، گورنر جنرل کے تو اختیار ہی نہیں ہوتے پھر آخر انہیں کیا پریشانی تھی، کہ وہ یہ سوچتے کہ قائداعظمؒ کتنے دن زندہ رہیں گے، ویسے بھی بابائے قوم اپنی علالت کی وجہ سے معاملات میں کوئی دخل نہیں دے رہے تھے۔نہ ہی وہ لیاقت علی خان کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتے تھے۔بریگیڈیئر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ قائداعظمؒ کی ذاتی ہدایت تھی مگر حکومت کو نہیں بتایا گیا صرف

Marfat.com

قائداعظمؒ کے ملٹری سیکرٹری جو کراچی میں تھے، انہیں بتایا گیا تھا۔ وہ بریگیڈیئر کی سطح کا ٹرینڈ آدمی تھا اس کا فرض تھا کہ وہ ایمبولینس کا انتظام کر لیتا مگر وہ شریف آدمی بیمار اور کمزور سی ایمبولینس لے کر آیا جو راستے میں ہی خراب ہو کر رک گئی۔ اب اس حوالے سے بریگیڈیئر نور حسین اے ڈی سی کا یہ کہنا ہے کہ لیاقت علی خان کو قائداعظمؒ کے دورے کی بروقت اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ یہ نقطہ کمزور ہے کہ گورنر جنرل آ رہا ہو اور وزیراعظم لیاقت علی خان کو اطلاع نہ ہو۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ایمبولینس خراب ہوئی تو لیاقت علی خان کابینہ کی میٹنگ میں تھے اور جب ان کو پتہ چلا کہ گورنر صاحب تشریف لا چکے ہیں تو وہ خود کابینہ کی میٹنگ چھوڑ کر گئے، اس دوران دوسری ایمبولینس آ چکی تھی جس میں قائداعظمؒ کو شفٹ کر کے ہسپتال روانہ کیا گیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو لیاقت علی خان اور حکومت کی کوتاہی کی نشاندہی کرتا ہے اگر قائداعظمؒ کا یہ وزٹ پرائیویٹ بھی تھا پھر بھی لیاقت علی خان کو پتہ تھا کہ قائداعظمؒ کس قدر بیمار ہیں۔ لہٰذا انہیں خود ائیرپورٹ پر آ کر انتظامات کی نگرانی کرنی چاہیے تھی، زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ قائداعظمؒ کو فوری طور پر گورنر جنرل ہاؤس پہنچایا جاتا کیونکہ وہ سخت علیل تھے، مگر لیاقت علی خان وہاں دو تین گھنٹے تو آئے ہی نہیں، یہ وہ باتیں ہیں جو مجھے دکھ اور تکلیف دیتی ہیں مگر میں اسے کوئی سازش قرار نہیں دیتا۔ البتہ جس شخص کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ وہ بیمار ہے اور چند دن کا مہمان ہے، ایسے میں کوئی سنگدل ہی ہوگا جو اس قسم کی حرکت کرے گا۔ خاص طور پر جب آپ کا قائد کے ساتھ 35 برس کا تعلق ہوگا تو کون یہ چاہے گا کہ ان کے ساتھ بدتمیزی کی جائے لہٰذا قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان کے خراب تعلقات کے بارے میں بہت سی افواہیں اڑائی گئی ہیں، جن کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں۔

س: کیا اس وقت پاکستان محفوظ ہاتھوں میں ہے؟

ج: جہاں تک پاکستان کے وجود کا تعلق ہے، میں ایک انتہائی خوش فہم آدمی ہوں اور میرا اس بات پر ایمان ہے کہ پاکستان ان شاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ حکمران آئے روز بدلتے رہیں گے مگر ملک قائم رہے گا۔ میں پاکستان کو اسی لئے محفوظ ہاتھوں میں سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک صدر پرویز مشرف، ایک محب وطن انسان ہیں وہ پاکستان سے محبت کرنے والے انسان ہیں، پاکستان کے مفادات کی نگرانی کرنا جانتے ہیں، البتہ یہ ایک الگ معاملہ ہے، مجھے اس بات سے شدید اختلاف ہے کہ ہمیں فوجی حکمرانوں کے سائے سے نکل کر جمہوریت کی طرف آنا چاہیے۔

☆☆☆......☆......☆......☆☆☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

عباس اطہر

Marfat.com

Marfat.com

سیاستدانوں کی موجودہ لاٹ میں کوئی لیڈر نہیں

عباس اطہر

عباس اطہر کا شمار ایسے صحافیوں میں ہوتا ہے جو احکام الٰہی کی تعمیل کو اپنا ایمان تصور کرتے ہیں اگر یقین نہ آئے تو ان کا کالم ''کنکریاں'' پڑھ لیجئے جس میں ہر روز وہ اپنے گرد و پیش اور آس پاس گھومنے والے شیطان کو کنکریاں مار کر اپنا ایمان تازہ کرتے ہیں بقول عبدالقادر حسن کے دوسرے لوگ مضمون لکھتے ہیں مگر عباس اطہر کالم لکھتے ہیں۔ زیر نظر انٹرویو میں عباس اطہر کے خیالات ''جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے'' کی تفسیر ہے'' آیئے شاہ جی سے ملتے ہیں۔

س: عباس اطہر کے کئی روپ ہیں کہیں وہ بہت اچھا اخبار نویس ہے تو کہیں کالم نگاروں کا امام نظر آتا ہے، اسی طرح اگر اس کی شاعری دیکھیں تو وہ اس کے بڑا شاعر ہونے کا پتہ دیتی ہے، اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ خود اپنا تعارف کروائیں تو آپ کس عباس اطہر کا تعارف کروائیں گے۔؟

ج: میری جو موجودہ پوزیشن اور پہچان ہے میں تو اس کا ہی تعارف کرواؤں گا، جیسے گاڑی کے بہت سے اسٹیشن ہوتے ہیں اور بندہ وہاں سے گزرتا ہوا ایک جگہ پر پہنچتا ہے، میری بھی وہی صورت ہے، میرا بنیادی تعلق تو نیوز سے ہے جس سے میں ابھی تک وابستہ ہوں، کالم نویسی تو جب بھی میں کرتا ہوں اپنے لئے کرتا ہوں اس

Marfat.com

بارے میں میرا کوئی خاص دعویٰ نہیں کہ میں کوئی توپ چلا رہا ہوں۔

س: مگر عبدالقادر حسن کا کہنا ہے کہ آپ سے اچھا کالم نگار کوئی نہیں۔؟

ج: چونکہ شاعری کے حوالے سے میرا ادب کے ساتھ تعلق تھا اس لئے میں اخبار کی طرف چلا گیا، رہی عبدالقادر حسن کی بات تو انہوں نے بڑی دوست نوازی کا ثبوت دیا ہے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں میرا اپنا خیال ہے کہ کالم نویسوں میں میرے جتنے بھی دوست ہیں خواہ وہ منو بھائی ہوں، حسن نثار ہو، عبدالقادر حسن ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ جن لوگوں کے میں نے نام لئے ہیں وہ مجھ سے اچھا لکھتے ہیں، شروع شروع میں ''مساوات'' کے زمانے میں تو میں گیپ فل کیا کرتا تھا، مثلاً منو بھائی کا کالم نہیں آتا تھا تو اس کی جگہ میں لکھ دیا کرتا تھا، اسی طرح میں پاکستان میں بھی کرتا رہا، البتہ جب ''خبریں'' کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اسی دور میں ''خبریں'' میں کالم نویسی شروع کر دی اور اسی چکر میں کالم نویسوں کی صف میں شامل ہو گیا پھر ''نوائے وقت'' میں آ کر لکھنا میرے لئے ویسے ہی بڑا مشکل تھا اسے آپ مجید نظامی صاحب کی مہربانی کہہ لیجئے اور یا شاید میں بھی کچھ ٹھیک لکھتا ہوں اس بارے میں واضح طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔

س: آپ کا آبائی تعلق کس علاقے سے ہے؟

ج: بنیادی طور پر میرے والد صاحب کا تعلق شاہ پور سے تھا۔ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے، علی نظام شاہ ان کا نام تھا۔ میری والدہ تاج پورہ پنڈ میں رہتی تھیں، وہ شروع سے ہی یہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کا پرنانا سکندر خان تھا اور اس سے اگلا جرنیل الٰہی بخش تھا وہ دراصل رنجیت سنگھ کے توپ خانے کے جرنیل تھے۔ ایک روایت کے مطابق بھنگیوں والی توپ وہی آپریٹ کرتے رہے ہیں۔ ان کا راجپوتوں کا بہت بڑا خاندان تھا۔ میرے خیال میں میرے تو یہی دو حوالے بنتے ہیں۔

س: آپ نے اپنے پیشے کی ابتداء کہاں سے کی؟

ج: میں نے ''انجام'' کراچی سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا، وہاں مجھے شوکت صدیقی جیسا مہربان مل گیا۔ میں بطور اپرنٹس بھرتی ہوا تھا۔ شروع شروع میں مضامین لکھا کرتا تھا یا انٹرویو وغیرہ کر لیا کرتا تھا۔ وہاں پر میرا ایک دوست نظام صدیقی ہوا کرتا تھا وہ نیوز روم میں سب ایڈیٹر تھے۔ جب ان سے تعلقات زیادہ قریبی ہوئے تو ایک دن انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر 323 روپے کا کاریگر بننا ہے تو نیوز روم کا کام سیکھ لو۔ (ان دنوں سب ایڈیٹر کی تنخواہ 323 روپے ہوا کرتی تھی) وگرنہ تم یہاں ٹک نہیں سکو گے۔ چنانچہ میں اضافی ٹائم میں نیوز روم میں کام سیکھتا رہا۔ کچھ دن بعد مجھے اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑا کہ شوکت صاحب نے میری ٹرانسفر ہی نیوز سیکشن

Marfat.com

میں کردی۔ رات کی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔ تین بجے رات گھر جایا کرتے تھے۔ یہ تربیت خاص طور پر شوکت صدیقی کی سرخیوں کے حوالے سے میرے بہت کام آئی۔ اس کے بعد میں ''امروز'' میں آ گیا۔ یہاں میں پی پی ایل ورکرز یونین کا سیکرٹری جنرل بھی بن گیا۔ اس دوران ہم نے ہڑتال بھی کروائی کیونکہ پی پی ایل سے آٹھ نو بندوں کو نکالا گیا تھا۔ ان میں آئی اے رحمٰن، عبداللہ ملک (مرحوم) ، چودھری صاحب، حمید اختر صاحب، منہاج برنا اور دیگر لوگ تھے، یہ لوگ نکل گئے اس کے بعد ہم نے روزنامہ ''آزاد'' نکالا۔ ہماری ٹیم میں آئی اے رحمٰن، حمید اختر، عبداللہ ملک اور میں تھا۔ مگر جب ہمارے مالی حالات خراب ہوئے تو میں مساوات میں چلا گیا۔ 1981ء میں امریکہ چلا گیا اور 1983ء میں واپس آ کر ''نوائے وقت'' جوائن کر لیا۔ اس میں نظامی صاحب کی فراخ دلی تھی کہ انہوں نے میرے صحافیانہ پس منظر کی بنیاد پر نہیں بلکہ میرے پروفیشنل ازم کے حوالے سے میرا انتخاب کیا۔

س: باقاعدہ پہلا کالم کب لکھا؟

ج: جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ مساوات میں جو بھی کالم نگار چھٹی پر ہوتا تھا، میں اس کی جگہ کالم لکھ دیا کرتا تھا مثلاً ایک بار آزاد میں نذیر ناجی کے ساتھ کنٹرووَرسی چل رہی تھی تو میں نے چار پانچ کالم لکھ ڈالے۔ اصل میں ہمارے نیوز روم والوں کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے کہ ہم کالم نگار یا کالم نویسوں کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ ہم تو اداریہ بھی کبھی نہیں پڑھتے۔ کالم بھی کبھی نہیں پڑھتے۔ مجھے تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ کالم نویسی بھی کوئی کام ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو بنیادی کام اخبار نویسی کا ہوتا ہے۔ تاہم جب میں ''خبریں'' میں گیا تو باقاعدہ کالم نویسی شروع کی۔

س: آپ کے کالم کا نام بہت اچھا ہے، آخر وہ کون سا شیطان ہے کہ جسے آپ ابھی تک کنکریاں مار رہے ہیں؟

ج: ان معنوں میں تو ہر حکومت میں ہی شیطان موجود ہوتے ہیں، مگر بعد میں جب مظلوم ہو جاتی ہے تو اس کی حمایت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

س: ہمارے ہاں کئی کالم نگار صدور، وزرائے اعظموں کے تقریر نویس بن گئے، چند ایک نے وزارتوں کے مزے بھی چکھے کیا آپ کو ایسی پیشکش کبھی نہیں ہوئی؟

ج: ایک بار بے نظیر صاحبہ نے مجھے تقریر لکھنے کے لئے کہا تھا مگر میں نے معذرت کر لی، کیونکہ مجھ سے یہ کام ہوتا نہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ ایک آدمی دوسرے کے حوالے سے کیسے سوچ سکتا ہے یا پھر یہ کہہ لیجئے کہ

Marfat.com

مجھے اچھی تقریر لکھنا آتی ہی نہیں یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس قسم کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے اچھی نوکری لینے کا بھی کوئی شوق نہیں۔ میرا کوئی پیسے یا پلاٹ لینے کا سکینڈل بھی منظر عام پر نہیں آتا۔

س: ایک طبقے کا یہ خیال ہے کہ کالم نگار ایجنسیوں کے بندے ہوتے ہیں اور وہی ان سے کام لیتی ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ج: مجھے نہیں معلوم کہ ان کا ایجنسیوں سے کس طرح کا تعلق ہوتا ہے مگر بعض اوقات انسان کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، کبھی اپنے بعض مفادات کے حوالے سے بک جاتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں کالم نگار کو اخبار کی پالیسی کے مطابق ہی لکھنا ہوتا ہے میں نے تو کبھی یہ نہیں سمجھا کہ ورکنگ جرنلسٹ کی حد تک یہ کوئی مشن ہے۔ کالم نگاری تو اسی ٹائپ کا کام ہے جیسے کرسیاں وغیرہ بنالیں۔ آپ نے وہ کرسی اخبار کے مالک کی پالیسی کے مطابق تیار کرنی ہے۔ مثلاً خبروں کا انتخاب یا خبر کی سرخی اخبار کی پالیسی کے مطابق ہی نکالی جاسکتی ہے۔ اخبار کی پالیسی اخباری مالکان وضع کرتے ہیں کوئی ورکنگ جرنلسٹ اخبار کی پالیسی وضع نہیں کرسکتا۔

س: کالم نگاروں سے جب بات ہوتی ہے تو اکثر یہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات صحیح بات لکھنے پر وہ حکومت کی زیر عتاب آگئے، آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہے؟

ج: ہمارا اخبار تو ویسے ہی اپوزیشن کا ہے اور ملک کا واحد نظریاتی پرچہ ہے، آپ یہاں اس حساب سے Violation کر ہی نہیں سکتے، لیکن ہم جو نیوز کے بندے ہیں ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ کس بارے میں کیسے اور کیا لکھنا ہے؟ ہمارا اپنا ایک سیلف سنسر ہوتا ہے، ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ کس حد تک سرخی لگائی جاسکتی ہے اور کس حد تک کالم لکھا جاسکتا ہے۔

س: آپ پاکستان کے ہم عمر ہیں یا ہم عصر؟

ج: ہم عصر ہی کہا جاسکتا ہے میری 1939ء کی پیدائش ہے، میں نے پاکستان بنتا ضرور دیکھا ہے اس وقت ہم لوگ جھنگ میں ہوا کرتے تھے۔

س: آپ کے اس ہم عصر نے جس کا نام پاکستان ہے، آپ کو عزت اور شہرت سے نوازا، آپ نے جواب میں اسے کیا لوٹایا ہے؟

ج: یہ تو آدمی کے دعوے ہی ہیں خواہ وہ کتنے ہی کرلے میں نے کچھ بھی نہیں لوٹایا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے قلم سے حکمرانوں، سیاستدانوں یا عوام کی کچھ اصلاح کر پائے ہیں؟

ج: آپ خود بھی اخبار میں ہیں کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک بندہ اس معاشرے کی اصلاح کرلے اگر آپ نے

Marfat.com

خالی دعوے کرنے ہیں تو بے شک اپنے اطمینان کے لئے خود کو بڑے سے بڑا پینٹ کرلیں آپ کسی کی اصلاح کر سکتے ہیں نہ اپنے کالم سے لوگوں کے نظریات تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہاں تو اس ملک میں سارا کام حکومتیں ہی کرتی رہی ہیں۔

س: پاکستان کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ یہاں زیادہ تر فوجی حکمران ہی مسلط رہے اگر کوئی جمہوری حکومت کچھ دیر کے لئے آئی تو اسے ذلیل کر کے جبراً فارغ کر دیا گیا۔ آپ کے خیال میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کس حد تک جمہوریت اور اسلام باقی رہ گیا ہے؟

ج: یہاں تو نہ اسلام ہے اور نہ جمہوریت ہے، بنیادی طور پر جو یہاں سول حکومتیں رہی ہیں ان کے پیچھے بھی فوج ہی تھی، جمہوریت کے لئے بھٹو جیسے لیڈر کی بہت کنٹری بیوشن تھی۔ قائداعظم کے بعد بھٹو جیسا کوئی لیڈر آیا ہی نہیں، کوئی سیاستدان، کوئی جرنیل اور نہ اس جیسی کسی میں ذہانت دیکھی، ذوالفقار علی بھٹو کی بہت زیادہ خدمات ہیں۔ یہاں تو بنیادی طور پر فوج رہی ہے۔ کبھی سکندر مرزا کی شکل میں تو کبھی ایوب خان کی صورت میں فوج کبھی سویلین کو آگے کر کے آجاتی ہے، کبھی براہِ راست دھاوا بول دیتی ہے۔

س: کیا اس میں سیاستدانوں کا کوئی قصور نہیں جو خود فوج کو خط لکھتے ہیں کہ ہم آپ کے چشم براہ ہیں؟

ج: خط لکھا نہیں جاتا بلکہ یہ لکھوایا جاتا ہے۔ ہماری فوج اور تو کچھ فتح نہیں کر سکتی لہٰذا ہر چند سال بعد اپنے ہی ملک اور عوام کو فتح کر لیتی ہے۔ فوج نے ذہنی طور پر طے کر رکھا ہے کہ انہوں نے حکمرانی ہی کرنی ہے۔ پھر جواز یہ دیا جاتا ہے کہ جمہوریت ہمارے مزاج کے مطابق نہیں۔ ہم تو ایک ہی بڑے ملک انڈیا سے پیدا ہوئے تھے۔ وہاں بالکل جمہوریت ہے حالانکہ وہاں ہم سے زیادہ غریب اور ان پڑھ لوگ موجود تھے، ان میں کچھ اچھوت بھی ہیں مگر اس کے باوجود وہ مستقل طور پر جمہوریت کی پٹڑی پر چڑھے ہوئے ہیں مگر ہمیں جمہوریت راس ہی نہیں۔ یہ فوج کا اپنا ہی ایک نقطہ نظر ہے جو انہوں نے جاری کر رکھا ہے۔

س: لوگ اس وقت اپنے دگرگوں معاشی حالات کی وجہ سے خاموش ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں قیادت کا فقدان ہے اور ایک لیڈر کی شدید کمی ہے جس کی وجہ سے کوئی مضبوط عوامی تحریک منظم نہیں ہو رہی۔ اس وقت لوگ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ غیر معمولی طور پر ٹینس ہیں مگر ان کے آگے چلنے والا کوئی نہیں۔

ج: سیاستدانوں کی موجودہ لاٹ سے تو کوئی لیڈر نکلتا ہی نہیں، اس وقت تو پرویز مشرف ہی لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنی جمہوریت بھی بنالی ہے۔ پارٹیاں توڑ کر ایک پارٹی بھی بنالی۔ ان کے بندے بھی توڑ لئے گئے۔

Marfat.com

جہاں تک لیڈر کا سوال ہے تو ابھی تک ووٹ نواز شریف اور بے نظیر کا ہے۔ جب بھی فیئر الیکشن کروائیں گے وہی جیتیں گے۔ ایم ایم اے کے ووٹوں کی مجموعی تعداد پیپلز پارٹی کے ووٹوں سے بھی کم ہے۔

س: کراچی کی موجودہ صورت حال کے پیچھے آپ کے خیال میں کس کا ہاتھ ہے؟

ج: معلوم نہیں یہ کیا پرابلم ہے کہ جس وقت بھی وہاں ان کی حکومت ہوتی ہے۔ حالات خراب ہو جاتے ہیں کوئی نہ کوئی واقعات ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن شروع ہو جاتا ہے۔ جام صادق کے زمانے میں بھی یہی اقتدار میں تھے جب حکیم سعیدؒ کا قتل ہوا تب بھی یہی اقتدار میں تھے۔ نواز شریف کے ساتھ ان کی بڑی انڈرسٹینڈنگ تھی ان کے خلاف بھی آپریشن شروع کیا۔ اب بھی انہی کے اقتدار میں اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آفاق احمد والا جھگڑا اب بھی اندر ہی اندر جاری ہے۔ اس وقت بھی صدر پرویز مشرف کے دل میں ایم کیو ایم کے لئے بڑا سوفٹ کارنر موجود ہے۔
کراچی کے موجودہ حالات میں ایک سے زیادہ عوامل بھی ہیں اس میں فرقہ پرستی اور دہشت گردی کا بھی امکان ہے، لیکن اصل حکومت وہاں ایم کیو ایم کی ہے۔ ضمنی انتخابات میں دوسروں کے بندے مارنے کا آخر مقصد کیا ہے۔ جنرل صاحب کا خیال ہے کہ وہاں سے پیپلز پارٹی کا خاتمہ ہی ایسے ہو سکتا ہے کہ ایم کیو ایم کے روایتی چچے وہاں جمع کر لئے جائیں مگر پیپلز پارٹی پہلے ختم ہوئی تھی اور نہ آئندہ ختم ہو گی۔ 1979ء میں بے نظیر کے والد کو پھانسی ہوئی اس کے باوجود پی پی دو مرتبہ اقتدار میں آئی۔

س: مسلم لیگ کے بارے میں کیا خیال ہے اس وقت قائداعظمؒ کی جماعت بے شمار ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے، آپ کے خیال میں اصل مسلم لیگ کسے تسلیم کیا جانا چاہیے؟

ج: اس وقت جو سیاسی پارٹی Exists کر رہی ہے میرے خیال میں وہ تو نواز شریف کی مسلم لیگ ہی ہے، اگر کوئی اور نیا آدمی آ گیا تو کل وہ مزید نئی مسلم لیگ بنا لے گا۔ موجودہ حکومتی مسلم لیگ میں جو لوگ شامل ہیں جسے متحدہ مسلم لیگ کہا جاتا ہے یہ تو سرکاری پارٹی ہے۔ (ق) لیگ تو مشرف صاحب کی پارٹی ہے، چاہے وہ دس سال رہیں یا بیس سال حکومت کریں۔ سرکاری مسلم لیگ تو انہی کی ہے، اس میں احد ملک جیسے لوگ بھی شامل ہوتے رہیں گے، یہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کو اپنے مقاصد کے لئے توڑتے رہیں گے، ان لوگوں کو انڈر پریشر لا کر انہیں سرکاری جماعت میں شامل کرتے رہیں گے، جس طرح انہوں نے پی پی کو توڑا ہے مسلم لیگ (ن) کو بھی توڑنے کی کوشش کریں گے۔ مگر نواز شریف اور بے نظیر کا ووٹ کہاں لے کر جائیں گے، جب بھی الیکشن کروائے جائیں گے یہ دونوں لیڈر اوپر آ جائیں گے۔

Marfat.com

س: مگر موجودہ حکومت نے جو حالات پیدا کر دیئے ہیں ان میں نواز شریف اور بے نظیر کی وطن واپسی کیا ممکن ہے؟

ج: چلئے آپ سمجھ لیں نواز شریف کے ساتھ دس سال کا معاہدہ ہے، ساڑھے تین سال تو گزر گئے ہیں باقی ساڑھے چھ سال تو کوئی مدت ہی نہیں۔

س: ایک اچھا نیوز ایڈیٹر جذبات سے عاری ہوتا ہے جبکہ شاعری خالصتاً جذبات کا کھیل ہے اور شاعری میں بھی آپ کا فن بام عروج پر نظر آتا ہے، آپ بیک وقت دو مختلف مزاج اصناف سے کیسے انصاف کرتے ہیں؟

ج: میں نے اخبار نویسی کو ہمیشہ پروفیشن کے طور پر لیا ہے جس سے میں روزگار کماتا ہوں، میں نے ہمیشہ دل جمعی سے کام کیا، اسی پیمانے پر مجھے کامیابی ہوئی، جہاں تک میری شاعری کی کتاب کا تعلق ہے تو یہ میں نے 1966,67ء کے درمیان شاعری کی تھی مگر جب میں امروز میں آیا، اس کے بعد جب ''آزاد'' میں آیا اور میری سرخی لگنی شروع ہوئی تب مجھے اس پروفیشن کی اہمیت کا پتہ چلا اور پھر اس کا ہو کر رہ گیا۔

س: آپ نے سرخی کی بات کی تو سقوط ڈھاکہ سے قبل آپ کی ایک ایسی سرخی تاریخی حوالہ بن چکی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ایک نظریاتی ملک جس کی بنیاد اسلام پر ہے بلکہ ایک طبقے کا یہ کہنا ہے کہ ادھر تم ادھر ہم جیسی سرخی تخلیق کر کے آپ نے ملک توڑنے کی فضا بنائی جبکہ بھٹو صاحب نے شاید ایسا نہیں کہا تھا؟

ج: ویسے تو ایک اخباری سرخی کا کوئی خاص مطلب نہیں ہوتا Basically میں نے ان کے الفاظ سے اخذ کر کے یہ سرخی بنائی تھی۔ ویسے سرخیوں کے ساتھ ملکوں کی تقدیریں تو نہیں بدلا کرتیں، مشرقی پاکستان میں جو کچھ بھی ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے مشرقی پاکستانیوں کو ہمیشہ دوسرے درجے کا شہری سمجھا، انہیں بزدل جانا مگر جب انہوں نے ہماری فوج سے پنجہ آزمائی کی تب ہمیں پتہ چلا کہ انہیں لڑنا بھی آتا ہے۔ ان کے سارے وسائل پر ہم قابض تھے، ہماری ہی جو بیوروکریسی تھی اس نے جا کر وہاں نئی روایت قائم کیں پھر جس رات ڈھاکہ آپریشن ہوا ہے اس کے بعد ہم نے ان کی عورتوں تک کو نہیں چھوڑا ہم ان کو مورچوں تک تو لے گئے تھے، وہ کون سی چیز تھی جو ہم نے نہیں کی اس میں کوئی ایک سرخی کچھ نہیں کر سکتی، ایسا تو بہت پہلے سے ہو رہا تھا جب ہمیں سہروردی قبول نہیں تھا تو ہم نے ناظم الدین کو قبول کیا ہمیں تو ان کے وزیر اچھے ہی نہیں لگتے تھے وہ بھی اس لئے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ہم اچھے نہیں لگتے تھے۔

حکومت یحییٰ خان کی تھی جبکہ مشرقی کمان جنرل نیازی کے ہاتھ تھی، بھٹو جو اس وقت کچھ بھی نہیں تھے

Marfat.com

یہ کس طرح ممکن ہے کہ بھٹو نے پاکستان توڑ دیا، بھٹو کا تو کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ جس رات ڈھاکہ آپریشن ہوا مجھے وہ تاریخ یاد نہیں ہے۔ یحییٰ خان بھی وہاں گیا ہوا تھا بھٹو کو بھی وہاں بلایا گیا تھا۔ بھٹو کو جس کانٹینٹل میں ٹھہرایا گیا تھا اس ہوٹل کی چھت والا کمرہ انہیں دیا گیا تھا۔ جس کی کھڑکیاں باہر دھان منڈی میں کھلتی تھیں، یحییٰ خان نے بھٹو کو مزید نہیں بلایا اور غلام مصطفیٰ کھر بھٹو کو چھت پر چھوڑ کر واپس آ گئے اور رات یحییٰ خان اس کمرے میں تھا جب ڈھاکہ پر دشمن کے ٹینکوں نے چڑھائی کی اور انہیں دکھایا گیا کہ جناب ایسا بھی ہو سکتا ہے اور ایک روایت کے مطابق جب یحییٰ خان اگلے دن مغربی پاکستان واپس آیا اور ایئر پورٹ پر اترا تو ان کی دونوں ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہاں آ کر یحییٰ خان نے پہلا کام یہ کیا کہ اس وقت شیخ مجیب بھی ایک تحریک چلا رہے تھے مگر یحییٰ خان سے کہا کہ آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں میں فوج کا اصل روپ دیکھ آیا ہوں اب اس میں بھٹو کا کیا قصور کہ سارے گناہ اس کے کھاتے میں ڈالے جا رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب فوج کا نام لیتے ڈر لگتا ہے تو بھٹو کو موردِ الزام ٹھہرا دیتے ہیں۔ وہ بے چارہ تو اتنا بے بس تھا کہ جب پھانسی لگ گیا تو ہم کچھ نہیں کر سکے۔

س: عباس اطہر صاحب جو آدمی شاعر ہو وہ عاشق مزاج بھی ہوتا ہے اور زندگی کے کسی نہ کسی دور میں وہ دشت عشق سے ضرور گزرتا ہے، آپ پر کوئی ایسی واردات یا کیفیت گزری؟

ج: عشق کے بڑے معنی اور بڑے مفہوم ہیں مگر جو عاشق ہونے والا عمل ہے اس پر میرا یقین نہیں ہے۔ باقی زندگی کے دوسرے کام چلتے رہتے ہیں۔ آپ کو کبھی کوئی نشہ لگتا ہے، کبھی کوئی اور روگ لگتا ہے مگر جو روایتی عشق ہے وہ کم از کم میں تو نہیں کر سکا۔

س: آپ کے تو ماشاء اللہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں پرستار ہیں میرا سوال یہ ہے کہ آپ کس کے پرستار ہیں؟

ج: میں کسی کا پرستار نہیں ہوں۔ میری اپنی طرح کے جو دو ٹانگوں والے انسان ہیں، ان میں سے میں کسی کو پیر مانتا ہوں اور نہ مرشد مانتا ہوں۔ میں انہیں اپنی ہی طرح کا سمجھ کر ان کو ڈیل کرتا ہوں۔

س: قائداعظم کے بعد پاکستان میں کوئی ایسی ہستی ہے جسے آپ اپنا لیڈر تسلیم تصور کرتے ہیں؟

ج: وہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ قائداعظمؒ کے بعد بھٹو ہی صحیح معنوں میں ایک لیڈر تھے ان جیسا بعد میں کوئی نہیں آیا۔

س: آپ کے بچے آپ کی اخبار نویسی یا کالم نگاری کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

Marfat.com

ج: اب تو وہ خاصے بڑے ہو گئے ہیں جب وہ چھوٹے ہوتے تھے تو ان کا میرے بارے میں یہی خیال تھا کہ یہ بندہ اتوار کے اتوار آتا ہے کیونکہ ہماری شروع ہی سے رات کی ڈیوٹیاں رہی ہیں، جب جاتے تھے وہ سو رہے ہوتے تھے جب آتے تھے تب بھی ان کے سونے کا ٹائم چکا ہوتا تھا۔

س: زندگی میں کوئی غلطی جو غیر دانستہ طور پر سرزد ہوئی ہو؟

ج: میرا خیال ہے ابھی تک میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی۔

س: کوئی ایسا نیک کام جو آپ سے ہوا ہو؟

ج: نیکی کا کوئی خاص واقعہ تو نہیں البتہ میں روٹین میں نیکی کر دیتا ہوں۔ مثلاً میرے پاس اگر کوئی شخص آتا ہے اور اگر میں اس کا کوئی کام کروا سکتا ہوں تو میں اسی وقت کر دیتا ہوں۔

س: آپ کو نوجوان صحافیوں کا مکھیا بھی کہا جاتا ہے مثلاً یہ کہ آپ جس گروپ پر بھی دست شفقت رکھ دیں وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے ؟

ج: ایسی بھی کوئی بات نہیں شاید میں جیتنے والوں کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔

Marfat.com

عباس اطہر کی ایک خوبصورت نظم

تو رو رہی ہے؟

ماں !
تیرا بیٹا تو مر گیا
تیری راہ میں سولی چڑھ گیا
تیری دھڑکنوں میں بکھر گیا
اب تو کس لئے انتظار کرتی ہے
کیوں ستارے شمار کرتی ہے
اب وہ سارے گھروں میں رہتا ہے
اور سارے دیئوں میں جلتا ہے
جانے والوں کے ساتھ جاتا ہے
آنے والوں کے ساتھ آتا ہے
پھول لاتا ہے
ماں! تیرا بیٹا تو جی اٹھا ہے
تو رو رہی ہے؟
یہ تیرے سینے پہ کس کا سر ہے
یہ اس کا سر ہے' یہ میرا سر ہے
جو مر گیا' سولی چڑھ گیا
اور جو جی اٹھا
جس نے ساری ماؤں کی گود بھر دی
زمیں مصیبت سے خالی کر دی

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

حسن نثار

Marfat.com

Marfat.com

خود کو زاہد اور عابد سمجھتا ہوں

حسن نثار

حسن نثار کا نام صحافتی برادری اور اخباری دنیا میں کچھ ایسی ہی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ جس کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''نام ہی کافی ہے'' مگر ان کا کہنا ہے کہ یہ نام کمانے کے لئے ان کے ہاتھوں کی لکیریں گھس گئی ہیں، تاہم اپنی شب و روز کی محنت سے ان کے مقدر کی لکیریں ضرور سنور گئی ہیں۔ حسن نثار سے ہلکے پھلکے سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر ایک دلچسپ مکالمہ ہوا جو نذرِ قارئین ہے:

س: کچھ اپنے بارے میں اپنے الفاظ میں؟

ج: اپنے بارے میں بات کرنا بہت مشکل کام ہے، چند الفاظ میں تو یہی میرا تعارف ہے کہ بچپن میں مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ میری Back Ground بھی کچھ ایسی تھی لہٰذا میں اس طرف آ گیا۔

س: آپ پاکستان کے دوست بھی ہیں اور ساتھی بھی، جس نے آپ کو عزت، شہرت، نام اور مقام دیا جواب میں آپ نے اس ملک کو کیا دیا؟

ج: یہ ملک کسی کو کچھ نہیں دیا کرتے۔ خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کسی کو کچھ نہیں دیتے بلکہ کوئی بھی ملک کچھ نہیں دیتا۔ یہ اللہ کا کرم ہوتا ہے یا بندے کی اپنی کوشش ہوتی ہے۔ اس ملک میں جہاں لوگوں کو پینے کا پانی

Marfat.com

میسر نہیں۔لوگ روٹی کو ترستے ہیں جہاں کا نظام صحیح نہیں، ملک تو معصوم ہوتا ہے ملک نے مجھے کیا دینا ہے۔رہا یہ سوال کہ مجھے اس ملک نے کیا دیا ہے۔میرے بھائی ملک تو کسی کو کچھ بھی نہیں دیتا، یہ بے روزگار کو روزگار دیتا ہے نہ یہ تحفظ دیتا ہے۔چوریاں، ڈاکے، جرائم اور امن وامان، کی ابتر حالت ہے۔اس نے کسی کو کیا دینا ہے یہ تو بے چارہ خود زخمی ملک ہے۔یہ ایک گھسی پٹی بات ہے کہ ملک نے آپ کو کیا دیا، میں اگر ہندوستان میں بھی ہوتا تو حسن نثار ہوتا۔وہ ملک اور طرح کے ہوتے ہیں جو اپنے لوگوں کو کچھ دیتے ہیں جہاں تک میری بات ہے تو میں نے ذاتی طور پر لوگوں میں Awarness پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔سچ بولا ہے۔بدنیتی اور بددیانتی نہیں کی۔ایک لکھنے والے کے طور پر یہ تو ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ کچھ غلط ہوا ہو مگر اس کے پیچھے میری بددیانتی یا لالچ کچھ نہیں رہا ہے۔میں نے بالکل بے غرض ہو کر بڑی دیانتداری سے لکھا۔ایسا اس لئے لکھا ہے کہ اس ملک کے اور یہاں کے عوام کے حالات بہتر ہوسکیں۔

س: بطور کالم نگار یا ایک دانشور آپ اپنے قلم سے کس حد تک دوسروں کی اصلاح کر پائے ہیں؟

ج: دو باتیں کہنا چاہوں گا، پہلی بات تو یہ کہ قلم قسم اور قدم یہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانے چاہئیں۔میری بات پر آپ دو تین حوالوں سے غور کیجئے۔جیسا کہ بابا بلھے شاہؒ کا ایک شعر ہے:

مالی دا کم پانی لانا تے بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لانا لاوے یا نہ لاوے

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنے حصے کا کام بڑی دیانت اور دلیری سے کیا ہے مگر ظاہر ہے میں کوئی اخبارات کا مالک تو نہیں ہوں کہ پالیسی تبدیل کروں۔میری تحریر کا کوئی جتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے میں حاضر ہوں، ہم نے دیانتداری کی بھی انتہا کی اور یہ بات دنیا جانتی ہے۔میں ہمیشہ اپنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ذہن میں رکھ کر کام کرتا ہوں۔اپنی موت اور اپنی عزت کو ذہن میں رکھ کر کام کرتا ہوں۔میں نے زندگی میں کبھی یہ پرواہ نہیں کی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔نتیجہ تو آپ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔بقول بابا بلھے شاہؒ کے ہم نے تو پانی دینا ہے، ہم نے کھاد دینی ہے، خون جگر جلایا ہے وہ کام ہوتا ہے یا نہیں ہوتا I am not interested یہ تو میرا مسئلہ ہی نہیں ہے۔تیسری بات یہ ہے کہ اس سوسائٹی کے اندر جو میرا کردار ہے۔میں اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں، میں خود کو کوئی طرم خان یا پاٹے خان نہیں سمجھتا کہ میں نے یہ کر دیا ہے یا وہ کردوں گا۔میرا کام بنیادی طور پر سرجن کا نہیں ہے۔میرا کام تو ایک ایکسرے مشین کا ہے میں تو صرف صورتحال بتاتا

Marfat.com

ہوں کہ اس ملک کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے اور کرنے والے یہ لوگ ہیں اور جن کے ساتھ ہو رہا ہے وہ یہ لوگ ہیں بطور ایکسرے مشین میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے تو ہڈی کے ٹوٹی ہوئی کی رپورٹ آئے گی، رپورٹ میں لکھا ہوگا فریکچرڈ اگر یہ ملک فریکچرڈ ہے تو یہ میری تحریروں میں بھی فریکچرڈ ہی نظر آئے گا۔ اگر اس کے عوام دکھ درد میں مبتلا ہیں انہیں عزتِ نفس اور روٹی میسر نہیں ہے۔ انہیں ایک جیسے مواقع میسر نہیں ہیں تو یہ سب کچھ میری تحریروں میں نظر آئے گا۔ کبھی کبھی لوگ مجھ سے گلا کرتے ہیں کہ آپ کی تحریروں میں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ مجھے ایک امید والی بات تم بتا دو میں لکھ دوں گا۔ جھوٹ بولنا ہے تو آپ لکھتے رہیں، ٹی وی پر ہم کہتے ہیں ''ہم زندہ قوم ہیں'' جبکہ قدم قدم پر چوری چکاری ہے۔ غنڈہ گردی اور بدمعاشی ہے جمہوریت کا مذاق اڑاتا ہے۔ ہر روز جمہوریت کا تماشا لگتا ہے ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ دوائیں دو نمبر ہیں، ہر آدمی تجاوزات میں الجھا ہوا ہے۔

س: آپ نے ایک ٹی وی پروگرام میں کہا تھا کہ اصل نماز تو مسجد سے باہر شروع ہوتی ہے؟

ج: میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ ہم سو نفل پڑھنے والے لوگ ہیں مگر ضرورت مند کو سو روپیہ کوئی نہیں دے گا۔ ہم بیمار لوگ ہیں ہمارا تعلق بیمار سوسائٹی سے ہے۔ المیہ یہ ہے کہ صرف ملک ہی نہیں بلکہ عوام کا بھی ایسا ہی حال ہے، آپ کا سوال یہ تھا کہ میں نے لوگوں کی کتنی اصلاح کی، سو میرا جواب یہ ہے کہ جو میں نے دیکھا اسے ایمانداری سے بیان کر دیا ہے۔ باقی بقراط اور سقراط کون ہے۔ ہم تو کیمرے کی طرح آپریٹ کرتے ہیں جو نظر آتا ہے دکھا دیا۔

س: کہا جاتا ہے کہ آج کے کالم نگار کے منہ سے الفاظ اور زبان اخباری مالک کے ہوتے ہیں وہ صرف وہی کچھ لکھتا ہے جو مالک چاہتا ہے؟

ج: جو کوئی بھی ایسا کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ مختلف دھڑوں کو سپورٹ کرتے ہیں۔ ایک جبر تو ہے مگر یہ کہنا ہے۔ آپ بالکل نہیں لکھ سکتے یہ [illegible] بات ہے۔ مجھے لکھنے کے معاملے میں سو میں سے 25 فیصد مایوسی ہوئی ہوگی یا جس حد تک میں کہنا چاہتا ہوں میرا اخبار میرا بوجھ نہیں اٹھا رہا مگر یہ معاملہ 25 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ 75 فیصد تو میں لوگوں کو اپنی بات پہنچا دیتا ہوں۔ میں تو اردو ٹائمز نیویارک کے لئے بھی لکھتا ہوں۔ وہاں تو لوگ میرے کالم پڑھتے ہوں گے۔ یہاں تو شاید مجھے اگلے دن ہی گولی لگ جائے اور یہاں تو وہ چھپ بھی نہیں سکتا جو میں وہاں لکھتا ہوں۔ لہٰذا مالکان کو اس قسم کا

Marfat.com

Blame کرنا کہ پابندیاں لگاتے ہیں یہ مناسب بات نہیں ہے۔ وہ بڑی جرأت سے بڑا کام کرتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے بے نظیر اور نواز شریف کے خلاف کیا کچھ نہیں لکھا، ناگ اور ناگن تک، چھرا اور چھری تک تو لکھ دیا، اس کے آگے کیا لکھتا، ان پر تنقید کی ہے، کرپشن کے بارے میں بات کی ہے۔ جب فاروق لغاری صدر تھے تو میں نے مہران بینک کا وہ تماشا لگایا تھا کہ سب نے پڑھا، اب وہ چھاپنے والے کی مرضی سے ہی چھپا تھا۔ میری تو اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ لکھنے والے کا تو اپنا معاملہ ہے مگر چھاپنے والے کو بھی تو کریڈٹ ملنا چاہیے۔

س: آپ جب ایک اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے، اس وقت آپ کی تحریروں میں ایک جرأت مندی یا Aggression نظر آتی تھی۔ مگر جب آپ دوسرے اخبار میں بطور کالم نگار گئے۔ تب آپ کی تحریروں میں وہ جرأت مندی اور دلیری ختم ہو گئی اس کا مطلب ہے اخبار کی پالیسی کسی حد تک اثر انداز ہوتی ہے؟

ج: یہ کسی حد تک ٹھیک ہے، اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ ایک تو میں نے بہت زیادہ کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں اخبار جہاں کے لئے بھی لکھتا ہوں، کسی کی ویب سائیٹ کے لئے بھی لکھتا ہوں۔ جیو کے لئے لکھتا ہوں، میں نے 25 منٹ دورانئے کے چار پانچ ڈرامہ سیریل لکھے ہیں، ظاہر ہے ایک Factor تو یہ ہے اس کی بھی ایک وجہ ہے، میں مکان بنا رہا تھا، مجھے مزید روپے کی ضرورت تھی اور میں لکھ کر ہی کما سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے جتنا لکھ کر کوئی دوسرا نہیں کما سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ شاعروں اور ادیبوں کو ہمیشہ کھڈوں میں ہی زندگیاں گزار دینی چاہئیں۔ مکان بنانے کے لئے ظاہر ہے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی جبکہ اس ٹریڈ کے دوسرے داؤ پیچ مجھے نہیں آتے تھے۔ ایک Factor تو یہ ہے جبکہ دوسرا Factor آپ عمر کا سمجھ لیں۔ جتنی جارحیت چالیس سال کی عمر میں ہو سکتی ہے اتنی پچاس سال کی عمر میں نہیں ہو سکتی۔ تیسرا ایک Factor یہ ہے جب آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے لئے آپ لکھے جا رہے ہیں وہی مر چکے ہیں۔ تب آپ کو بڑا دھچکا لگتا ہے۔ زندگی میں سب سے مشکل کام دوسروں کے لئے لکھنا ہے اور یہ پیغمبرانہ کام ہے۔ ہمارے ہاں تو ایسے بھی صحافی ہیں جن کے نہر پر تین تین گھر اور کروڑوں کے Deposits ہیں اور لینڈ کروزر ہیں۔ الحمد للہ! میں بڑی آسودہ زندگی گزار رہا ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ کون کیا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے نواز شریف سے پلاٹ لینا اچھا نہیں لگتا ہے۔ مجھے بے نظیر سے میڈیا فاؤنڈیشن کا فلیٹ لینا پسند نہیں ہے۔ میں بھی لوگوں کے کام کروا کر پیسے لے سکتا ہوں، ضرورت ہونے کے باوجود کوئی آدمی اپنی ہی لگام میں کھینچ لے تو یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کہنے کا

Marfat.com

مقصد یہ ہے کہ جن کے لئے آپ سب کچھ کریں اگر وہی نہیں اٹھتے تو آپ کیا کریں گے۔ اگر کوئی چاہے کہ میرے فنگر پرنٹ لے لے تو شاید انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی لکیریں بھی نمایاں نہ ہوں گویا لکھ لکھ کر میرے ہاتھ کی لکیریں گھس چکی ہیں مگر جن کے لئے یہ کیا ہے ان کو احساس ہی نہیں ہے۔ آج اگر کسی کی بہن مرضی کی شادی کر لے تو لڑکی کے بھائی چار سال بعد بھی اپنے بہنوئی کو بچوں سمیت قتل کر دیں گے اور بہن بھی مار دیں گے۔ پوری قوم میں سے کسی کی غیرت نہیں جاگے گی۔ یہ تو عجیب طرح کے غیرت مند لوگ ہیں۔ جب مہنگائی بڑھتی ہے تو مجھے اہانت کا احساس ہوتا ہے۔ میری طرف سے مٹن ہزار روپے کلو ہو جائے میں تو ایفورڈ کر لوں گا مگر جن کی زندگیاں عذاب بن گئی ہیں وہ لوگ React کیوں نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا یا اب بھی ہو رہا ہے۔ اب میں اس پر اتنا کڑھتا نہیں ہوں، اب مجھے عمر بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہوں یہی باتیں سوچ کر اور کڑھ کڑھ کر مجھے ڈاکٹروں نے منع کیا ہے کہ آپ اتنا زیادہ محسوس نہ کیا کرو، آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہے جو آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، میں پہلے پان بھی کھایا کرتا تھا، سگریٹ بھی پیا کرتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے پہلے جب میں لکھا کرتا تھا تو لوگوں کا کہنا تھا اس میں بہت زیادہ Aggression ہوتا ہے۔ یہ Aggression پیس میں دستیاب نہیں ہے کہ ہزار روپیہ پکڑ و اور دو کلو Aggression لا دو۔ یہ بلڈ پریشر اوپر نیچے ہوتا ہے یہ کسی اور کو کیوں نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجہ میں میں شارٹ ٹمپرڈ ہو گیا ہوں۔ میرے اندر درشتگی آ گئی ہے جبکہ بنیادی طور پر میں بڑا سوفٹ ہوں۔

س: پاکستان کو معرض وجود میں آئے 59 برس ہو گئے جہاں ہمیشہ فوج کی حکومت ہی رہی ہے جب کہ منتخب وزرائے اعظموں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا۔ آپ بطور دانشور اس ملک کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ج: ''جیسا اس کا ماضی تھا'' بس میرے اس جواب کو کافی سمجھئے، یہ ویسے بھی عمرانیات کا ایک اصول ہے کہ اگر کسی قوم کا مستقبل دیکھنا ہو تو اس کا ماضی دیکھ لو۔ مثلاً جو اوائل دنوں کے مسلمان تھے ان کا آپ ماضی دیکھ لیں وہ ایسے ہی ہو سکتے تھے نا؟ حضرت محمد ﷺ کی دنیا میں آمد کے بعد ان کی ڈائریکشن تبدیل ہو گئی ورنہ شجاعت ان میں تھی غیرت ان میں تھی وعدے کا پاس کرتے تھے۔ بے ایمان نہیں تھے، مہمان نواز تھے، سخاوت ان کی گھٹی میں تھی، کون سی صفت ہے جو بدوؤں میں نہیں تھی۔ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ان کو پالش کر دیا اور ان کی سمت کو تبدیل کر دیا۔ سیلاب کی صورت میں جو پانی تباہی پھیلا رہا تھا، اس سے سمجھ لیں کہ انہوں نے بجلی پیدا کر لی۔ قوموں میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا جیسا ماضی ہے ویسا ہی آپ کا مستقبل ہے۔ آپ نے جو 59 سال کہے ہیں

Marfat.com

میرے خیال میں تو اس کی عمر ایک سال ہی ہے باقی 59 مرتبہ آپ نے صرف Performance دہرائی ہے۔ 59 سال میں تو پتہ نہیں آدمی کہاں سے کہاں چلا جاتا ہے۔ بچہ جوان ہو کر ادھیڑ عمر کا ہو جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے ضیاء الحق کے زمانے میں ایک بار مذاق اڑایا تھا۔ یہ 86,87ء کی بات ہے، بے نظیر نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے میرے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا اس مضمون میں وہ اس ملک کے نظام کا مذاق اڑا رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جونیجو بطور وزیر اعظم اور ضیاء الحق بطور چیف آف آرمی سٹاف اس کا باس ہے اور بطور صدر اس کا ماتحت ہے یعنی بیک وقت وہ اپنے ماتحت کا ماتحت بھی ہے اور باس کا باس بھی ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں یوں نہیں لگتا کہ بے نظیر کی تقریر جاری ہے اور ہم بیٹھے ہیں۔ آج وہی عالم ہے صدر پرویز مشرف اور وزیر اعظم جمالی صاحب، خلاصہ یہ ہے کہ اس ملک پر وقت آیا ہی نہیں بلکہ اس ملک پر وقت ٹھہرا ہوا ہے بلکہ صدیوں سے ٹھہرا ہوا ہے۔

س: آپ کے بقول ہمارے لوگ جو بے حس ہو چکے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے آواز نہیں اٹھاتے اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے۔ جس کی آواز پر وہ لبیک کہہ سکیں؟

ج: لیڈر شپ تو مکھن کی طرح ہوتی ہے لیکن آپ کا دودھ ہی زہریلا ہے۔ تو پھر آپ اچھی توقع کیسے کر سکتے ہیں اگر آپ ہی بے ایمان اور گندے ہیں اور آپ کو تمیز بھی نہیں ہے، اس صورت میں تو آپ بھی اپنے جیسا گندہ آدمی ہی لے کر اوپر آئیں گے۔ ایک حدیث بھی ہے کہ جیسے لوگ ہوں ویسے ہی ان پر حکمران مسلط کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنے جیسوں کو ہی منتخب کرتے ہیں۔ بھائی میں تو بڑا نا امید اور مایوس ہوں۔ جو کہتے ہیں کہ میں نے مایوسی پھیلائی ہے کہ بھائی وہ مجھے امید والی کوئی بات بتائیں میں اس پر لکھنا شروع کر دوں گا۔ ہم نے سڑکوں اور دیواروں پر جس طرح سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نام لگائے ہوئے ہیں۔ اسمبلیوں کے اوپر لٹکائے ہوئے ہیں کیا ہمارے ہاں رتی برابر بھی پریکٹس اس کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں 2 فیصد سود کے بارے میں تو بہت شور مچایا جاتا ہے مگر 500 فیصد منافع پر کوئی کچھ نہیں کہتا مثلاً یہ جو آلو کے چپس ہیں یہ جب کھیت سے آلو اٹھتا ہے تو وہ چار روپے کلو بکتا ہے مگر چپس کی شکل میں 6 سو سے 8 سو روپے کلو بکتا ہے اس پر کوئی نہیں بولتا۔ دو فیصد سود پر تم چیخ رہے ہو مگر 2 ہزار روپے منافع خوری پر کوئی نہیں چیختا۔

س: آپ اپنے کسی کالم یا تحریر کی وجہ سے کبھی زیر عتاب آئے ہوں؟

ج: ضیاء الحق نے مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا تھا۔ ٹیمپل روڈ پر مجھ پر فائرنگ ہوئی۔ دھمکیاں وغیرہ بھی ملتی

Marfat.com

رہیں بڑا کچھ ہوا میرے ساتھ۔

س: کوئی نیکی جواب تک آپ کو یاد ہو؟

ج: اس طرح کے کام میں نے ڈھکے چھپے صلہ رحمی کے تحت کئے ہیں۔

س: آپ جنگ میں کالم لکھتے ہیں کیا اسے آپ کی ملازمت تصور کیا جائے؟

ج: میرا مزاج Service Mind نہیں ہے میرے پاس بڑی آپشنز تھیں۔ میں سول سروس میں جا سکتا تھا۔ میں نے اکنامکس پڑھی ہے کہیں بھی جا سکتا تھا۔ میں تو اسلام آباد سے بھی اٹھارواں گریڈ چھوڑ کر آ گیا تھا میں کسی کے پینل پر ہو نہیں سکتا یعنی ملازمت میرے ضمیر میں ہی نہیں۔

س: کیا ایک قلم کا مزدور اخبار کا مالک بن سکتا ہے؟

ج: بالکل بن سکتا ہے اگر کل مجھے دورہ پڑ جائے تو میں آپ کو اخبار دوں گا۔ یہ تو فنڈز اکٹھے کرنے کا مسئلہ ہے میرے تو بیسیوں دوست کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہیں۔

س: آپ کے والدین آپ کو کیا بنانا چاہتے تھے آپ کیا بن گئے؟

ج: میرے والد چاہتے تھے کہ میں سول سروس میں چلا جاؤں مگر میں خود وہی بننا چاہتا تھا جو میں بن گیا، میں رائٹر صحافی وغیرہ بننا چاہتا تھا سو بن گیا۔

س: کہا جاتا ہے پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، کیا اس کا اقوام عالم میں اسلام کے قلعوں جیسا رول ہے؟

ج: بھئی یہ تو اسلام ہی نہیں ہے جیسے اس کے نام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان لکھا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں جمہوریت ہے اور نہ ہی اسلام ہے ایسی کون سی بات ہے جو اسلام میں ہے۔ نماز کا مقصد اکٹھے ہو کر Exercise کرنا نہیں ہے یہ آپ کو پاکیزگی سکھاتی ہے مگر محلے آپ کے گندے بازار گلیاں آپ کی گندی، یہ آپ کو ڈسپلن سکھاتی ہے مگر آپ ٹریفک دیکھیں، یوں لگتا ہے جیسے ایک دوسرے کو قتل کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ نماز آپ کو بھائی چارہ سکھاتی ہے یہاں ہر آدمی جیب کاٹ رہا ہے۔ نماز یا عبادات خود منزل نہیں ہیں بلکہ یہ مختلف منزلوں پر پہنچنے والے راستے ہیں۔ جیسے الیکشن خود مقصد نہیں ہوتا بلکہ مقصد ہوتا ہے منتخب حکومت لانا۔ اس طرح نماز کچھ چیزوں کا ذریعہ ہے۔ رمضان المبارک سال میں ایک مہینہ ضبط نفس کی پریکٹس ہے۔ اس میں آپ لوٹ مار اور منافقت کی انتہا کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ٹی وی پروگرام میں کہا، ان کو بتاؤ کہ گاڑی ٹھیک پارک کرنا اور قطار میں کھڑا ہونا عبادت ہے اس کا ثواب ملے گا۔ اس وقت ملک کے تین پاپولرز لیڈر رہیں وہ

Marfat.com

تینوں ہی ملک سے باہر ہیں۔ بے نظیر بھی باہر، نواز شریف بھی باہر اور الطاف حسین بھی باہر۔

س: آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کا قول جماعت اسلامی جیسا ہے جبکہ عمل پیپلز پارٹی کا ہے۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

ج: یہ بالکل غلط بات ہے: نہ میں جماعت اسلامی نہ میں پیپلز پارٹی، میرا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں۔ دراصل آپ کے اس سوال کے اندر ایک سوال ہے۔ اب میں اس کا جواب دوں گا۔ گناہ اور ثواب کی ایک اپنی تشریح ہے۔ اگر آپ ایک اچھے انسان ہیں آپ نے لوگوں کے ساتھ اچھا کیا ہے، برائی اور بددیانتی نہیں کی۔ منافقت نہیں کی، کھوٹ نہیں کیا تو آپ Execllent انسان ہیں۔ میرے لئے ظاہری عبادات کا مسئلہ نہیں میں تو خود کو زاہد اور عابد سمجھتا ہوں۔

I am exellent Husband, I am very good father, A very realible family and I am responsible citizen.

میرا ڈرائیونگ لائسنس گم ہو گیا تھا، جب تک وہ دوبارہ بن نہیں گیا میں نے اس وقت تک گاڑی نہیں چلائی، ہم تو اچھے برے آدمی کی خود ہی کوئی نہ کوئی تعریف کر دیتے ہیں، اچھا آدمی آپ کسے کہتے ہیں، جو نماز پڑھے اور کسی کے کام نہ آئے۔ اچھا آدمی وہ ہے جو سمگلنگ کرے، فراڈ کرے اور مسجد کو چندہ دے دے۔

س: آپ کے بہت سے پرستار اور چاہنے والے ہیں، آپ کس کے پرستار ہیں؟

ج: میں سچی بات بتاؤں، آپ نے غور کیا ہوگا کہ میں نے کبھی قائداعظم نہیں لکھا۔ میں صرف ''بانی پاکستان'' لکھتا ہوں۔ میں صرف ایک شخصیت کا پرستار ہوں اور وہ ہیں محمد مصطفیٰ ﷺ۔ میں گنہگار اور عاشق ہوں، دوسرا کوئی شخص میری زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت کا حامل نہیں جسے آپ رول ماڈل کہتے ہیں۔ یہ وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں، ویسے تو میری ماں ہیں، میں اپنے بچوں اور دوستوں سے محبت کرتا ہوں۔ میرے بچے بہت اچھے ہیں، میرے دوست بڑے پیارے ہیں مگر یہ اور بات ہے البتہ آپ نے جو رول ماڈل کی بات کی ہے وہ سوائے نبی کریم ﷺ کے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ عشق ہے، محبت ہے اور عقیدت ہے تو یہ صرف محمد ﷺ کے لئے۔

س: آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟

ج: ایک نہیں میرے تو معاشقوں کی اتنی طویل داستان ہے کہ جوش صاحب کے معاشقوں کی آپ بیتی

Marfat.com

فارغ ہو جائے گی۔اب میں ''لائل پور سے بیلی پور تک'' کے عنوان سے اپنی سوانح لکھ رہا ہوں۔اس میں بڑی بڑی مشہور شخصیات کا ذکر آئے گا۔یہ سوانح میں بڑا بدلحاظ ہو کر لکھوں گا۔

س: عشق میں تو غالب نکما ہو جاتا ہے مگر آپ نکمے نہیں ہوئے؟

ج: آپ نے جن معنوں میں عشق پوچھا ہے میں نے اس طرح کا عشق نہیں کیا۔میں نے فرہاد اور مجنوں والا عشق نہیں کیا۔میں آپ کو بتاؤں عشق صرف ایک ذات سے ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف محمد ﷺ سے ہو سکتا ہے۔جس کے ذکر پر آپ کو آنسو روکنے پڑیں وہ عشق جو خواب میں آئے وہ عشق جو سدا چلتا رہے۔یہ تو فلرٹیشن ہے وہ تو اپنی اوقات اور بساط کے مطابق ہر آدمی کرتا ہے میرے بھی اس طرح کے بے شمار عشق ہیں۔

س: کوئی اچھا کام جو بس ہو گیا؟

ج: اس کی میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا مگر بہت مطمئن ہوں۔

س: جیون ساتھی سے ذھنی ہم آہنگی کیسی ہے؟

ج: زبردست .... اعلیٰ ترین۔

☆☆...........☆☆...........☆☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

Marfat.com

Marfat.com

تقسیم ایوارڈ میں ہمیشہ ڈنڈی ماری جاتی ہے

عطاءالحق قاسمی

عطاءالحق قاسمی ایک ادیب، شاعر، کالم نگار، ڈرامہ نویس، مزاح نگار اور استاد بھی ہیں، استاد ان معنوں میں نہیں کہ وہ بڑے ''استاد'' ہیں بلکہ صحیح معنوں میں ان کا تعلق درس و تدریس سے بھی رہا ہے۔ ان کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کا تعارف کروانا بھول گیا کہ وہ نواز شریف دور میں ان کی غریب نوازی کی بدولت ناروے میں سفیر بھی رہے ہیں۔ اردو جریدے معاصر کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں، ان تمام خوبیوں پر ان کی جو خوبی ان کی تمام صفات اور صلاحیتوں پر حاوی ہے وہ ان کی دوست نوازی اور سادگی ہے انہیں اپنی شخصیت کے جس پہلو سے زیادہ محبت ہے اور جسے وہ اپنی شناخت کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ ان کی مزاح نگاری ہے تاہم مزاح نگاری کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے باوجود انہوں نے اپنے اس انٹرویو میں بڑی سنجیدہ باتیں کی ہیں، آیئے ان سے ملاقات کرنے چلیں۔

س: ادیبوں میں گروہ بندی بہت زیادہ ہے کوئی قاسمی گروپ بنا ہے کوئی ڈاکٹر وزیر آغا گروپ بنا ہوا ہے، ادب پیچھے چلا گیا ہے اور مفادات آگے آ گئے ہیں، ادبی ایوارڈز بھی ان لوگوں کو ملتے ہیں جن کا کبھی نام تک نہیں سنا گیا ہوتا، مجید امجد ایک حقیقی شاعر تھا وہ ساہیوال میں ایک چھوٹے سے کمرے میں مر گیا؟

Marfat.com

ج: آپ کے سوال کے دو حصے ہیں، ایک تو ہے گروپ بندی، پہلی بات تو یہ ہے کہ گروپ بندی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن دو ادبی گروہوں کا آپ نے ذکر کیا ہے یہ مفادات پر مبنی ہے یا نظریات پر مبنی ہے، ان میں سے اگر کوئی مفاداتی ٹولہ ہے وہ تو قابل نفرت ہے، لیکن اگر کچھ ہم خیال لوگ اکٹھے ہوں اور ایک طرح سے سوچتے ہیں اور ایک پلیٹ فارم سے بات کرتے ہیں تو یہ بڑی اچھی بات ہے، آپ نے وزیر آغا گروپ کا نام بھی لیا تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وزیر آغا گروپ کا کوئی وجود نہیں ہے دراصل یہ تو احمد ندیم قاسمی جیسی قد آور شخصیت کے سامنے وزیر آغا کا قد بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔ جو بڑی کامیاب کوشش ان معنوں میں رہی ہے کہ دونوں میں بڑی چپقلش ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ رائٹر ہیں، آپ روزنامہ انصاف میں ہیں، بہت سی چیزیں آپ نے پڑھی بھی ہوں گی، وزیر آغا کے خلاف جتنی تحریریں لکھی گئی ہوں وہ بھی آپ جمع کر لیں، اگر تین یا چار تحریروں سے آگے نکل آئیں تو پھر بھی کوئی بات ہے۔ وہ بھی پتہ نہیں کہ لکھنے والے کون ہیں جبکہ قاسمی صاحب کے خلاف ڈاکٹر انور سدید جو ہیں یہ 25 ہزار تحریریں لکھ چکے ہیں اور یہی شور مچاتے رہتے ہیں صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ احمد ندیم قاسمی صاحب ہیں، چنانچہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جہاں احمد ندیم قاسمی کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ بڑی کامیاب سازش ہے جبکہ حقیقت میں قطعاً کوئی گروہ بندی نہیں ہے۔ میں وزیر آغا کے مقام سے انکار نہیں کرتا وہ بہت سکالر آدمی ہیں، بہت زیادہ پڑھے لکھے انسان ہیں اور بہت اچھے نقاد ہیں مگر ان کی بس یہی خاصیت ہے جبکہ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہیں ان میں بھی یہی صفات ہیں، اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر بھی ان کے معیار کے آدمی ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سارے نقاد ہیں مگر یہ سب یک پرت لوگ ہیں تاہم جن کے ساتھ یہ مقابلہ کر رہے ہیں اس کی پرتیں بہت زیادہ ہیں، ابھی آپ جن لوگوں کا ذکر کر رہے تھے ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں ان کی بات کا جواب دوں تا کہ یہ کہا جائے کہ ہماری عطاء الحق قاسمی کے ساتھ بڑی لگ رہی ہے، جب لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کس کے ساتھ لگ رہی ہے لہٰذا اس حوالے سے اُن کا نام بھی آ جائے گا۔ آپ کے سوال کا دوسرا حصہ ایوارڈز کے بارے میں تھا۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ ایوارڈز کے بارے میں میں خود بھی کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ جب میں ایوارڈز کی فہرست پڑھتا ہوں تو مجھے بھی لگتا ہے جیسے کہیں ڈنڈی ماری گئی ہے، ویسے بھی دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا ایوارڈ ہو لوگ کبھی اس پر مطمئن نہیں ہو سکے۔ ہر بار نوبل پرائز متنازعہ بن جاتا ہے اور ان کی بددیانتی دیکھیں کہ علامہ اقبال کو وہ ایوارڈ نہیں ملا، اگر اقبال کو نہیں ملا تو اس کے بعد اگر کسی کو ملے گا تو مجھے نہیں معلوم کہ اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ اسی طرح پرائڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈز ہیں، اس میں ہم یہ تو کہہ

Marfat.com

سکتے ہیں کہ اکادکا لوگوں کو غلط ایوارڈز ملے ہوں گے مگر جن کو ملے ہیں ان کو ذرا بعد میں ملنے چاہئیں تھے۔اس سے پہلے ان سے بہتر لوگ موجود تھے انہیں ایوارڈز ملنے چاہئے تھے اس میں تقریب وتقدیم والا مسئلہ ہو جاتا ہے کہ جن کو پہلے ملنا چاہیے انہیں بعد میں ملتا ہے اور جن کو بعد میں ملنا چاہیے تھا انہیں پہلے مل جاتا ہے مگر جیسا میں نے کہا کسی ایوارڈ پر کوئی متفق نہیں ہو سکتا۔ جب کورٹ کا فیصلہ اخبار میں آتا ہے تو اس پر بھی سارے متفق نہیں ہوتے۔اس میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔

س: ہمارے جتنے لکھنے والے ہیں وہ صرف ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں، اصل قومی مسائل اور برائیوں کی نشاندہی نہیں کرتے مثلاً اس وقت کیبل نیٹ ورک کے ذریعے گھر گھر جو ننگے اور بیہودہ پروگرامز دکھائے جا رہے ہیں جو ہماری نوجوان نسل کو اسلام سے دور لے کر جا رہے ہیں، ان کے خلاف کبھی کسی کالم نگار نے کچھ نہیں لکھا۔کیبل کے سو چینلز میں سے صرف تین یا چار اسلامی چینلز ہیں جبکہ باقی سارا گند پڑا ہے، کیا ہمارے کالم نگاروں کا یہ فرض نہیں کہ وہ اس برائی کے خلاف باقاعدہ ایک مہم چلائیں۔ ماضی میں پیپلز پارٹی پر یہ الزام رہا ہے کہ جب اس کی حکومت آتی ہے تو میڈیا مادر پدر آزاد ہو جاتا ہے مگر اب تو پی پی کی حکومت نہیں ہے، آجکل الیکٹرانک میڈیا جو کچھ کر رہا ہے شاید پیپلز پارٹی کے دور میں اس کا ایک فیصد بھی نہیں ہوگا۔آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ج: آپ کیبل وغیرہ میں جس ننگے پن کی بات کر رہے ہیں اس کو تو آپ غنیمت سمجھیں مگر جو ننگا پن میں نے دیکھا اس سے تو میں واقعی پریشان ہو گیا ایک بار رات کو مجھے نیند نہیں آرہی تھی میں نے ٹی وی لاؤنج میں آکر ٹی وی لگا دیا۔اُپل صاحب آپ یقین کریں گے کہ کیبل پر ٹرپل فلم چل رہی تھی۔ میں نے تو آنکھیں بند کر لیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر اگلے روز جب دانستہ ٹی وی لگایا تو ویسی ہی ننگی فلم چل رہی تھی، اب بھی میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ راتوں کو کیبل پر بلیو فلمیں چلتی ہیں مگر کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔اس کے علاوہ میرا ایک اعتراض اور طرح کا ہے، میں یہ پوچھتا ہوں کہ غریبوں کے بچے کہاں جائیں، جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ سارے کا سارا امیروں کا چکر دکھا رہے ہیں۔ مزاح بھی امیروں کے لئے ہے جو ڈرامہ ہے وہ بھی امیروں کی زندگی کے گرد گھومتا ہے جو ملبوسات دکھائے جا رہے ہیں وہ بھی سب امیروں کے ہیں۔ میں تو یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوں کہ جو لاکھوں گھروں میں کام کرنے والیوں کی بچے، مزدوروں کے بچے اور مالی کی بیٹی جو کچھ دیکھ رہی ہے اسے تو یہ سب دیکھ کر ٹی بی لگ جائے گی اور یہ خون ناحق آخر کس کی گردن پر ہوگا۔کوئی اسے روکنے والا ہے اور نہ سمجھنے والا ہے نہ ہی اس کے آگے کوئی بند باندھنے والا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو مل جل کر اس رجحان

Marfat.com

کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ موسیقی کا بھی جو پروگرام ہے وہ بھی ایک مخصوص کلاس کے لئے ہے، اس میں بھی ہمارے غریبوں کے جو بچے ہیں ان کی کوئی ذہنی تفریح موجود نہیں ہے، صرف ان کو فرسٹریٹ کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے خلاف جتنی بھی آواز اٹھائی جائے وہ کم ہے۔

س: آپ نے کبھی اس کے خلاف لکھا ہے؟

ج: میں نے دو تین مرتبہ لکھا ہے، اصل میں میرا مرکزی نقطہ یہ رہا ہے کہ حرص اور لالچ کے خلاف اور ان دونوں چیزوں کو تیز کرنے والے نظام کے خلاف، میرا ہمیشہ قناعت پر زور رہا ہے۔ ندیم اُپل صاحب ہمیں معاشرے میں جتنی بھی خرابیاں نظر آ رہی ہیں، ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ماؤں کی جو گودیں ہیں وہ قناعت کے درس سے خالی ہوگئی ہیں، پہلے یہ ہوتا تھا کہ مثلاً 1970ء میں جب میں نے امریکہ جانا چاہا تو مجھے روکا گیا کہ تم نے نہیں جانا۔ میں کہتا تھا کہ میں آپ کے لئے پیسے کما کر لاؤں گا مگر مجھے کہا گیا کہ ہمیں تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں وہاں گیا مگر دو سال بعد سب کچھ چھوڑ کر واپس آ گیا۔

لیکن اب مائیں اپنے بچوں کو باہر قتل گاہوں میں بھجواتی ہیں اور کہتی ہیں ہم نے تمہاری پیٹھ دیکھی ہے اور اللہ کرے ہم تمہاری شکل کبھی نہ دیکھیں، یہ صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ لہٰذا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو معاشرے میں جس قدر برائیاں نظر آ رہی ہیں اگر آپ ان کی تہہ میں جائیں تو ان سب کا سبب قناعت میں محرومی ہوگا۔ کوئی بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہے۔

یہ شہر وہ ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں
دادِ ستم نہ دے کہ ستمگر بھی خوش نہیں

سب لوگ بے چین ہیں، سب مضطرب ہیں، میرا ایک شعر ہے کہ

خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لئے
خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہیے

میں یہ نہیں کہتا کہ انسان اپنے دل میں خواہشیں نہ پالے جس دِل میں خواہشیں نہیں ہیں وہ دل نہیں ہے بلکہ قبرستان ہے، انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس سے خواہشات چھین لی جاتی ہیں مگر خواہش وہ رکھیں کہ جہاں تک آپ کی رسائی ہو سکتی ہو جو حقیقت پسندانہ ہو، ہماری جتنی خواہشیں ہیں وہ اب غیر حقیقی بنتی جا رہی ہیں۔ ہم دوسروں کا منہ لال دیکھ کر اپنا منہ طمانچوں سے لال کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یوں ہر قدم ہمیں

Marfat.com

زندگی سے بیزار کرتا چلا جا رہا ہے۔

س: ابھی آپ نے فرمایا: کہ ٹیلی ویژن پر جو کچھ بھی انٹرنیٹ کے لئے دکھایا جا رہا ہے وہ ایک مخصوص کلاس کی تفریح کے لئے دکھایا جاتا ہے، ایک زمانہ تھا ہمارے ٹیلی ویژن پر اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لکھے ڈرامے پیش کئے جاتے تھے؟

ج: بالکل آپ نے درست کہا میں ابھی جو بات کر رہا تھا تو اشفاق احمد کے ڈرامے ''فہمیدہ کی کہانی''، آپ یہ سمجھ لیں کہ وہ میری باتوں کا نچوڑ ہے۔

س: مگر اب یہ کہا جا رہا ہے کہ ٹیلی ویژن والے بہت سست ہو گئے ہیں اور پرائیویٹ پروڈکشن میں بننے والے ڈرامے جو ہماری تہذیب اور کلچر سے میل نہیں کھاتے وہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی اب واحد پیش کش ''خبرنامہ'' رہ گیا ہے۔ کیا اس ادارے کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے؟

ج: مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ یہ کسی سازش کے تحت ہو رہا ہے جیسے ہمیں ہماری اقدار سے دور پہنچانے کی سازش کی جا رہی ہے یا جیسے معاشرے کو فرسٹریٹ کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اب آپ ٹیلی ویژن پر جتنے بھی ڈرامے دیکھ رہے ہیں، یہ رائیٹر Oriented نہیں ہیں، پہلے رائیٹر Oriented ڈرامہ ہوتا تھا، مگر اب کوئی ڈرامہ محمد بشیر لکھ رہا ہے تو کوئی غلام حسین لکھ رہا ہے، اور یہ سب لوگ زی ٹیلی ویژن کی نقل میں اس کا چربہ اتارتے چلے جا رہے ہیں، یہ سارا گند ٹی وی کے اسی ایم۔ ڈی نے ڈالا تھا جو نواز شریف کے زمانے میں لگایا گیا تھا، اس نے یہ کہا کہ کوئی بھی کمپنی یا ادارہ ٹیلی ویژن کا ٹائم خرید سکتا ہے، اس طرح اس ایم۔ ڈی نے ٹیلی ویژن کو ایک منافع بخش کا بھاڑ بنا دیا۔ گویا اس نے ٹی وی کو طوائف کا درجہ دے دیا کہ جو بھی ٹیلی ویژن کو اگر پیسے دے وہی ٹھیک ہے، اسی ایم ڈی کے دور میں جو کچرا اور گند آنا شروع ہے، اسے اس کے بعد وہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اب ہمیں بھی ٹیلی ویژن والے ڈرامہ لکھنے کے لئے کہتے ہیں مگر ہم ایسے تو نہیں ہیں کہ ان کے لئے فارغ بیٹھے ہوئے ہیں وہ شاید یہی سمجھتے ہیں کہ ابھی ان کا ٹیلی فون آئے گا اور ہم بھاگے بھاگے ہاتھ میں تھیلا پکڑ کر وہاں پہنچ جائیں گے۔

س: اشفاق احمد (مرحوم) کو بھی یہی شکایت تھی کہ ان کے ڈرامے کو محمد نثار حسین، محمد عظیم اور سائرہ کاظمی ہی سمجھ سکتے تھے اب چونکہ ان کے لکھے کو سمیٹنے والا پروڈیوسر نہیں ہے اس لئے انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے؟

ج: اشفاق احمد صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا، اب چونکہ محنت کرنے والے قابل پروڈیوسرز نہیں رہے، اس لئے اچھا لکھنے والوں کا دل بھی اچاٹ ہو گیا ہے، بعض اچھے پروڈیوسرز جو ٹیلی ویژن چھوڑ چکے ہیں یا

Marfat.com

ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اب وہ پرائیویٹ پروڈکشن کے لئے کام کر رہے ہیں۔

س: پاکستان کا نام ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان، مگر پاکستان میں کبھی مکمل جمہوریت آئی ہے اور نہ ہی کبھی مکمل اسلام نافذ ہوا ہے۔ جمہوریت آئی بھی تو اس طرح کہ کسی وزیر اعظم کو 22 ماہ میں، کسی کو بھی 26 ماہ میں چلتا کیا گیا۔ ایک وزیر اعظم کو پھانسی پر چڑھا دیا تو دوسرے کو اس وقت ڈس مس کر دیا گیا، جب وہ غیر ملکی دورے پر تھا جبکہ فوجی حکمرانوں نے یہاں دس دس سال کی شاندار اننگ کھیلی بحیثیت ایک قومی کالم نگار کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ اس ملک میں کبھی مکمل اسلام نافذ ہوگا اور صحیح معنوں میں جمہوریت آئے گی۔

ج: میں سمجھتا ہوں کہ مایوس نہیں ہونا چاہیے، میں کبھی بدترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہوا، اس لئے کہ اگر ہم مایوس ہو جائیں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو ایسی کیفیت کا بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ کبھی آپ مایوسی میں یا غم کے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں تو آپ کے ہاتھ جو پہلے پوری طرح حرکت کر سکتے تھے، آپ کے ہاتھ حرکت نہیں کر سکیں گے، ٹانگوں میں جان نہیں رہتی، بندے سے چلا نہیں جاتا، اسی لئے میرے خیال میں جو دانشور مایوسی پھیلاتے ہیں میں ان کے بہت خلاف ہوں۔ جیسا کہ آپ نے اپنے سوالات میں ملکی حالات و واقعات کی بڑی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ قوم میں ایک امنگ ہو جس سے ایک جذبہ پیدا ہو کیونکہ میرے لئے اس وقت سب سے اہم چیز جو امید کی کرن بن کر آئی ہے۔ اپنی قوم میں جو نیا رجحان میں نے دیکھا، وہ یہ ہے کہ جو ہماری اپر کلاس تھی اس میں بہت سارے لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کو ہم برگر فیملی بھی کہتے ہیں جو فلاحی کاموں میں جت گئے ہیں۔ مجھے ایسے طبقے کے بارے میں روزانہ نئی اطلاع ملتی ہے کہ فلاں بھی یہ کام کر رہا ہے، فلاں بھی یہ اچھا کام کر رہا ہے، ایک تو این۔ جی۔ اوز والے ہیں ان کو میں نہیں مانتا، ان کی تو بڑی تعداد ٹاؤٹ ہے، جس ملک سے یہ این جی اوز پیسے لیتی ہیں وہ اس ملک کے لئے کام بھی کرتی ہیں۔ میں تو ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو بغیر کسی غیر ملکی امداد کے اپنی جیب سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ مثلاً کسی نے سکول کھولا ہے اور وہاں غریب بچوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جا رہی ہے کسی نے ہسپتال کھولا ہے تو وہاں سو ڈاکٹرز فری ٹائم دے رہے ہیں، وہاں ایکسرے الٹرا ساؤنڈ اور تمام ٹیسٹ فری سروس دے رہے ہیں، اس طرح بے شمار لوگ ایسے ہیں جو تعمیر وطن میں جت گئے ہیں۔ میرے نزدیک تعمیر وطن کے جذبے کا ایک زبردست رجحان ہے۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسی قوم نے عبدالقدیر خان بھی پیدا کیا ہے، اسی قوم نے عبدالستار ایدھی بھی پیدا کیا ہے، اسی قوم نے عمران کو بھی توفیق دی کہ وہ اپنا ایک ہسپتال بنائے اور اس قوم نے ابرار الحق کو بھی توفیق دی کہ اس نے ''سہارا'' بنا دیا، لہٰذا ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کا

Marfat.com

جو خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا اسی کی تعبیر اگر میں نہ دیکھ سکا تو آپ ان شاءاللہ ضرور دیکھیں گے۔

س: آپ کے بہت سے پرستار اور بہت سے چاہنے والے ہیں، بہت سے نہیں ہوں گے مگر آپ کس کے فین ہیں؟

ج: رائیٹرز میں سے یا عام شخصیات میں سے؟

س: کوئی بھی ایک شخصیت جس کے آپ عام طور پر فین ہوں ؟

ج: میں اقبالؒ کا فین ہوں۔

س: کیوں؟

ج: میں جب اقبالؒ کو پڑھتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور میں ایسی دنیا میں پرواز کرنے لگتا ہوں جو بہت رفعتوں والی دنیا ہے چنانچہ جب کبھی میں نے اقبالؒ کو پڑھا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ کلام کسی انسان کا لکھا ہوا ہے، لہٰذا میں تو اپنے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مسلمان بھی ہوں تو اقبالی مسلمان ہوں۔ میں اقبالؒ کا فین ہوں اور اگر آپ سیاست کی بات کریں تو قائداعظمؒ سے زیادہ مجھے کسی سے عقیدت نہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

[illegible]

Marfat.com

Marfat.com

میں ضیاء الحق دور کا پہلا قیدی تھا

نذیر ناجی

صحافتی دنیا میں نذیر ناجی کا نام ایک سند کا درجہ رکھتا ہے وہ بیک وقت صحافی، کالم نگار، شاعر اور دانشور ہیں فوجی حکمرانوں کے دشمنوں اور سول حکمرانوں کے دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے روزنامہ ''انجام'' سے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا۔ عمر میں پاکستان سے دس سال بڑے ہیں شاید اس لئے انہوں نے اپنے قلم سے پاکستان کی بقا، سلامتی اور وقار کی حفاظت کر کے اپنے بڑے ہونے کا حق ادا کیا وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی سند نہیں ہے مگر ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والوں کے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک طویل نشست میں ان کی صحافتی اور ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ آیئے نذیر ناجی سے ملتے ہیں:

س: صحافتی زندگی کے ابتدائی دن کیسے تھے؟

ج: بطور صحافی ہمارے دور میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، اب تو شاید وہ سارے مراحل ختم ہو گئے ہوں، میں ابتداء میں پروف ریڈر بھی رہا ہوں Subing بھی کی اور رپورٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا پھر ایک مرحلے پر میں نے اپنا اخبار ''حیات'' نکالا تو سبھی کچھ ہی کرنا پڑا، جب میں جنگ کے رپورٹنگ سیکشن میں تھا تو

Marfat.com

اس زمانے میں میرے ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں کا اب بھی یہی کہنا ہے کہ رپورٹنگ کا وہ معیار جو ہمارے زمانے میں تھا اب نہیں رہا۔ اس زمانے میں میرے ساتھی خوشنود علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ صحافت تھے، انجم رشید، سکندر لودھی، ارشاد عارف اور جمیل چشتی تھے۔ اس ساری ٹیم نے جس طرح سے کوریج کی وہ اردو اخبار کے لئے ایک اچنبھے کا باعث تھی۔ اس زمانے میں چونکہ مارشل لاء تھا اس لئے ہم نے میگزین میں سیاسی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا۔ خبروں پر سنسر تھا لہٰذا انٹرویوز کے بہانے ساری باتیں ہو جایا کرتی تھیں، راؤ رشید کا میں نے جب پہلا انٹرویو کیا اور اس کی پہلی قسط چھپی مگر جب وہ سنسر ہوا تو اس کی دوسری قسط روک دی گئی۔ بعد میں منیر احمد منیر نے راؤ رشید کے طویل انٹرویوز پر کتاب لکھی جو بہت زیادہ چھپی۔ دراصل یہ میرے اسی انٹرویو کا تسلسل تھا حکومت نے جن کی دوسری قسط بھی چھپنے نہیں دی تھی۔

س: آپ صحافت کے شعبہ میں اتفاقیہ طور پر آئے یا آپ کے والدین بھی آپ کو یہی کچھ بنانا چاہتے تھے؟

ج: جب بچے کو کچھ بنانے کے بارے میں سوچا جاتا ہے اس وقت ہر چیز مفروضے پر ہوتی ہے میں نے جب ہوش سنبھالا تو برصغیر کی تقسیم ہو چکی تھی اور پاکستان بن گیا تھا، لوگ یہاں آ کر Settle ہو رہے تھے۔ ہم بھی وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، پہلے ہم بہاولنگر گئے پھر جھنگ آ گئے اور بعد میں لائل پور (فیصل آباد) چلے گئے۔ یہ ایک ابتری کا دور تھا، بچپن میں بڑی بدحالی تھی، دوسری جماعت تک گیا تو پھر مشکلات کا دور شروع ہو گیا بڑے بحرانوں سے گزرنا پڑا۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ میرا سارا پڑھنا میری اپنی محنت ہے میں اس زمانے میں سموسے بھی بیچا کرتا تھا اور میرا جو دوکاندار تھا اس سے میں سبق وغیرہ بھی پوچھ لیا کرتا تھا، ایسے ہی پڑھتے پڑھتے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ 1964ء کی بات ہے جن دنوں میں روزنامہ انجام میں تھا کچھ لوگوں نے مجھے تنگ کرنے کے لئے ترجمہ دے دیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا ڈکشنری نکالی اور ترجمہ شروع کر دیا۔ وہ لوگ خبریں بھی مجھے مشکل نوعیت کی دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب زیادہ غصہ آیا تو میں نے ڈان اخبار لگوا لیا لہٰذا اردو اخبارات سے اردو اور ڈان سے انگریزی سیکھی۔

س: پاکستان نے آپ کو عزت، شہرت اور مقام دیا جواب میں آپ نے اسے کیا لوٹایا؟

ج: پاکستان میں عوام کی جو بھی جدوجہد رہی ہے، میں اس میں شامل رہا ہوں کم از کم آج کے صحافی بہت کم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ ہر فوجی حکومت میں جیل گئے یہ کریڈٹ صرف مجھے حاصل ہے کہ میں یحییٰ خان کے دور میں جیل میں تھا اور ضیاء الحق دور میں بھی پہلا صحافی قیدی میں تھا۔ مشرف صاحب نے بھی میرے ساتھ آتے ہی ایسا ہی سلوک کیا۔ میں بھی ہر فوجی حکومت میں پہلی مزاحمت کرنے والے لوگوں میں شامل رہا ہوں مگر بات یہ

Marfat.com

ہے کہ لوگ یہ تو تاثر لیتے ہیں کہ آج ناجی کیا ہے مگر اس کے پیچھے جدوجہد کتنی ہے یہ کوئی نہیں دیکھتا، میرے خیال میں اس کی وجہ کچھ بے صبری بھی ہے مگر ہم نے بے صبری کیوں نہیں کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے دور میں روزی کے ساتھ ساتھ جرنلزم اظہار کا ایک ذریعہ بھی تھا اور ہم اپنی پسند و ناپسند دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں نوکری کرنا یا چھوڑنا زیادہ مشکل نہیں تھا، تھوڑی تھوڑی تنخواہیں تھیں، ویج بورڈ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ جب آپ کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو تو پھر آپ مادی خواہشات کی تکمیل کو بھول جایا کرتے ہیں۔ اب آئیڈیا نہیں رہ گئے، مشن نہیں رہ گئے اور ویج بورڈ ایوارڈ نے تو اس کو بالکل ٹریڈ یونین اور پروفیشنل بنا کر رکھ دیا ہے۔ ٹریڈ یونین باہر بھی ہوتی ہے مگر وہاں پروفیشنل کو ترجیح دی جاتی ہے جبکہ یونین Activities ایک سیکنڈری سی بات ہوتی ہے۔ یہاں بھی کچھ لوگ آئیڈیا کے ساتھ آتے ہوں گے مگر میں نے دیکھا ہے کہ عموماً اس فیلڈ میں آنے والے آتے ہی کار مانگتے ہیں، پریس کارڈ اور ایکریڈیشن کارڈ کی ڈیمانڈ آتے ہیں، اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ پلاٹ کہاں مل رہے ہیں۔ پھر وہ ہاؤسنگ سوسائٹیز کے ممبر بنتے ہیں۔ اب ایسا ماحول ہے کہ ایک صحافی کو آتے ہی یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر جو محروم رہ جاتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ فلاں نذیر ناجی بن گیا، فلاں یہ بن گیا فلاں یہ بن گیا وغیرہ وغیرہ مگر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے پیچھے جدوجہد کتنی ہے، وہ صرف یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ مراعات جو کسی کو چالیس پچاس سال میں ملتی ہوں، مجھے وہ چار پانچ سال کے اندر کیوں نہیں ملیں۔

س: آپ فوجی حکمرانوں کے زیر عتاب رہے مگر سنا ہے کہ سول حکمران آپ سے بہت محبت کیا کرتے تھے؟

ج: یہ بھی عجیب لطیفہ ہے دراصل سول حکمرانی کا میرے ہوش میں جو دور آیا وہ ذوالفقار علی بھٹو کا تھا اور اس سے پہلے مارشل لاء تھا۔ بھٹو صاحب سے بہت نیازمندی تھی مگر مصطفیٰ کھر صاحب نے آتے ہی مجھ سے جھگڑا شروع کر دیا، یوں بھٹو صاحب کے پورے دور میں زیر عتاب رہا، پھر ایک مرحلہ پر جب کھر صاحب میرے گھر چلے آئے تو میری بدنصیبی کہ میں ان کے ساتھ پرانے رشتے بحال کرنے لگا مگر اس پر حنیف رامے صاحب نے ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا۔ البتہ جب 1975ء میں بھٹو صاحب الیکشن میں آنا چاہتے تھے تو انہوں نے مجھے بلوایا کیونکہ اس وقت ان کے خلاف تحریک بن رہی تھی بلکہ ایک سیاسی محاذ سا بن گیا تھا۔

اصغر خان کے بڑے بڑے جلسے جلوس ہو رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ بھٹو ہار جائے گا چنانچہ بھٹو صاحب نے ایک الیکشن سیل بنایا۔ اس میں جب انہوں نے لکھنے والوں کو دعوتیں دی تو ان کے لکھنے والے سارے لاڈلے ہی بھاگ گئے مگر میں نے جا کر جوائن کیا اور میں نے اس الیکشن میں بہت کام کیا لہٰذا بھٹو صاحب کے ساتھ پہلے چند ماہ جب میں ''مساوات'' کا ایڈیٹر رہا اور مساوات سے الگ ہوا تب حکومت سے تلخی

Marfat.com

اور دوری شروع ہوگئی یعنی بھٹو صاحب کے دور عروج میں ان کے زیر عتاب بھی رہا ہوں مگر جب بھٹو صاحب خود زیر عتاب آئے تو ان کا ساتھ دینے چلا گیا۔ جس کا ضیاء الحق دور میں لمبا چوڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جونیجو صاحب سے بھی میری کوئی خاص دوستی نہیں تھی، جہاں تک نواز شریف کا تعلق ہے تو جب تک وہ وزیر اعلیٰ رہے تب ان کے ساتھ رسمی سے تعلقات تھے۔ ان سے تعلقات کی ابتداء 1990ء میں ہوئی جب وہ وزیر اعظم بنے لہٰذا تلاش شروع ہوئی کہ قوم سے خطاب کی جو تقریر ہوتی ہے وہ کس سے لکھوائی جائے ہر جگہ Speech Writing سیل ہوتے ہیں، جو وہاں بھی تھا مگر ان کا کام انہیں پسند نہیں آیا، کچھ اور لوگوں کو بھی Try کیا اور بالآخر مجھے Try کرنے کا فیصلہ ہوا۔ سیاستدانوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ چار پانچ مشیروں کا گروپ اپنے ساتھ رکھتے ہیں وہ اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان میں سے ایک بندہ اپنی تقریر سنانے لگتا تھا پھر دوسرا تیسرا چوتھا اپنی تقریر سناتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو اس کام کی سمجھ نہیں تھی، ان لوگوں نے نواز شریف کے حلف اٹھانے سے پہلے ہی وزیر اعظم کی تقریر لکھنا شروع کر دی تھی۔ میں نے جب یہ ماحول دیکھا تو ان سے کہا کہ ایسا تو مجھ سے کبھی نہیں ہو پائے گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تقریر ریکارڈ کر کے لے آتا ہوں اگر تو تاثر بنتا ہے تو میں لکھ دوں گا مگر اس طرح ایک ایک جملے پر کٹوتی کی تقریریں سنتے سنتے مجھ سے تقریر نہیں لکھی جائے گی۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے"۔ یہ ہمارے Points ہیں، آپ ان پر تقریر لکھ کر لے آئیں۔ چنانچہ میں گھر گیا وہاں میں نے تقریر لکھی اور اسے ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر کے کیسٹ لے گیا۔ اللہ کے فضل سے جب انہوں نے کیسٹ سنا تو درمیان میں بھی ان میں سے کسی ایک کو بھی روکنے ٹوکنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چنانچہ وہیں سے تقریر نویسی شروع ہوگئی اور ان سے میرے تعلقات زیادہ قریبی ہو گئے۔

یہ تو نواز شریف سے دوستی کی کہانی ہے مگر جب بے نظیر صاحبہ آئیں تو ان سے میرے دونوں ادوار میں ہی جھگڑے رہے۔ یہاں پر ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ پہلا دور جب غلام حیدر وائیں تھے تب شہباز شریف کھل کر سامنے نہیں آئے تھے، خدا جانے کہ ان کا اور میرا مزاج ملتا نہیں تھا، وہ بعض باتیں بڑھ کر کیا کرتے تھے مگر میں انہیں روک دیا کرتا تھا چونکہ وہ پہلے چیف ایگزیکٹو رہ چکے تھے اور اوپر سے وزیر اعظم کے بھائی تھے، انہیں اچھے لوگ وہ لگتے تھے جو ان کے مزاج کے مطابق باتیں کرتے تھے لہٰذا ان سے انجانے میں شروع ہی سے میری ان بن ہوگئی تھی۔ وہ موقع بے موقع کوئی نہ کوئی حرکت میرے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ یہ بات میاں صاحب کو بھی معلوم تھی کہ شہباز شریف سے میری بنتی نہیں مگر جب 12 / اکتوبر والا واقعہ ہوا تو پہلی رات جب ہم بیٹھے ہوئے تھے تو حسین نواز میرے ساتھ تھے، تب میں نے انہیں کہا کہ "حسین نواز! ابھی تک تو میاں نواز

Marfat.com

شریف کی سیاست کی خاطر شہباز شریف کی زیادتیاں برداشت کرتا رہا ہوں مگر اب بے شک حکومت میں آئیں یا نہ آئیں میں نواز شریف سے کھل کر بات کروں گا۔'' یہ میں نے اس وقت بھی باہر آنے سے پہلے کھل کر کہہ دیا تھا۔اس کے بعد وہ بھی اپنے جتن کر رہے ہیں، میں بھی کر رہا ہوں مگر ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا مزہ نہیں آتا کیونکہ وہ بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں ورنہ ہم تو بڑی اچھی لڑائیاں لڑتے رہے ہیں۔

س: آپ کو حکمرانوں کی طرف سے کبھی اعلیٰ عہدوں کی پیشکش ہوئی ہے؟

ج: بھٹو صاحب اور نواز شریف کے دور میں ایسی پیشکش کئی مرتبہ ہوئی ہیں مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ میری یہ کبھی بھی خواہش نہیں رہی۔ 1997ء میں نواز شریف نے مجھے اسلام آباد بلایا اور کہا کہ آپ کوئی ایسی ذمہ داری لے لیں جس پر کوئی انگلی نہ اٹھائے لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ آپ اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین بن جائیں۔ میں نے کہا دیکھئے میرے پاس ڈگری نہیں ہے، بہت شور مچے گا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے شور تو میں نے سننا ہے، میں نہیں سنوں گا۔ بہر کیف میں مان گیا اس وقت مشاہد حسین بھی موجود تھے، پرویز رشید بھی تھے، ان سب نے کہا مان جاؤ گر نہ میں تو نہیں مان رہا تھا۔اس کے بعد بھی جب وہ ملے تو میں نے کہا دیکھیں مجھ پر اعتراض آجائے گا کیونکہ میرے پاس ڈگری نہیں ہے، جس پر نواز شریف نے کہا میں آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دوں گا۔

س: آپ کے خیال میں ڈگریوں میں علم نہیں ہوتا؟

ج: جب ڈگریاں نہیں تھیں علم تو اس وقت بھی تھا لفظ پہلے بنتا ہے ڈکشنری بعد میں آتی ہے، علم پہلے اور پیمانے بعد میں آتے ہیں۔

س: صحافتی حلقوں میں آپ کے دوستوں سے زیادہ آپ کے دشمن ہیں؟ اس کی خاص وجہ؟

ج: دشمن تو میرے بہت ہیں، جس کی مجھے صرف ایک وجہ نظر آتی ہے، میں پی آر کا بندہ نہیں ہوں، آج کے دور میں زندگی میں صرف دو کام ہو سکتے ہیں اگر پی آر کریں گے تو آپ پڑھ نہیں سکیں گے، اگر پڑھ لیں گے تو پی آر کے لئے وقت نہیں ملے گا۔اب اتنی نالج دستیاب ہے کہ بعض اوقات مشکل پڑ جاتی ہے کہ کیا پڑھا جائے اور کیا نہ پڑھا جائے۔ میں تو صبح سویرے پانچ بجے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور مطالعہ میں کھو جاتا ہوں۔ اگر میں یہ بھی نہیں کروں گا کالم تو پھر بھی لکھ لوں گا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے کالم کے بارے میں تو مخالفین بھی کہتے ہیں کہ کالم اچھا لکھتا ہے۔لہٰذا اگر میں پی آر میں لگ جاؤں تو مخالفتیں ختم ہو جائیں گی۔ سارا دن گپیں لگانا کبھی ادھر نکل جانا، کبھی ادھر کسی دوست کے ساتھ چلے جانا مگر میں ایسا نہیں کرتا۔

س: آپ کالم اپنے لئے لکھتے ہیں، دوستوں کے لئے لکھتے ہیں یا اس ملک کے لئے لکھتے ہیں؟

Marfat.com

ج: کالم تو میں پوری قوم کے لئے لکھتا ہوں اور یہ سوچ کر لکھتا ہوں کہ قوم کو کوئی راستہ دکھاؤں اگر Decision Makers کسی مسئلہ پر توجہ نہیں دے رہے تو اس کی طرف توجہ دلاؤں، میرے کالم میں کوئی نہ کوئی لفظ یا معلومات ضرور ہوتی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میرے کالم کی 80 فیصد باتیں درست ثابت ہوتی ہیں، یہ جو باہر والوں کا قصہ ہو رہا ہے تو سب لوگوں نے لکھا جناب یہ تو کمال ہو گیا امن ہو گیا، اسلام بچ گیا مگر میں نے لکھا تھا یہ مشن مکمل نہیں ہوا بلکہ ملتوی ہو گیا ہے۔ جب یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہم کراچی میں تبدیلی لے آئیں گے تو میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسے کراچی تک محدود نہ سمجھیں، یہ آپ جو کچھ وانا میں کر رہے ہیں یہ اس کا ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔ کراچی میں تبدیلی لا کر آپ مغربی وزیرستان اور کوئٹہ میں کیا کریں گے، گلگت میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا حل کراچی میں تبدیلی نہیں ہوگا، یہ تو آپ کی پالیسیاں ہیں جس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، آج آپ نے دیکھ ہی لیا کہ کراچی میں کور کمانڈر پر حملہ ہو گیا۔

س: پاکستان میں ہمیشہ فوج کی حکمرانی رہی جبکہ منتخب وزرائے اعظم میں سے کسی کو جلاوطن کیا گیا تو کسی کو پھانسی دی گئی۔ آپ بطور دانشور اس سارے مسئلے کو کس انداز سے دیکھتے ہیں؟

ج: ہمارے ہاں جب فوج آتی ہے تو جو بھی سیاستدان اس کے خلاف بات کرتا ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ملک دشمن ہے جب مذہبی لیڈر آتا ہے تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے احکامات ہیں، وہ قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر اس وقت طاقت ان دونوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک طرف مذہبی سیاستدان ہیں اور دوسری طرف فوج ہے اور یہ دونوں ہی منطق نہیں سنتے، فوج کی بھی یہی تربیت ہوتی ہے کہ جو بھی جھگڑا ہے اسے طاقت سے طے کرو جبکہ مذہبی سیاستدان کہتے ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں وہی حرف آخر ہے، وہی اسلام ہے اور جو ہمارے خلاف بولے گا وہی اسلام کا کھلا دشمن ہوگا۔ جب دونوں طرف سے منطق اور مشاورت سے مسئلہ حل کرنے کا رویہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مسائل کیسے حل ہوں گے، بندوق سے ہی ہوں گے اور وہ ہو رہے ہیں۔

س: وانا آپریشن جو ہوا تھا، بلکہ ایک طرف سے اب بھی جاری ہے کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ یہود و نصاریٰ کے کہنے پر ہو رہا ہے دوسری طرف کراچی اور سندھ میں دہشت گردی کی وارداتیں بھی ہو رہی ہیں تو کیا ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا اس کے پیچھے واقعی کوئی بیرونی ہاتھ ہے؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں دنیا کو اس طرح سے دیکھتا ہی نہیں کیونکہ جنگیں مفادات، برتری، طاقت اور استحصال کے لئے ہوتی ہیں لہٰذا جس کے پاس زیادہ طاقت ہوتی ہے، وہ اپنے سے کم طاقتور سے اپنی شرائط منوانا چاہتا ہے اگر وہ مان جاتا ہے تو سمجھوتا ہو جاتا ہے اور اگر وہ نہیں مانتا تو گڑبڑ ہوتی ہے۔ ایسا ظہور اسلام سے پہلے

Marfat.com

بھی تھا، ہمارے پاس طاقت ہوتی تھی تو ہم بھی دوسروں پر حملہ کر دیا کرتے تھے ہم تو ویسے بھی کسی مذہب کے خلاف نہیں جتنے بھی اہل کتاب ہیں، ہم ان کو مانتے ہیں، مگر جب ہم نے سپین پر حملے کئے تو کیا وہ اہل کتاب نہیں تھے۔ ہم نے کیا عیسائی سمجھ کر حملے کئے تھے، کم از کم میں ایسا نہیں سمجھتا ہم نے تو محض مفادات کے لئے ایسا کیا تھا۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ امریکہ والے اور اتحادی فوج والے یہاں آ کر جو حملے کر رہے ہیں، یہ آج سے دوسو سال پہلے بھی کسی کے خلاف لڑا کرتے تھے، کیا اس وقت مسلمان نہیں تھے، اس سے پہلے صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں ان کا حاصل کیا ہوا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہم آپس میں ٹھیک رہتے تو شاید آج یورپ پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہوتا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر آپ ان کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیں تو آپ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے، پاکستان کی سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ اس کے حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے ایسے ایسے راستے تلاش کئے جن سے ہم اپنے مقصد سے ہٹ گئے۔ مثلاً جب پاکستان بنا تو بدنصیبی سے ہمارے جو پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان اگر الیکشن کرواتے تو بہت سی نشستیں جیت جاتے مگر حکومت بنانے کے لئے سیٹیں کہاں سے لاتے۔ پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ سہروردی ادھر پاکستان آئے۔ جب سہروردی چار پانچ ماہ بعد ادھر آ گئے تو اب انہوں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی، وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان جانتے تھے کہ ان کی اکثریت ہے اور اگر یہاں بھی یہ لوگ اکٹھے ہو گئے تو جمہوریت ان کے ہاتھ چلی جائے گی اور ہم باہر ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے ایک نیا کھیل شروع کیا اصل بات یہ تھی کہ جب پاکستان بنا ہے تو اس وقت کے علمائے کرام اقتدار کے کھیل میں شامل نہیں تھے۔ ان علمائے کرام کا اسلامی طرز حیات اتنا انتہا پسندانہ نہیں تھا جتنا آج کے علمائے کرام کا ہے مگر اس وقت لیاقت علی خان نے علماء کو کہہ کر سہروردی وغیرہ کے خلاف تحریک کا ماحول بنایا اور ان سے کہا کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے اسلامی اصول وضع کریں لہٰذا علماء کرام نے کہا کہ قرارداد مقاصد میں اسلام کے مطابق یہ تبدیلی کرنا پڑے گی اس لئے الیکشن تو نہیں ہو سکتے۔ ادھر بنگالیوں نے کہا کہ ہم آپ سے بڑے مسلمان ہیں، کیا اب حکومت ہمیں سمجھائے گی کہ ہم مسلمان ہیں، ہم نے تو پاکستان بنایا ہے کیا اب پاکستان ہمیں مسلمان بنائے گا، مگر ادھر یہ الیکشن کو ٹالتے گئے جبکہ صوبائی الیکشن کا ٹالنا بڑا مشکل تھا۔ یوں الیکشن ٹالتے ٹالتے کشمیر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا پھر اسی زمانے میں جونیجو ٹائپ کے جو کمزور ترین سیاستدان خواجہ ناظم الدین تھے، انہیں وزیر اعظم بنا دیا گیا تا کہ سہروردی کا راستہ روکا جا سکے یعنی سہروردی کا راستہ روکنے کے لئے انہوں نے پہلے علمائے کرام کو ملوث کیا اور جب ان دونوں نے اقتدار کا مزہ چکھ لیا تو فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ یہ بات آپ کے لئے دلچسپ ہو گی کہ علمائے کرام اور فوج کے درمیان باقاعدہ لڑائی ہوئی۔ جماعت

Marfat.com

اسلامی تو بہت زیادہ زیر عتاب تھی مگر جب مشرقی پاکستان کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور 1970ء کے الیکشن سے قبل انہوں نے دیکھا کہ اکثریت قبضہ کر لے گی اور ہم جمہوریت سے بھی بھاگ نہیں سکتے لہٰذا مشرقی پاکستان میں فوج اور صوبوں کے درمیان اقتدار کے معاملے میں پہلا اتحاد وجود میں آیا اور بھٹو صاحب سے جب یہی غلطی ہوئی تو انہیں بھی اڑا دیا گیا۔ پہلے تو یہ تھا کہ ہمارے علمائے کرام صرف سیاستدانوں کے ہاتھوں استعمال ہوا کرتے تھے۔ خود کوئی طاقت نہیں تھے صرف ان کے پاس مذہبی اثر ورسوخ تھا مگر آہستہ آہستہ ان کے لئے اقتدار میں ثمرات کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر جب ضیاء الحق نے امریکہ کے ساتھ مل کر علمائے کرام کو روس کے خلاف استعمال کیا تو ان کے پاس اسلحہ اور تحریک آ گئی۔

اب اس وقت ملک میں دو طاقتیں ہیں جو اقتدار کی دعویدار ہیں۔ ایک فوج وہ بھی منظم اور مسلح ہے، دوسرے علمائے کرام وہ بھی مسلح ہیں لہٰذا دو مسلح اور منظم طاقتیں جمہوریت سے ڈرتی ہیں کیونکہ جس دن صحیح الیکشن ہو گیا یہ دونوں قوتیں اقتدار سے باہر ہو جائیں گی لہٰذا یہ دو عناصر ملک میں کبھی جمہوریت نہیں آنے دیں گے۔

س: آپ، حسن نثار اور عباس اطہر شاعر بھی ہیں مگر کیا وجہ ہے کہ شاعری کے میدان میں آپ تینوں میں سے کوئی بھی اپنی پہچان نہیں بنا سکا؟

ج: آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کوئی بھی اچھا شاعر نہیں۔ یہ جو مشاعروں، ادبی محفلوں اور ادبی رسائل کی منڈی لگی ہوئی ہے وہ تو اس منڈی میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔ پھر ہمارے ہاں تیسرے درجے کے شاعر بھی ہیں جو پی آر او کے ذریعے کسی کا قصیدہ لکھ دیتے ہیں یا پھر ویزا بنوا کر باہر چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ کینیڈا چلے جائیں تو وہاں موجود سارے پاکستانی اکٹھے ہو کر آپ کے پاس آ جائیں گے اور پوچھیں گے کہ وہاں کیا ہوا۔ آپ شاعر ہوں یا نہ ہوں مگر لوگوں کی اپنے وطن سے جو محبت ہے وہ ان کو آپ کے پاس لے آتی ہے بس اسی طرح ان کا جیک لگ جاتا ہے جو ہمارے اصل شاعر ہیں، انہیں تو باہر جانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

س: پیپلز پارٹی پر الزام ہے کہ جب بھی اس کی حکومت آتی ہے، پی ٹی وی کا دوپٹہ اتر جاتا ہے مگر اب تو پی پی پی کی حکومت نہیں پھر یہ سب کون کر رہا ہے؟

ج: چار پانچ چینلز تو اسلامی ہیں باقی چینلز بھی آ رہے ہیں جہاں سے ان چینلز پر جو گند آتا ہے وہاں کے لوگ یہ نہیں دیکھتے، ان پر پابندی بھی کوئی نہیں، آپ لندن، یورپ اور فرینکفرٹ چلے جائیں جہاں پر ایسے سینما گھر بھی ہیں جہاں نیلی فلمیں چلتی ہیں مگر وہاں آپ کو کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی نظر نہیں آئے گی، سوشل سیکورٹی کے جو بوڑھے ہوتے ہیں وہ وہاں وقت گزارنے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس

Marfat.com

کا اخلاق صحیح ہے وہ اس طرف جاتا ہی نہیں ہیں، ہمیں بھی اپنے بچوں کی ایسی اچھی تربیت کرنی چاہیے؟

س: آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر کام فائدے کا کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا آپ نے اپنے کسی بیٹے کو صحافی نہیں بنایا، ایک کو تحصیل دار لگوایا اور دوسرے کو پولیس یا کسٹمز میں لگوا دیا۔ آپ کے بیٹوں کو یہ سب کچھ میرٹ پر ملا یا آپ کا بھی اس میں کوئی عمل دخل ہے؟

ج: میرے دونوں بڑے بیٹے صحافت کی طرف راغب ہیں اور نہ شاعری کی طرف ان کا کوئی رجحان ہے۔ اللہ کے فضل سے دونوں گریجویٹ ہیں اور اصل گریجویٹ ہیں، وہ آجکل والے گریجویٹ نہیں ہیں، اس زمانے میں جو ملازمتیں ملتیں وہ ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے کے کوٹے تھے، لہٰذا میں نے بھی اپنے کچھ دوست ایم۔ پی۔ اے کے کوٹوں سے انہیں ملازمتیں دلوائیں مگر ان کی ملازمتوں میں Relaxation of Rules بالکل نہیں ہیں۔ وہ میرٹ پر پورے ہیں، سیدھی بات یہ ہے کہ نوکری سفارش کے بغیر ملتی نہیں تھی۔ جبکہ میرے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا، ان کے خلاف کوئی جتنی چاہے تحقیق کر لے، انکوائریاں کروا لے اسے میرے بچوں کی کوئی کرپشن یا بدعنوانی نہیں ملے گی۔ آپ عوام سے پوچھ لیں یا ان کے متعلقہ افسران سے پوچھ لیں، دونوں ہی کہیں گے کہ میرے بیٹے ایماندار بھی ہیں اور باصلاحیت بھی ہیں۔ میرا جو سب سے چھوٹا بیٹا انیق ہے، اس میں ذرا رجحان مختلف تھا۔ وہ شاعری میں بھی دلچسپی لیتا ہے، اس نے بزنس وغیرہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ ٹیلی ویژن پر وہ کامیاب ہو گیا۔ پہلے وہ لندن کے ایک چینل سے وابستہ ہوا۔ مگر جب اے آر وائی بنا تو وہاں چلا گیا۔ اب وہ اے آر وائی کے فاؤنڈرز میں سے ہے۔

س: آپ اپنے بچوں کے باپ زیادہ ہیں یا دوست؟

ج: میں ایک بیٹے کا دوست باقی دو کا باپ ہوں، انیق کا دوست ہوں جبکہ جو دو بڑے ہیں وہ دوست نہیں بنتے ہیں۔

س: آپ کے بیٹے آپ کے موجودہ پروفیشن کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: ملازمت سے پہلے تو میرے بیٹے بہت خوش تھے مگر ملازمت کے بعد اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ باقیوں کو تو کوئی نہیں دیکھتا مگر ہم پر سب طرف سے کڑی نظر رہتی ہے۔ لوگ دشمن آپ کے ہوتے ہیں مگر نگرانیاں ہماری ہوتی ہیں جس طرح ہمیں کڑی نگرانی کے اندر نوکری کرنی پڑتی ہے دوسرے کو نہیں کرنی پڑتی شاید اس لئے کہ یہ ناجی کے بیٹے ہیں۔

س: یہ ناجی کس زبان کا لفظ ہے؟

Marfat.com

ج: یہ عربی لفظ نجات سے ہے یعنی نجات پایا ہوا۔نجات پانے والا، یہ ماڈرن عربیک ورڈ ہے، یہ نام سعودی عرب اور مصر میں بھی چلتا ہے جو میر طبقہ یا مڈل کلاس ہے اس میں یہ کامن نام ہے میں نے تو یہ نام بطور شاعر رکھا تھا میرا پورا نام تو نذیر احمد ناجی تھا۔

س: لکھنے والوں کی بیویاں ان کے پروفیشن میں ان کا بہت ساتھ دیتی ہیں، ان کی بہت معاونت کرتی ہیں ،آپ کی جیون ساتھی کے ساتھ آپ کا کیسا رویہ ہے؟

ج: عدم مداخلت۔

س: اسے تعاون کا نام نہیں دیا جاسکتا ؟

ج: تعاون کے لئے آپ کا جو آئی کیو لیول ہے یا چیزوں کے سمجھنے کا جو لیول ہے اگر یہ ایک ہو تو پھر بیوی کی مشاورت ایک سرمایہ ہے اگر لیول ایک نہیں ہے لیکن اگر وہ اپنا حق رفاقت استعمال کرتے ہوئے آپ کو مشورے دیتی ہے تو وہ سردردی ہے اس کے لئے عدم مداخلت کی پالیسی بہترین ہے جو میری بیوی نے اختیار کر رکھی ہے۔

س: آپ شاعر بھی ہیں اور شاعر عاشق مزاج نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی عشق کیا دوسرا سوال یہ کہ آپ واحد کالم نویس ہیں جنہیں رومانوی کالم نویس کہا جاسکتا ہے آپ کے کالموں میں کہیں نہ کہیں آپ کی شاعری کی جھلک ضرور ملتی ہے۔

ج: عشق کے معاملات کی باتیں تو نہ پوچھنا ہی اچھا ہوتا ہے کیونکہ اب میں بہوؤں والا ہوں، آگے ان کی سوشل لائف ہے دوسرا سوال کالموں میں رومانس ازم کے حوالے سے تھا، میں جس زمانے کی پیداوار ہوں وہ تو تھا ہی رومانس ازم، اس زمانے میں دلیپ کمار ہیرو تھا کامنی کاشل اور نرگس ہیرون تھیں۔اس زمانے میں اے حمید اور کرشن چندر مقبول لکھنے والے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں میں نے ذھنی اور شعوری تربیت حاصل کی ،میرے دور میں تو رومانس ہی رومانس تھا، آزادی کی جنگ بھی تو ایک رومانس ہوتی ہے۔

س: کبھی اداکاری کا شوق ہوا؟

ج: فلمی لائن میں ضرور گیا ہوں، کہانیاں لکھیں، گیت بھی لکھے، مگر اداکاری نہیں کی، کراچی میں ایک فلم ”فیصلہ“ تھی اس کے گانے میں نے لکھے، فلم شرارت جو محمد علی کی تھی اس کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہا ہوں فلم ”سات لاکھ“ میں بھی معاونت کی۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

ڈاکٹر انور

Marfat.com

Marfat.com

جب تک کسی ادیب کو لاہور تسلیم نہ کرے اسے ادیب شمار نہیں کیا جاتا

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید کا نام اردو ادب کے حوالے سے ایک اتھارٹی تصور کیا جاتا ہے، ہر ادیب شاعر اور صحافی کی خواہش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اُس کے لکھے پر کچھ لکھیں اور جس شخص کی تحریر پر ڈاکٹر صاحب کا قلم مہربان ہو جائے۔ شعر و ادب کی دیوی اُس پر مہربان ہو جاتی ہے آیئے آپ کو ڈاکٹر انور سدید صاحب سے ملوائیں۔

س: ڈاکٹر صاحب آپ کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں اور کام کے اتنے حوالے ہیں کہ اگر بات کریں گے تو شاید کبھی ختم ہی نہ ہو۔ اس لئے ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی گفتگو کے دریا کو کوزے میں بند کیا جائے۔ سب سے پہلے تو ہم آپ کے اس گرد و پیش کے ماحول کے بارے میں جاننا چاہیں گے کہ جس میں آپ نے آنکھ کھولی ؟

ج: ندیم اُپل صاحب! پہلی بات جو آپ نے کہی ہے کہ آپ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں، میں ذاتی طور پر اپنے آپ کو بہت ہی محدود موضوعات اور محدود دائرے کا آدمی سمجھتا ہوں ۔ میری ساری زندگی پروفیشنل زندگی تھی جو بطور انجینئر محکمہ آبپاشی میں گزاری اور میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ آبپاشی کا محکمہ اتنا چھوٹا

Marfat.com

ہے کہ اس میں اگر کچھ تجربات ملتے ہیں تو وہ ایسا ہی ہے جیسے میں کسی تالاب میں ایک مینڈک کی طرح ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ آج کا جو صحافی ہے خاص طور پر جو رپورٹر ہے اس کے تجربات میری زندگی کے تجربات سے زیادہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ جب میں آپ کے ساتھ ''خبریں'' میں تھا آپ کو یاد ہوگا وہاں ''خبریں'' میں پیر کا کی تاڑ کے انٹرویو چھپا کرتے تھے مگر جب آپ پیر کا کی تاڑ کو دیکھتے ہیں تو اس سے ایک نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس نے اپنا ایک ایسا حلقہ بنایا ہوا تھا کہ جب اخبار والے اس کا انٹرویو لے کر چھاپتے تھے تو وہ صبح بہت زیادہ پڑھا جاتا تھا اور پھر آپ نے دیکھا کہ جب اس کے انٹرویوز کا سلسلہ ختم کر دیا تب سے وہ پیر صفدر شاہ تو مشہور ہے مگر پیر کا کی تاڑ غائب ہو گیا۔ اب آپ نے مجھ سے پوچھا کہ زندگی کا ابتدائی ماحول کیسا تھا؟ آج 76 برس کی عمر میں جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ زندگی کا 76 سالہ باب ایک لمحے میں گزر گیا ہے۔ پہلے ابتدائی بیس سال تعلیم حاصل کرنے میں لگے پھر اُسی سرکاری محکمے میں چالیس بیالیس سال گزارے اور ریٹائرمنٹ کے بعد 16 سال صحافت میں گزرے۔ یہ تینوں مختلف زاویئے ہیں مگر ان میں ایک قدر جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ مجھے ابتداء ہی سے ادب سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جس کو میں نے مسلسل قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس بات کے اظہار میں بھی مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے اس گھرانے میں آنکھ نہیں کھولی جہاں بچے منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے والد بہت امیر آدمی نہیں تھے اور زیادہ غریب آدمی بھی نہیں تھے۔ گویا ہمیں غربت کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر امارت بھی ہم نے نہیں دیکھی مگر الحمدللہ ہمیں باعزت طریقے سے روٹی ملتی رہی، سب سے بڑھ کر یہ کہ رزق حلال ملا۔ میں نے اپنے والد صاحب کا ایک خاکہ لکھا ہے جو ''الحمرا'' میں چھپا ہے، اس میں ایک بنیادی بات جو میں نے لکھی ہے وہ یہ کہ میرے والد نے ساری زندگی رزق حلال میں گزاری۔ جب میں اوورسیئر تھا تو ایک مرتبہ وہ میرے پاس تشریف لائے، تب تھل کینال پر میری ڈیوٹی تھی، ہم سائیٹ پر رہتے تھے۔ وہ شاہ عالم سے چار پانچ میل اونٹ کا سفر کر کے میرے پاس پہنچے۔ اس وقت میں اور میرا ایک دوست کیمپ میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک نوکر تھا جو کھانا پکایا کرتا تھا۔ میرے والد صاحب نے میرے دوست سعید سے پوچھا کہ آپ اس نوکر کو کتنی تنخواہ دیتے ہیں، سعید نے بتایا کہ ہمیں سرکاری ملازم ملا ہوا ہوتا ہے، کام یہ ہمارا کرتا ہے مگر تنخواہ اُسے محکمہ سے ملتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ بات سن کر میرے والد صاحب نے کھانا نہیں کھایا، ہم منتیں کرتے رہے مگر انہوں نے انکار کر دیا حتیٰ کہ پانی بھی نہیں پیا اور اسی وقت وہ واپس چلے گئے اس کے بعد وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے۔ اس واقعہ کے پیچھے جو کہانی ہے وہ صرف اتنی ہے، انہیں

Marfat.com

شک تھا کہ جب یہ تنخواہ سرکاری لیتا ہے تو نوکر سے کام لینا ناجائز ہے۔ میں تو ندیم اُپل صاحب! اس ماحول میں پلا بڑھا ہوں۔

س: والد صاحب ملازمت پیشہ تھے؟

ج: وہ کاروباری آدمی تھے، ابتداء میں ان کے پاس پف مشین کی ایجنسی تھی۔ اس زمانے میں ایک مشہور سلائی مشین پف اور دوسری "سنگر"۔ سنگر تو اب بھی چل رہی ہے مگر پف ختم ہوگئی ہے۔ پف مشین کی والد صاحب کے پاس ایجنسی تھی۔

س: آپ کے والد صاحب کی تعلیم کتنی تھی؟

ج: وہ ان پڑھ تھے البتہ ان کے پاس دینی مدرسے کی تعلیم تھی مگر تعلیم کا وہ دور تھا کہ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ہمارے محلے میں عربی کے ایک ماسٹر تھے مولوی محمد بخش جو خالد اقبال یاسر کے نانا تھے اور دوسرے مرزا منور کے والد تھے۔ مولوی محمد بخش صاحب مسجد میں امامت بھی کروایا کرتے تھے اور قرآن حکیم کا درس بھی دیا کرتے تھے، بہرکیف فجر کی نماز کے بعد جب یہ تینوں بزرگ ہمارے گھر کی بیٹھک میں تشریف فرما ہوتے تو وہیں بیٹھ کر وہ...... مولانا رومؒ اور اقبالؒ کے کلام پر بحث کیا کرتے تھے۔ اگرچہ میرے والد صاحب کا علم مسجد تک محدود تھا مگر اس زمانے میں مسجد کا استاد بھی پڑھا لکھا ہوا کرتا تھا جبکہ آج کل تو کالج کا استاد بھی علم سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ جب میں میٹرک میں آیا تو والد صاحب نے کہا کہ ہماری اتنی استعداد نہیں ہے کہ تمہیں مزید تعلیم دلوائیں۔

اُسی زمانے میں بھائی ڈرافٹمین تھے جبکہ میرا رجحان ادب کی طرف تھا اور میں ٹیچر بننا چاہتا تھا مگر مجھے بھائی صاحب نے کہا کہ انجینئرنگ میں داخلہ لو۔ جب میں نے اسلامیہ کالج میں انجینئرنگ میں داخلہ لیا تو اس زمانے میں مجید نظامی، سرتاج عزیز، عبدالعزیز خالد اور مظہر علی ہمارے سینئر سٹوڈنٹ ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوگئی اور میں پڑھائی وغیرہ چھوڑ کر اس تحریک میں شامل ہوگیا۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے لئے میں نے سرگودھا اور خوشاب کے علاقوں میں کام کیا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کا امیدوار اس انتخاب میں جیتا نہیں تھا، بہرکیف مجھے یہ دھچکا لگا کہ میں کمزور مالی حالت کی وجہ سے آگے نہیں چل سکتا تھا، اس زمانے میں سکول میں Competition ہوا کرتا تھا۔ اس مقابلے میں جب میں شریک ہوا تو مجھے سکالرشپ بھی ملا۔ یوں میں اوورسیئر بن گیا جو کہ محکمہ آبپاشی کا سب سے نچلے درجے کا کارکن ہوتا ہے۔ اسی دوران میں نے اے ایم آئی کیا جو کہ بی ایس سی ڈگری کے برابر تھی جس سے میری ترقی کے راستے

Marfat.com

کھل گئے اور میں محکمہ آبپاشی سے گریڈ 19 سے ریٹائرڈ ہوا مگر اس کے ساتھ ہی ادب کا جو ذوق تھا میں اس میں دو باتیں بڑی اہم کرنا چاہتا ہوں ایک یہ کہ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنہیں زندگی میں بڑے مخلص لوگ ملے۔ جب میں انجینئرنگ کے شعبہ میں آیا تو مجھے چوہدری نور محمد صاحب ملے جو محکمہ نہر میں اعلیٰ آفیسر تھے ان سے زیادہ دیانتدار آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ انہوں نے میری جو تربیت کی اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر چلتے رہے۔ پھر میں نے بی آر ڈی لنک نہر بنائی۔ اس کا جو بیدیاں سے نیچے والا حصہ ہے جو 1948ء کے بعد بہت شکستہ ہو گیا تھا اس کی مرمت میں نے کی اور پھر مرمت کے بعد اس کو پہلی مرتبہ میں نے چلایا۔ 1965ء کی جنگ میں جو ڈیفنس لائن بھی تھی اس کے بعد میں تو وہاں سے تبدیل ہو گیا تھا مگر اس وقت وہاں جو ایکسیئن رانا عبدالقیوم تھا ان کو اس سلسلے میں پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔

س: 65ء کی جنگ کے حوالے سے حکایت کے مدیر اعلیٰ عنایت اللہ نے کتاب لکھی ''بی آر بی بہتی رہے گی''۔

ج: جی ہاں بالکل ! سو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ مجھے والد صاحب کی طرف سے دیانت اور امانت داری کی جو تعلیم ملی، اس کو چوہدری نور محمد نے مستحکم کیا، اس دوران میں نے ادب سے اپنی دوستی جاری رکھی۔ میں تو ساتویں آٹھویں جماعت سے ہی کہانیاں لکھنے لگا تھا، اس زمانے میں ہندوؤں میں ایک رگھوناتھ ہوا کرتے تھے جو دیال سنگھ سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے، ان کے زیر ادارت ایک پرچہ ''گلدستہ'' نکلا کرتا تھا۔ جس میں میری پہلی کہانی شائع ہوئی تھی۔ پھر جب مزید حوصلہ افزائی ہوئی تو آہستہ آہستہ فلمی پرچوں میں لکھنے لگا۔ اُسی زمانے میں ''چترا'' اور ''گروگھنٹال'' مشہور پرچے تھے۔ ان میں لکھنا شروع کیا، یوں ترقی کرتے کرتے میں ''ہمایوں'' تک پہنچ گیا۔ گروگھنٹال کے ایڈیٹر ایک بار مجھے یہاں ملنے آئے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میرا نام انور سدید ہے اور میں آپ کے پرچے میں افسانے لکھا کرتا تھا تو یہ جان کر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے ساتھی دوست کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''دیکھئے ! یہ ہمارے لگائے ہوئے پودے ہیں۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ جب میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب دہلی گئے تو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں فلمی پرچے ''گروگھنٹال'' کے وہی ایڈیٹر بہت بڑی سی ٹوکری اٹھا کر لے آئے اور مجھے باہر بلا کر کہنے لگے کہ میں آپ سب کے لئے ناشتہ لایا ہوں اس میں شراب کی بھی تین بوتلیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھئی ہم نے تو آج تک شراب دیکھی ہی نہیں ہے اور اندر کمرے میں جو دو ڈاکٹر صاحبان بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی اس مزاج کے آدمی نہیں ہیں۔ جس پر وہ کہنے لگے کہ شراب کی یہ بوتلیں واپس لے جانا تو میری بڑی توہین ہے۔ میں نے ان

Marfat.com

سے کہا توہین والی کیا بات ہے آپ کو ہمیں اس بارے میں پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔توہین تو آپ نے کی ہے جس پر وہ کہنے لگے......اچھا میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جو پاکستانی مہمان آئے ہوئے ہیں یہ بوتلیں میں ان کو دے دیتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا ٹھیک ہے مگر شام کو جو کیفیت ہو وہ مجھے ضرور بتانا۔شام کو انہوں نے آ کر بتایا کہ مسلمان تو شراب کی ان بوتلوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔لہٰذا اس قسم کے واقعات سے بڑی ندامت ہوتی ہے۔بہر کیف بات ادب کی ہو رہی تھی اور ادبی دنیا کا اہم اور قابل ذکر موڑ اس وقت آیا جب وزیر آغا سے تعلق ہوا اور انہوں نے مجھے ایم۔اے کرنے کا مشورہ دیا۔لہٰذا میں نے سارے امتحان پرائیویٹ ہی دیئے۔

س: کیا یہ درست ہے کہ بیسویں صدی میں آپ کا باقاعدہ پہلا افسانہ شائع ہوا تھا اور یزدانی جالندھری صاحب اس کے ایڈیٹر تھے ؟

ج: بیسویں صدی کے ایڈیٹر تو خوشتر گرامی تھے۔البتہ پس پردہ ایڈیٹر یزدانی جالندھری ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ''چتر'' اور گرو گھنٹال سے ترقی کرتے کرتے میں بیسویں صدی میں آ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ''بیسویں صدی'' سے مجھے بہت شہرت ملی کیونکہ اس زمانے میں وہ بہت زیادہ پڑھا جانے والا پرچہ تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جب میں نے ''ہمایوں'' میں لکھنا شروع کیا تو وہاں مظہر انصاری نے میری انگلی پکڑی جو اس کے ایڈیٹر تھے۔جبکہ ہمایوں کے آخری ایڈیٹر ناصر کاظمی تھے بہر کیف میں سمجھتا ہوں کہ جب میں پروفیشنل زندگی میں آیا تو ادب کا شعبہ پیچھے چلا گیا اور انجینئرنگ آگے آ گیا مگر اس کے بعد دوبارہ ادب کی دنیا میں مجھے وزیر آغا لے کر آئے۔وزیر آغا سے ملنے کے بعد میں نے پہلے ایم۔اے اور پھر پی ایچ ڈی کی۔ اسی دوران ''اوراق'' میں لکھنا شروع کیا،احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ میرا جو تعلق شروع ہوا،اس نے مجھے بہت تقویت دی جو اب تک جاری ہے۔میں نے کئی بار کہا ہے کہ وزیر آغا میرے محسن نہیں ہیں اصل میں میرے محسن احمد ندیم قاسمی ہی ہیں کیونکہ انہوں نے مجھے متحرک رکھنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ دوسرے لوگ مانیں یا نہ مانیں یا قاسمی صاحب اسے تسلیم کریں یا نہ کریں یہ میرا مسئلہ نہیں ہے مگر انہوں نے مجھے متحرک ضرور رکھا ہے۔ جس پر میں ان کا ممنون احسان ہوں۔جن لوگوں نے مجھے مثبت طور پر آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا میں نے ان کی تجاویز پر ہمیشہ لبیک کہا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی مجھے کئی مرتبہ کہا ہے کہ آپ کا جتنا بھی کیریئر ہے اس میں 95فیصد آپ کی محنت ہے اور ایک فیصد آپ کی ذہانت ہے مگر یہ جو ایک فیصد ذہانت ہے وہ 99فیصد محنت پر غالب آ گئی ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب ! یہ کیا وجہ ہے کہ آج کل ان پڑھ فلمی ایکٹروں کی طرح عقل و دانش رکھنے والے

Marfat.com

ادیبوں، شاعروں میں بھی نمبرون کی دوڑ لگی ہوئی ہے، آپ کے خیال میں یہ کوئی مثبت رویہ ہے، ادبی دنیا میں لابیاں اور گروپ وجود میں آ گئے ہیں جو تخلیقی کام کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ کہیں ڈاکٹر وزیر آغا گروپ ہے تو کہیں قاسمی گروپ ہے، کیا اس گروپ بازی اور گروہ بندی کی وجہ سے ادب کو نقصان نہیں پہنچ رہا۔ کیا اس قسم کی حرکتیں ایسے باشعور لوگوں کو زیب دیتی ہیں؟

ج: میں آپ سے عرض کروں کہ گروپ بندی کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ آپ بیٹھ کر سازشیں کریں، کبھی ایک ادیب کے خلاف تو کبھی دوسرے ادیب کے خلاف۔ اسے اس کے مرتبے سے گرانے کی کوشش کریں، یہ منفی عمل ہے اور میں اس قسم کی گروپ بندی کو قطعی قبول نہیں کرتا لیکن ابھی میں نے آپ کو مثال دی ہے کہ جب وزیر آغا سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے جس وقت مجھے اپنی جہت پر ڈالا ...... یہ پڑھیں وہ پڑھیں۔ دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ پی ایچ ڈی میں وہ میرے انٹرنل گائیڈ تھے۔ جب میں نے اپنے مقالے کا پہلا باب لکھا تو اسے ڈاکٹر وزیر آغا نے سات مرتبہ Reject کیا۔ تب میں غصے میں آ گیا، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں تو پہلے ہی ایس پی آر ڈی اولگا ہوا ہوں مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سلسلے میں میری بڑی رہنمائی کی۔ لہٰذا اب اگر کوئی مجھے ڈاکٹر وزیر آغا گروپ کا آدمی کہے تو میں اس سے کبھی انکار نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب سے میں نے غصے کے عالم میں کہا کہ میں پی ایچ ڈی نہیں کرتا تو انہوں نے کہا بیشک نہ کریں کیا اس میں میرا فائدہ ہے، تاہم اگلے دن وہ انگریزی کی بیس پچیس کتابیں مجھے گھر پر لا کر دے گئے اور مجھے کہا کہ میں ان کو پڑھ لوں۔ جب میں نے ان کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو واقعی مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں بہت کمی ہے۔ تب میں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کی لہٰذا جب میں نے ساتویں مرتبہ مقالہ لکھا تو ڈاکٹر صاحب مجھے لاہور حلقہ ارباب ذوق میں لے کر آئے۔ جہاں سراج منیر، سجاد باقر رضوی اور انتظار حسین وغیرہ جو تھے انہوں نے تو میرے مقالے کے پرخچے اڑا دیئے، انہوں نے کہا یہ کیا مقالہ ہے؟ جس پر میں بڑا دل برداشتہ ہوا مگر اہم بات یہ ہے کہ جب میں نیچے ٹی ہاؤس میں آیا تو سجاد باقر رضوی مجھے کہنے لگے...... انور سدید! تم اس تنقید سے برا نہ منانا۔ ہم نے یہ تنقید تمہیں آگے بڑھانے کے لئے کی ہے ویسے آپ کا مقالہ بہت اچھا ہے اور اس پر اپنا کام جاری رکھو۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں گائیڈ اچھا مل گیا ہے۔ یوں جب ڈاکٹر وزیر آغا کی مجھے رہنمائی ملی تو ''اردو ادب کی تحریکیں'' میرے مقالے کا عنوان تھا۔ میرے اس مقالے پر ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے لکھا تھا کہ یہ ایک ایسا مقالہ ہے جس پر کئی لوگ پی ایچ ڈی کریں گے اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا تھا کہ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ میں اس مقالے کا ممتحن ہوں، اس کے بغیر میں اب بھی دعویٰ کر سکتا ہوں کہ نہ ایم اے ہو سکتا

Marfat.com

ہے اور نہ بی اے ہو سکتا ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے اور جب میں نے کہا کہ اس کی رائیلٹی مجھے کم ملی ہے تب انہوں نے کہا آپ جو کہیں گے ہم آپ کو دیں گے۔ مگر صدقہ جاریہ کے طور پر، اس کے مستقل حقوق آپ ہمیں دے دیں۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ادب کا جو ریاض کرایا اس میں مجھے جو تجربہ حاصل ہوا وہ ایسے لگتا تھا کہ اس کے سامنے پی ایچ ڈی کی جو ڈگری تھی وہ ہیچ ہو گئی میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس مطالعے کی بنیاد پر جب میں صحافت میں آیا اور مجیب الرحمٰن شامی اور ضیاء شاہد جیسے سخت گیر آدمی کے ساتھ کام کیا اور پھر مجید نظامی صاحب کے ساتھ مجھے کام کرنے کا جو موقع ملا وہ اس ریاض کا نتیجہ تھا۔ اب جبکہ میں اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں مجھ سے وہ کام لیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد صحافت میرا پیشہ بن گیا۔

س: آپ کے پہلے مقالے میں جو زبردست تنقید ہوئی کیا اس کی وجہ سے آپ بھی انتقامی طور پر نقاد بن گئے تاکہ دوسروں سے بدلہ لیا جا سکے؟

ج: جیسا میں نے بتایا میرا جو پہلا مقالہ تھا اس کا عنوان ''مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب'' تھا، جو اوراق کے سالنامے میں چھپا تھا اس پر کوئی تنقید نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک میرے نقاد بننے کا سوال ہے تو میں نے افسانہ نگار کے طور پر اردو ادب میں قدم رکھا مگر وزیر آغا سے جو ملاقات ہوئی اور مطالعہ کے اشتیاق کی تکمیل میں انہوں نے میری جو معاونت کی حتیٰ کہ پوری لائبریری میری Disposal پر چھوڑ دی۔ ویسے بھی جب میں نے پہلا مقالہ ان کی فرمائش پر لکھا تو انہوں نے کہا آپ تنقید میں ٹھیک ٹھاک چل سکتے ہیں، اس طرح سے میں تنقید کی طرف آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کی دنیا میں کوئی شخص کسی کی رہنمائی کر سکے تو وہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ میرے خیال میں جو ادبی حلقے ہیں یہ بھی ادب میں گروہ بندی کا ہی نتیجہ ہیں۔

س: پچھلے دنوں میں نے قاسمی صاحب سے انٹرویو کیا جس میں انہوں نے کہا کہ لوگوں نے فیض احمد فیض کا بت بنا لیا ہے، آپ اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟

ج: میں آپ سے عرض کروں گا کہ دو ادیبوں اور دو شاعروں کا آپس میں موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہر ادیب شاعر اور افسانہ نگار کے شیڈز اپنے ہیں، اگر منٹو فوت ہو گیا ہے تو کیا اس کے بعد کوئی دوسرا منٹو پیدا ہوا ہے حالانکہ جنس پر منٹو سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ عصمت چغتائی کو لحاف نے شہرت دی، آج جو افسانے لکھے جا رہے ہیں اس میں لحاف تو بچگانہ نظر آتا ہے۔ اس طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی کا بت افسانے سے نہیں بن جاتا اس کے لئے اس کا ریاض شامل ہوتا ہے۔ میں اب بھی دعویٰ کرتا ہوں کہ جو ٹکسال فیض نے

Marfat.com

اپنی بنائی ہے اس کے پیچھے غالب اور سودا دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے فیض نے اپنی ٹکسال بنائی اور اس کی لفظیات جب بھی کوئی استعمال کرتا ہے پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ نقل کر رہا ہے۔ ایک اور شاعر ہے ناصر کاظمی، آپ ان کو بھی پڑھ کر دیکھیں۔ انہوں نے لفظ وہی استعمال کیے ہیں مگر فضا انہوں نے نئی ہی تخلیق کی ہے۔ منیر نیازی کی شاعری میں آپ کو لفظ وہی نظر آئیں گے جو عام لغت میں ملتے ہیں مگر وہ ایک خاص طلسماتی فضا قائم کرتا ہے جو منیر نیازی کے سوا اور کوئی پیدا نہیں کر سکا، اس لئے یہ کہنا کہ لوگوں نے فیض کا بت بنا لیا ہے یہ قطعی درست بات نہیں۔ ہر آدمی کو اس کے میرٹ پر پرکھا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب کے بارے میں بھی ایسی بات کہی جا سکتی ہے مگر یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ وہ لوگوں کے کہنے پر یقین کر لیتے ہیں بیشک وہ بڑے شاعر ہیں مگر اتنے بڑے شاعر بھی نہیں کہ انہیں اقبال کے مقابل لایا جا سکے۔

س: یہ بھی ہمارے ہاں کیسا مذاق ہے کہ جونیئر لوگوں کو پہلے ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے جبکہ منیر نیازی جیسے شاعر کو قطار کے آخر میں رکھا جاتا ہے آخر کیوں؟

ج: ایوارڈز والی بات بھی بڑی دلچسپ ہے۔ کسی کو میرٹ پر کبھی ایوارڈ نہیں ملا۔ مستنصر حسین تارڑ کو جب دبئی والا ایوارڈ ملا تھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ اگر میں چاہتا تو نشانِ پاکستان بھی لے سکتا تھا، کیونکہ اس کے ملنے کے لئے ہمت، سفارش اور خوشامد کی ضرورت ہے مگر وہ کہتا ہے کہ یہ ایوارڈ جو اسے باہر سے ملا ہے اس کے نزدیک اس کی قدر زیادہ ہے۔ اب بھی ایسے بے شمار لوگ ہیں جنہیں ابھی تک ایوارڈز نہیں ملے، کیا وہ ایوارڈز کے حقدار نہیں اور کیا وہ اس ایوارڈ کے محتاج ہیں۔ اگر کسی ادیب نے یہ منزل بنائی ہوئی ہے کہ اس نے ایوارڈ حاصل کرنا ہے تو یہ کوئی منزل نہیں ہے۔ جب حسن رضوی کو پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ دیا گیا تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ باقاعدہ ایک تحریک چلائی گئی تھی، جس پر احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد اور قتیل شفائی نے بھی دستخط کئے تھے۔ مگر جب مجھے کہا گیا کہ آپ بھی دستخط کریں تو میں نے انہیں صاف کہہ دیا تھا کہ میں تو اس دوڑ میں شامل نہیں ہوں میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ایوارڈ حاصل کرنے کے لئے 100 سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے اور اس درخت پر اگر سیب پکا ہوا ہے تو وہ آپ کے ہاتھ میں آ جائے گا وگرنہ جھولی پھیلائے سیڑھی کے نیچے بیٹھے رہیں۔ سیب جب پکے گا اور آپ کے حصے کا ہوگا تو وہ آپ کی جھولی میں آ گرے گا۔ لہٰذا ایوارڈ کوئی معیار نہیں ہے۔ ابھی آج ہی مجھے کسی نے اخباری تراشہ بھجوایا ہے جس میں حمید اختر کا ایک کالم ''دن'' میں چھپا ہوا ہے۔ اس میں سلیم اختر نے شکوہ کیا ہے کہ اس مرتبہ پرائڈ آف پرفارمنس میں اس کا نام سب سے اوپر تھا لیکن مجھے ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ اس کا مطلب ہے اسے ایوارڈ ملنا چاہیے تھا، 70 سال کی عمر میں بھی اگر انہیں ایوارڈ نہ ملا تو کب ملے گا،

Marfat.com

لیکن اس سے چھوٹی عمر والوں نے چکر چلا لیا اور ایوارڈ لے گئے۔

س: بطور شاعر اگر احمد ندیم قاسمی اور منیر نیازی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کے خیال میں بڑا شاعر کون ہے ؟

ج: میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دو شاعروں کا موازنہ نہیں ہو سکتا، منیر نیازی اپنے انداز میں ایک طلسماتی فضا بناتا ہے اور اس کا کوئی ہم پلہ نہیں جبکہ قاسمی صاحب کے سامنے ایک ترقی پسند تحریک کی جو مقصد پسندی آئی ہوئی ہے، اس میں وہ انسان دوستی کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر وہ ایک سٹیریو ٹائپ چیز بن جاتی ہے، میں تو لکھ چکا ہوں کہ جو بات نثر میں آسانی سے کہی جا سکتی ہے وہ قاسمی صاحب نظم میں کہہ دیتے ہیں، اس میں آپ ان کو کیا کریڈٹ دیں گے بیشک وہ بہت مقبول آدمی ہیں۔ شاعری کے مقبول شاعر ہیں لیکن اب بھی اگر آپ کسی سے کہیں کہ فیض کے دس شعر سناؤ تو وہ سنا دے گا۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر کسی سے کہیں کہ وہ قاسمی صاحب کی پانچ کتابوں کے نام گنوا دے تو وہ نام نہیں گنوا سکتا۔

سو کہنے کی بات یہ ہے کہ مقبولیت کا پیمانہ بھی اور ہے، مقبول شاعر اور اچھا شاعر ہونا دو متضاد چیزیں ہیں۔ آپ مشاعرے دیکھئے، ساغر صدیقی کے اشعار کا آج بھی حوالہ دیا جاتا ہے، عدم کا اپنے زمانے میں شہرہ اور مقام تھا۔ جگر مراد آبادی اور بہت سے لوگ جو آج تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں لہٰذا شہرت بھی ایک وقتی چیز ہے جو کتابوں سے نہیں بنتی۔ اب بھی میں نے جو ایک مشن اختیار کر رکھا ہے میں کھلے عام کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مستقبل کو ختم کرنے کے لئے ادب میں کام کر رہے ہیں وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، کسی نہ کسی مقام پر آ کر انہیں اپنی شکست کا احساس ہوگا اور وہ ایسا وقت ہوگا جب سوائے مایوسی کے ان کے مقدر میں کچھ نہ ہوگا۔ صحیح ادب تخلیق کرنے کے لئے آسمان سے وحی نازل تو نہیں ہوتی مگر الہام ضرور ہوتا ہے۔

س: آپ کی اپنی کتنی کتابیں ہیں؟

ج: پچیس تیس کتابیں تو میری ذاتی ہیں جبکہ 20 کے قریب کتب مرتب کی ہیں مگر مرتب کرنے کا یہ بھی انداز ہے کہ ان کے دیباچے میں نے خود تفصیل سے لکھے ہیں، میں نے مقدور بھر کام کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں نے بہت بڑا میدان فتح کر لیا ہے تو ایسی بھی کوئی بات نہیں۔

س: آپ اخبارات کی دنیا سے بھی وابستہ رہے، تب سے قومی اخبارات کے ادارتی شعبوں کے لئے آپ نے بہت سے کام کیا۔ یہ الزام کہاں تک درست ہے کہ ایک صحافی کے قلم میں سچائی کا عنصر خال خال ہی ملتا ہے، دوسرے لفظوں میں آپ کی صحافت مولانا ظفر علی خان کی نہیں بلکہ مفادات کی صحافت ہے، بطور نقاد آپ اس پر

Marfat.com

کیا تبصرہ کریں گے؟

ج: میرا تعلق صحافت کے ساتھ ضرور رہا ہے مگر جن شعبوں میں ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں، میں ان میں سے نہیں مثلاً میں جب قومی ڈائجسٹ میں تھا تو ڈائجسٹ کا ایڈیٹر تھا، ڈائجسٹ کی مختلف چیزوں کو Arrange کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا عام اخباری صحافت سے اس کا تعلق نہیں۔ پھر ''زندگی'' میں جب کام کیا تو وہ قومی ڈائجسٹ سے مختلف تھا۔ جب ''خبریں'' میں آیا تو وہاں میں نے ترجمے کی روایت ڈالی اور مجھے خوشی ہے کہ اس روایت کو ضیا شاہد نے نہ صرف قائم کر رکھا ہے بلکہ اسے بڑھایا بھی ہے۔ میرے بعد ریحان قیوم آئے۔ انہوں نے بھی یہ کام جاری رکھا پھر جب میں نوائے وقت میں آیا تو ترجمے کی روایت وہی رہی۔ یہاں ادارتی صفحے پر بھی کام کرتا رہا۔ اخبارات پر مفادات حاصل کرنے کے جو الزامات ہیں میں اس پر کچھ نہیں کہنا چاہتا، مجھے یاد ہے نوائے وقت میں ایک صحافی تھے میں ان کا نام نہیں بتاؤں گا مگر وہ خبریں بیچا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک وزیر کے ساتھ ٹکر لے لی۔ اس وزیر نے ایک فائل لا کر نظامی صاحب کے سامنے رکھ دی کہ جناب دیکھئے یہ شخص اس آدمی کی سفارش کر رہا ہے جو نہایت کرپٹ ہے۔ نظامی صاحب نے فوری طور پر اس صحافی کی چھٹی کروادی۔ نظامی صاحب کے پاس جب بھی کسی ورکر کے خلاف درست شکایت پہنچتی ہے تو وہ فوراً اس پر ایکشن لیتے ہیں، مگر اب چونکہ اخبارات زیادہ ہو گئے ہیں، اب اس طرح کے صحافی بھی نہیں رہے کہ زمیندار بند ہو جائے تو قوم اس وقت چندہ کر کے دوبارہ اخبار نکال لے۔ نوائے وقت میں بھی یہی ہوا جب دولتانہ کے دور میں اخبار بند کیا گیا تو اسی وقت شورش کاشمیری نے اپنا اخبار پیش کیا مگر اس زمانے میں یکے از مطبوعات کا فارمولا استعمال ہوتا تھا بہرحال یہ صحافی کا انفرادی جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک Contribute کرتا ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب عشق اور محبت دو فطری جذبے ہیں، کوئی بھی شخص ان جذبوں کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتا۔ جوانی کے عالم میں آپ نے کبھی کسی سے عشق کیا؟

ج: میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ مجھ پر کبھی جوانی آئی ہی نہیں۔

س: وہ کیسے؟

ج: اس لئے کہ میری جو بیوی ہے اس کی منگنی میرے ساتھ اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے ہو گئی تھی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ ہمارے والد پورے کنبے کے کفیل تھے ان کے تین بھائی مجلس احرار کے لیڈر تھے اور اکثر جیل میں رہتے تھے۔ میرے چچا کا جو بیٹا تھا اس کے بارے میں میری والدہ نے کہا کہ جب اس کی شادی

Marfat.com

ہوگی اور جو پہلی بیٹی ہوگی وہ میری بیوی بنے گی۔ یوں میری شادی تو وقت سے بھی بہت پہلے ہوگئی تھی اور گھریلو زندگی میں بچے آگئے۔

س: آپ کے بچے کتنے ہیں؟

ج: میرے چار بیٹے ہیں چاروں نے وہاں سے شروع کیا جہاں سے میں نے ختم کیا دو ڈاکٹر ہیں اور دو انجینئر ہیں۔

س: بیٹیاں ہیں؟

ج: میری بیٹی تو کوئی نہیں مگر میں چار پلی پلائی بیٹیاں لے کر آیا۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہم جو بہوین لائے ہیں، وہ بیٹوں کی مرضی سے لائے ہیں یہ زبردستی والی شادیاں نہیں ہیں ہمارا گھرانہ تو وہ خوش قسمت گھرانہ ہے جس میں میری چاروں بہویں اپنی ماؤں سے زیادہ میری بیوی کی عزت کرتے ہیں۔ میں اکثر اپنی بہوؤں کی ماؤں سے کہتا ہوں کہ آپ ان کی ساسیں ہیں اور میری بیوی ان کی ماں ہے۔

س: آپ کی شریک حیات بھی تعلیم یافتہ ہیں؟

ج: وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں کیونکہ اس زمانے میں آٹھویں جماعت کے بعد شادی ہوجایا کرتی تھی، مگر میری شریک حیات نے مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے گھر میں پورا ماحول فراہم کیا۔ بلکہ جب مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تو میرے چھوٹے بھائی جو پشاور یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ انور سدید صاحب! اس میں سارا رول میری بھابھی کا ہے وہ اگر آپ کو یہ ماحول فراہم نہ کرے تو شاید یہ سب کچھ ممکن نہ ہو۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میری اب بھی ساری دنیا اس کمرے میں ہے۔ جب میری بیوی اپنی بہنوں سے ملنے چلی جاتی ہے تو مجھے یہ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی ہیں، وہ ادھر سارا دن اپنے کام میں مصروف رہے مگر اسے یہ اطمینان ہے کہ میاں بیٹھا ہوا ہے اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ بیوی موجود ہے۔ لہٰذا یہ تو ایک طرح کا اشتراک ہے۔ اگرچہ اس قسم کی مثالیں چند ایک ہی ہوتی ہیں مگر جہاں جہاں بھی ہیں وہ ادب کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جن لوگوں کی بیویوں کی لڑائیاں اور ناچاقی رہی ہے انہوں نے اگر ادب تخلیق کیا ہے تو وہ ان کی ہمت ہے۔ میرے لئے اگر کوئی ایسی ناگوار صورتحال پیدا ہو تو میں لکھتا ہی نہیں ہوں۔

س: آپ کو اس قوم نے عزت دی، شہرت دی، نام و مقام دیا، جواب میں آپ نے اس کو کیا لوٹایا؟

ج: پروفیشنل ہونے کی حیثیت سے تو بنیادی طور پر ہر آدمی کا ایک خاص رول ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں

Marfat.com

اگرچہ انجینئرنگ میرا پسندیدہ شعبہ نہیں تھا مگر میرے بنائے ہوئے کام اب بھی اس ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے ''تھل کینال'' سے کام شروع کیا پھر آپ ایم آر رنگ پر آ جائیں۔ وہاں جو سرکل اور پل بنائے وہ ابھی تک کام کر رہے ہیں اور یہ جو ''بی آر بی نہر'' پر میں نے کام کیا یہ سب میں نے شعوری طور پر تو نہیں کیا مگر وہ میرے کام کا حصہ ضرور ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے بہت خدمت کی ہے مگر ہمارے اندر جو مہابھارت لڑی جا رہی ہوتی ہے یا جب ہم لکھ لیتے ہیں تو اس وقت میرا کتھارسس ہو جاتا ہے بلکہ صحافت نے مجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ آپ اس مور کی طرح زندگی گزاریں جو اپنی مرضی سے پر پھیلا دیتا ہے اور رقص کر لیتا ہے مگر جب اس کا رقص کرنے کو جی نہ چاہے تو آپ ہزار کوشش کر لیں وہ ایسا نہیں کرتا۔

س: ادبی حوالے سے آپ کے بہت سے پرستار اور چاہنے والے ہیں آپ کس کے پرستار ہیں؟

ج: میں اکثر کہتا ہوں کہ میں تو ادب سے بھاگا ہوا آدمی تھا، ڈاکٹر وزیر آغا مجھے لے کر آئے تھے، ان کے ساتھ میرا تعلق تقریباً چالیس سال کا ہے جس میں ان کی دوستی اور ان کی رہنمائی میں بھی کمی نہیں آئی۔ اس زاویئے سے تو میں ایک ہی نام لوں گا اور دوسرا نام میں نے آپ کے سامنے احمد ندیم قاسمی کا لیا وہ بھی میرے محسن ہیں۔

س: سرگودھا سے آپ کا تعلق ہے۔ لوگ اسے شاہینوں کا شہر کہتے ہیں، کیا ہم اب اسے ادیبوں اور شاعروں کا شہر بھی کہہ سکتے ہیں؟

ج: ادیبوں کا شہر سرگودھا کو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ بہت چھوٹی جگہ ہے، ویسے تو میرے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی اور الطاف مشہدی کا تعلق بھی سرگودھا سے ہے مگر میں بنیادی طور پر سمجھتا ہوں کہ ''دلبستان'' لاہور ہی بنتا ہے یہ جو باقی چھوٹے چھوٹے نکلتے ہیں یہ اس کی شاخیں ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ جو ٹکسال ہے وہ لاہور ہی ہے۔ ''جب تک کسی اذیب کو لاہور تسلیم نہ کرے اسے ادیب شمار نہیں کیا جاتا''

س: اشفاق احمد صاحب کے جانے سے ادب کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، کیا آنے والے ماہ و سال میں اس کی کمی پوری ہونے کے دور دور تک کچھ امکانات ہیں؟

ج: میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ ادیبوں کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔ سعادت حسن منٹو کے بعد ہم دوسرا منٹو پیدا نہیں کر سکے۔ جہاں تک اشفاق احمد کی بات ہے تو ان کی شخصیت کی تو اتنی جہتیں اتنے گوشے ہیں اور ان کے مزاج کے اتنے حصے تھے کہ کوئی آدمی ان کو پا نہیں سکتا۔ ایک بڑا طبقہ اسے دنیا دار کہتا تھا، ایک بڑا طبقہ اب بھی انہیں ''روحانی صوفی'' تصور کرتا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ان کے مزار پر بھی دھمالوں کا

Marfat.com

سلسلہ نہ شروع ہو جائے اور واصف علی واصفؒ کی طرح مزار بھی نہ بن جائے۔ حالانکہ ایک بار میری ان سے گفتگو بھی ہوئی۔ جب میں نے ان سے افسانہ مانگا تو کہنے لگے کہ بھئی میں نے تو آج تک افسانہ نہیں لکھا'' اوراق'' کے لئے بلکہ ادب میں میرے قاری کتنے ہیں۔ تلقین شاہ کے تو ہزاروں سننے والے ہیں مگر آخری وقت میں انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ادب کا عمل اور طرح کا ہے اور وہ زیادہ دیر تک رہنے والا ہے جبکہ ریڈیو اور ٹی وی کا عمل اور طرح کا ہوتا ہے جو لمحے کی خوشی دیتا ہے، لوگوں تک پیغام بھی پہنچاتا ہے مگر اس کا اثر دیرپا نہیں۔ اشفاق جیسے آدمی کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان جیسا کوئی افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ یعنی محبت کے وہ پہلو جو لطیف ترین ہیں اور جن میں جنسی جذبہ شامل ہی نہیں انہوں نے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً ان کا'' ایک محبت سو افسانے'' پہلی کتاب ہے جس کا آج تک کوئی جواب پیش نہیں کر سکا۔ اس کے بعد'' اجلے پھول'' جیسے اظہر جاوید نے اس میں ایک افسانے کا حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے ادیبوں کو موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے ادیب کشمیر کے مسئلے پر کیوں نہیں لکھتے۔ اشفاق احمد کا یہ اتنا خوبصورت افسانہ ہے کہ جس کی کوئی مثال ہی نہیں۔ اب بھی میں ان کے ایسے دس افسانے گنوا سکتا ہوں جو مجھے تحریک دیتے ہیں کیونکہ ان کے پیچھے مقصد کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت افسانہ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ وہ افسانہ ایسے لکھتے تھے جیسے ان کے اندر آگ آیا اور پھر اسی کو انہوں نے ایک پودے کی شکل دی۔ اسی طرح کا ایک افسانہ نگار جوگندر پال بھارت میں ہے۔ جوگندر پال کہتے ہیں جب میرے اندر گھمسان کا رن پڑ جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اس کا کتھارسس کرنا ہے لہٰذا میں بنیادی طور پر افسانے میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا یہ افسانہ اس کے اندر سے قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے یا انہوں نے دانستہ کہانی بنانے کی کوشش کی مثلاً بیشتر لوگوں کا یہی کام ہے کہ وہ دو اور دو چار کر دیتے ہیں تو کہانی بن جاتی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

سرفراز سید

Marfat.com

Marfat.com

میرے ملک میں اگر صحافی قلم کی حرمت نہ بیچتا تو ہم بہت آگے ہوتے

سرفراز سید

''سرفراز سید'' بے باک صحافت کے ایک عہد اور زمانہ کا نام ہے، سچائی، ایمانداری، دیانت اور بے لاگ صحافت کی روایت قائم کرنے والوں میں سرفراز سید کا نام سرفہرست ہے، قلم کے یہ وہ مجاہد ہیں جنہوں نے قائداعظمؒ کے اصولوں پر چلتے ہوئے صرف نام ہی بنایا ہے کمایا کچھ نہیں ۔ 40 سالہ صحافتی اننگ کھیل کر سرفراز سید نے صرف نیک نامی کمائی ہے اور آج کے مادہ پرستی کے دور میں اگر کسی صحافی پر نیک نامی کا لیبل لگ جائے تو اس سے بڑا خوش نصیب اور کوئی نہیں ہوسکتا، آیئے اس خوش نصیب صحافی سرفراز سید سے ملنے چلیں ۔

س: اگر سرفراز سید صاحب سے کہا جائے کہ وہ اس ڈیڑھ دو سالہ بچے کا تعارف کروائیں جو والدین کے ہمراہ 47ء کے بلووں میں ہجرت کرکے پاکستان آیا تھا تو وہ اس بچے کا کیسے تعارف کروائیں گے ؟

ج: میں نے عمر بھر شاید سینکڑوں لوگوں سے انٹرویو لئے ہوں گے اور یہ پہلا موقع ہے کہ میں خود انٹرویو دے رہا ہوں اور یہ بھی آپ کی محبت ہے ۔ مجھے متعدد بار پیش کش ہوئی کہ ہم آپ کے ساتھ شام منانا چاہتے ہیں ۔ چونکہ میں شاعر ہوں، رائیٹر ہوں، کالم نویس اور موسیقی شناس ہوں، اسی طرح زندگی کے بہت سے پہلوؤں کے ساتھ میرا تعلق ہے مگر میں نے ہمیشہ اپنی ذات کے بارے میں بہت کم بات کی ہے، آج میں اسی

Marfat.com

لئے تھوڑی سی بات کرنا چاہتا ہوں کہ بعض اوقات کچھ باتیں کہہ دینی چاہئیں وہ باتیں جن کا مجھے 40 سال سے زائد کا تجربہ ہو چکا ہے۔ جس میں ایک دن کا بھی وقفہ نہیں ہے۔ میں نے 1966ء میں ایم۔اے کیا تھا، اس کے بعد سے اب تک لگاتار کسی نہ کسی انداز میں جرنلزم سے وابستہ رہا ہوں۔ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد ہم سب کلاس فیلوز تھے، اس دور کے کچھ لوگ ایسے ہیں جو بعد میں اخبارات میں بہت نمایاں ہوئے۔

میری زندگی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ میرے والد 47ء سے پہلے انڈیا میں وفات پا گئے تھے، میں اس وقت ڈیڑھ سال کا ہوں گا مگر مجھے اتنا شعور ہے کہ جب ہجرت ہوئی ہے تو مجھے میرے چچا سید عبدالمجید شاہ صاحب نے مجھے دریائے راوی میں چلنے والی کشتی میں پھینکا تھا، جہاں میری والدہ پہلے سے سوار ہوئی تھیں، تب بڑا سیلاب آیا ہوا تھا، 14 اگست 1947ء کا دن تھا۔ ہم لوگ آدھی رات کے وقت نکلے تھے، مجھے ابھی تک وہ سین یاد ہے جب میرے چچا نے 10 فٹ کے فاصلے سے مجھے کشتی میں پھینکا تھا، کشتی ابھی تھوڑی ہی چلی تھی کہ اس پر کسی جتھے نے حملہ کر دیا تھا، وہاں فائرنگ ہونے لگی۔ میرے سامنے میرے چچا کو گولی لگی اور میں نے انہیں راوی میں گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ واقعہ تمام عمر میری زندگی کے لئے بہت بڑا حوالہ بن گیا۔ اب بھی بعض اوقات وہ سین جب میری نظروں کے سامنے آتا تھا تو آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ میرے چچا انتہائی شریف اور نرم دل انسان تھے میں اب بھی سوچتا ہوں کہ انہیں کیوں مارا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انڈیا میں ہم لوگ بہت کھاتے پیتے تھے، وہاں ہماری زمینیں بھی تھیں، ہمارا علاقہ گورداسپور کے قریب تھا جو راول پیر کے نام سے مشہور تھا۔ بہرکیف ہم سارا کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسمپرسی کی حالت میں بھاگے تھے۔ میری انتہائی باپردہ ماں جن کا تعلق سید خاندان سے تھا، لوگ ویسے بھی انہیں احتراماً بی بی صاحبہ کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میری بیوہ ماں مجھے گود میں اٹھا کر تقریباً 20 میل بھاگتی ہوئیں دریائے راوی سے شکر گڑھ پہنچیں۔ اس حالت میں کہ ان کے سر پر دوپٹہ بھی نہیں تھا، جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو میرے ایک بھائی نے کسی دکان پر ملازمت کر لی، رات کو وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر مونگ پھلیاں بھی بیچا کرتے تھے۔ ہماری زندگی کا ایک یہ دور بھی ہے جو میں ابھی تک نہیں بھول پایا۔ آج اللہ کا احسان ہے، میں نہیں کہتا کہ میں کسی خاص مقام تک پہنچ گیا ہوں مگر جو لکھتا ہوں وہ آگے پہنچتا ہے، جو میرے لئے بہت اعزاز کی بات ہے۔ میرا کالم ''راوی نامہ'' پچھلے 26 سال سے مسلسل چھپ رہا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر اس میں علمی اور ادبی پہلو ہوتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ سماجی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ میں سیاست پر ذرا کم لکھتا ہوں کیونکہ سیاست کا مجھے بڑا تلخ تجربہ ہے۔ میرے نزدیک پاکستان میں سیاست قائد اعظم کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی کیونکہ قائداعظمؒ میرے نزدیک ایسی واحد شخصیت تھے جو اپنی زندگی میں عزت کے

Marfat.com

ساتھ رخصت ہوئے اور انہیں قوم نے یاد بھی رکھا۔اس کے بعد آپ بیشک نام لے لیں کہ خواجہ ناظم الدین، لیاقت علی خان، سکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ، بھٹو اس کے بعد ضیاء الحق، فاروق لغاری، نواز شریف یا ماضی میں غلام محمد وغیرہ کوئی بھی اپنی مرضی سے اپنے عہدہ کی میعاد پوری کر کے نہیں گیا بلکہ سب کو نکالا ہی گیا۔ان میں سے کسی کو جبری اور کسی کو رسوا کر کے نکالا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے عدلیہ کے بارے میں 17 کالم لکھے، جو روزنامہ خبریں میں چھپے تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کالم نگار نے عدالتوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔

س: اپنی 40 سالہ صحافتی زندگی میں بطور پاکستانی اور خصوصاً بطور کالم نگار آپ نے کیا دیکھا؟

ج: چالیس سال کے دوران میں بے شمار واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ میں نے سیاستدانوں کی منافقتیں حتیٰ کہ عدالت کے ججوں کے فیصلے بھی دیکھے، جن کے نتیجہ میں ملک کے ساتھ بہت کچھ ہوا۔اپوزیشن کے ایک مناظرے میں رولز آف لا زیر بحث تھا، جس میں بڑے بڑے جج حضرات تشریف فرما تھے، میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ میں نے اس مناظرے میں ان معزز ججوں کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ اگر ہمارے ملک کی عدالتیں دیانتدار ہوتیں اگر وہ بے باک طریقے سے انصاف فراہم کرتیں تو ملک کا یہ حشر نہ ہوتا مگر عدالتوں سے زیادہ صحافت کی ذمہ داری تھی کہ صحافی اگر دیانتدار ہوتے میرے ملک کا صحافی اگر قلم کی حرمت کو نہ بیچتا تو عدالتوں کو بھی ہمت نہ پڑتی اور فوج کو بھی ہمت نہ پڑتی۔اب میں آپ کو چھوٹی سی بات بتاتا ہوں کہ جس دن گورنر جنرل غلام محمد نے اسمبلی توڑی ہے،اس دن بائیں بازو کے انتہا پسند اور ہمارے صحافی دوست پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر مظہر علی خان دائیں بازو کے زیڈ اے سلہری جو ٹائمز آف کراچی کے چیف ایڈیٹر تھے، دونوں نے غلام محمد کے حق میں اداریئے لکھے،انہوں نے لکھا کہ غلام محمد نے اسمبلی توڑ کر بہت اچھا کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اس تقریب میں کہا تھا کہ میں بطور صحافی یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں کہ میں ملزم ہوں۔اس وقت مجھے اسمبلی توڑے جانے کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اقرار ہے کہ صحافی کے طور پر میں نے اپنا رول ادا نہیں کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں بڑا ایماندار اور دیانتدار ہوں۔ چالیس سال ملازمت کرنے کے باوجود میرے پاس ایک موٹر سائیکل ہے۔مگر مجھے اس میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بیٹیاں دی ہیں بیٹا کوئی نہیں دیا مگر دونوں بیٹیاں پنجاب یونیورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ ہیں، دونوں ریکارڈ ہولڈر ہیں اور میرے لئے یہ بہت بڑا اثاثہ ہے۔میں ذاتی باتیں کرنا پسند نہیں کرتا مگر بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں قناعت پسند آدمی ہوں مگر ملک کے حالات کے بارے میں ہماری صحافت نے وہ رول ادا نہیں کیا جس کا تقاضا تھا۔صحافیوں کی

Marfat.com

لسٹیں چھپتی رہی ہیں جو پلاٹ لیتے رہے ہیں، حکومت سے ماہانہ بھی لیتے رہے ہیں، ایسے ایسے کالم نگار بھی ہیں جن کا اخباروں میں کالم چھپتا ہے وہاں سے بھی پیسے لیتے ہیں اس میں چیف منسٹر کا نام لکھ کر ڈی جی پی آر سے جا کر پیسے لیتے ہیں۔ ایسے بڑے بڑے نام ہیں جن کا میں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔

س: کہیں ایسا نہ ہو سرفراز صاحب! کہ ایسی باتوں سے آپ کی اپنی برادری ہی آپ کے خلاف ہو جائے؟

ج: خلاف ہونے دیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں مجھے سچ بولنا چاہیے، میں امام حسینؓ کی اولاد ہوں، خون دے سکتا ہوں خون بیچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہمارے خاندان کا وصف یہ ہے کہ خون دیا کرتے ہیں خون بیچا نہیں کرتے، میں ان لوگوں کے نام نہیں لے سکتا کیونکہ اگر نام لئے تو بہت سی جبینوں پر پسینہ آ جائے گا۔ جب میں نے صحافت کے بارے میں پہلا کالم لکھا تھا تو شور مچ گیا تھا، جس پر خود ہمارے مالک نے کہا کہ ایسے ہمارے تعلقات خراب ہوتے ہیں جس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔

س: آپ کے نزدیک اصل صحافت کیا ہے، اس کے کیا تقاضے ہیں اور معاشرے میں ایک کھرے صحافی کے رول کو آپ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟

ج: میں اب اسی طرف آ رہا ہوں۔ دیکھئے نبی کے لغوی معنی ہیں خبر دینے والا۔ رسول کا مطلب ہے رسالہ پہنچانے والا۔ صحافت کا تعلق صحیفے کے ساتھ ہے صحیفے نبیوں پر اترا کرتے تھے۔ پیغام لے کر آتے تھے، اسی میں سے صحافت کا موضوع بنا ہے۔ اب صحافت کی حرمت کیا ہے۔ خبر کی حرمت کیا ہے۔ ایک ہستی 40 سال تک لوگوں میں رہتی ہے اور چالیس سال بعد لوگوں سے پوچھتی ہے کہ لوگو! تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں اگر تمہیں یہ کہوں کہ پہاڑ کے اس طرف کوئی فوج ہے تو کیا تم اسے مان لو گے؟ لوگوں نے کہا ہم اس لئے مان لیں گے کہ تم صادق ہو، امین ہو اور دیانتدار ہو۔ ہم نے تمام عمر دیکھا ہے کہ تم سچ بولتے ہو۔ جس پر اس ہستی نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور میں اس کا رسول ہوں۔ یہ ہے ندیم صاحب! خبر کی حرمت کی بنیاد۔ پہلے تو اپنے آپ کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ میں دیانتدار ہوں، میں امانت دار اور امین ہوں۔ لوگ میری صداقت، دیانت اور امامت پر یقین کرتے ہیں پھر میں خبر دیتا ہوں۔ لہٰذا اس عظیم ہستی سرکارِ دوعالم ﷺ نے ہمارے لئے یہ عظیم روایت قائم کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خبر ہمارے لئے ایک معیار قائم کرتی ہے، کہ اس کے ساتھ صداقت، دیانت اور امانت کا ایک معیار ہو۔ اگر اسی معیار کو پیش نظر نہیں رکھتے اور خبر کو کاروبار کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ پھر وہ خبر نہیں بلکہ بلیک میلنگ، جاسوسی، سراغرسانی، پروپیگنڈہ اور اپنی مرضی

Marfat.com

کے مطابق رپورٹنگ ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو خبر کی بنیاد پر میں نے کسی سے ایک پیالی چائے کی بھی نہیں پی۔ نہ ہی کوئی فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ میں نے یہاں بڑے بڑے سیٹھوں کو، بڑے بڑے صنعتکاروں کو خالی ہاتھ دنیا سے جاتے دیکھا ہے۔ انسان کی اوقات ایک دن میں چار پانچ روٹیاں اور تھوڑا سا سالن ہے۔ آپ بے شک لاکھ روپے کا لباس پہنیں، شام کو اسے آپ نے اتار دینا ہے۔ ہر روز جب ہم سوتے ہیں تو ایک زندگی ختم ہو جاتی ہے اور صبح پھر سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے۔ یہ ہماری اوقات ہے، سکندر اعظم کے پاس کیا نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ جب میں مروں تو کفن سے میرے دونوں ہاتھ باہر نکال دینا تا کہ لوگ دیکھ لیں کہ سکندر جب دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے، لہٰذا جب یہ سوچ، فکر اور جذبہ ہو تو پھر کسی طرح کا خوف اور لالچ انسان کو نہیں رہتا۔

س: آپ نے میرے بہت سے سوالوں کے جوابات از خود ہی دے دیئے، بنیادی سوال یہ ہے کہ آپ نے زندگی میں جو بننا چاہا تھا وہی بنے یا والدین کی خواہشات کے برعکس صحافی بن گئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے خاندان میں پہلے سے کوئی صحافی موجود تھا جس سے آپ نے اثر قبول کیا؟

ج: میری والدہ تو سادہ لوح خاتون تھیں، کسی پرائمری سکول میں وہ ٹیچر بھی رہیں کیونکہ اس زمانے میں خواتین صرف تعلیم کے شعبے میں تھوڑا بہت جایا کرتی تھیں۔ ہماری خاندانی روایت یہ ہے کہ میری نانی بھی استانی تھیں، والدہ بھی استانی تھیں اور میری ایک ہمشیرہ بھی سکول ٹیچر تھیں، اب میری بیٹی پڑھا رہی ہے، میں خود پڑھاتا رہا ہوں، میری بہت سی سٹوڈنٹس بھی ہیں۔ ریگولر ٹیچر کے طور پر تو نہیں مگر جب اسکولوں کے امتحانات سے فارغ ہوتا تھا تو اپنے سکول میں جا کر پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے بعد میں ایم اے کے سٹوڈنٹس کو بھی پڑھایا۔ بہرکیف کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب بچپن میں اپنے چچا کو شہید ہوتے دیکھا یا کچھ اور جذباتی واقعات دیکھے تو لاشعوری طور پر میرے اندر ایک صحافی، اخبار نویس اور شاعر پیدا ہو گیا تھا، آپ کو یہ جان کر حیرانگی ہو گی کہ میں نے چھٹی جماعت میں اشعار کہنا شروع کر دیئے تھے، میں نے ایک بار شعر کچھ یوں لکھا:

نہ اس میں کوئی بھید ہے نہ اس میں کوئی راز ہے
شاعر تو بس ایک ہے اور وہ سرفراز ہے

اس کے بعد میں نے بچوں کے رسالے کے لئے چچوں چچوں چاچا وغیرہ نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ اس دوران میرے اندر کچھ شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میرے ماموں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح میں بھی انجینئر بن جاؤں۔ میں نے گورنمنٹ کالج سے بی ایس سی کر رکھا تھا۔ مگر میرا اس طرف رجحان نہیں تھا۔

Marfat.com

اس کے بعد میں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور نمایاں پوزیشنیں بھی حاصل کیں۔ یونیورسٹی میں بڑی سرگرمیاں رہیں، میں امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی وغیرہ ہم سب اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ''نوائے وقت''، ''امروز'' اور ''کوہستان'' اخبار ہوا کرتے تھے۔ جبکہ ''مشرق'' ابھی چھپنا شروع ہوا تھا۔ ان اخبارات میں جب میں ساتھیوں کی چیزیں چھپتی دیکھتا تو مجھے بہت رشک آتا تھا۔ مگر مجھے پہلے دن سے ہی شوق تھا کہ میں بھی کسی اخبار میں سب ایڈیٹر بن کر بیٹھ جاؤں، سب ایڈیٹر اس زمانے میں بڑی بلا ہوتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب میں نے ایم اے اردو کا امتحان دیا تو مجھے میرے دوست سیف اللہ چوہدری، چوہدری ظہور الٰہی کے پاس لے گئے، انہوں نے مجھے پوچھا کہ میں نے اخبار نویس بننا ہے یا نیشنل بینک کا آفیسر بننا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اخبار نویس بننا ہے جس پر چوہدری صاحب مجھے خود اپنے ساتھ لے جا کر مشرق میں عنایت اللہ صاحب کے پاس چھوڑ آئے، یوں اس اخبار سے میری اخبار نویسی کی حیثیت سے لائف شروع ہوگئی۔ پھر میں نے پاکستان ٹائمز والوں سے ایک مہر بنوائی جس پر لکھا تھا ''سید سرفراز احمد ایم اے اردو، سب ایڈیٹر روزنامہ ''مشرق'' وہ مہر میں نے جگہ جگہ لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اگر چہ وہ ایوب خان کا دور تھا پھر بھی اخبار والوں کی کچھ ویلیو تھی۔ سنسر شپ بھی بہت تھی، پبلی کیشن آرڈیننس بھی آ چکا تھا مگر اس کے باوجود ہم نے یہ راستہ نکال لیا تھا کہ سیاست پر کچھ نہیں لکھتے بلکہ اس کی جگہ سماجی اور معاشرتی مسائل پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مشرق والوں نے لیبر کا صفحہ، بچوں کا صفحہ، خواتین کا صفحہ طالب علموں کی ڈائری وغیرہ شروع کر دیا۔ پھر ریاض بٹالوی کے فیچر شروع ہو گئے، یہ ایک طرح سے فیملی کا گروپ بن گیا۔ بڑا اچھا ماحول تھا، ہم لوگ بعض اوقات رات کو دفتر میں میزوں پر ہی سو جایا کرتے تھے۔ اخبار میں روزانہ 18 گھنٹے الجھا رہتا تھا، اسی دور میں تھوڑی سی شاعری اور دوسری چیزیں بھی چلتی رہیں، مجھے بعد میں بعض ایڈیشنز کا انچارج بھی بنا دیا گیا، بچوں کے اور تعلیمی ایڈیشن بھی ملے جو اخبار کا حصہ ہوتا ہے۔ جس وقت پہلے روز اخبار میں میرا فیچر چھپا، میں نے اس میں اپنا بڑا لمبا چوڑا نام لکھا تھا سید سرفراز احمد بخاری ایم اے۔ اخبار والوں نے میرے نام کے ساتھ میری تصویر بھی چھاپ دی۔ میرا خیال تھا کہ اس دن میری تصویر دیکھ کر سارا شہر پاگل ہو گیا ہو گا۔ لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے کہ سرفراز سید کون ہے۔ میں اخبار لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ مجھے کسی نے پڑھا ہے یا نہیں۔ مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میرے اس مضمون کی اشاعت سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ صرف ایک آدھ شخص نے مجھ سے کہا ''اچھا یہ آپ کا فیچر ہے'' بہر حال اس تجربے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ صرف ایک روز کی بات نہیں یہ تو لائف لانگ ایک تجربہ ہے۔

Marfat.com

س: مشرق میں آپ کی صحافتی خدمات بہت زیادہ رہیں، بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ نے بیک وقت نیوز رپورٹنگ اور میگزین کے لئے کام کیا، یہ تجربات و مشاہدات کیسے رہے؟

ج: ذرا اور وقت گزرا تو 1980ء میں لاہور سے جنگ نکلا، اس وقت میں مشرق میں تھا اور مین نیوز میں کام کر رہا تھا، اقبال زبیری ہمارے چیف ایڈیٹر تھے، انہوں نے میرے بارے میں سوچا یہ ادبی ذوق کا آدمی ہے۔ (میں یہاں یہ بھی بتادوں کہ میوزک کے ساتھ میرا پینتالیس برس کا واسطہ ہے، بہرکیف یہ ایک الگ ایشو ہے) قصہ مختصر یہ کہ اقبال زبیری صاحب نے مجھے ادبی ایڈیشن کا انچارج بنا دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب زبیری صاحب الگ ہو گئے اور ضیاء الاسلام انصاری آ گئے تو انہوں نے مجھے رپورٹنگ میں بھیج دیا، رپورٹنگ میں پہلے دن ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ تو مشکل جاب ہے جبکہ ایڈیٹر اپنے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ اور رپورٹروں کی خبریں ایڈٹ کرتا ہے، اس لئے وہ Superior ہوتا ہے مگر جب میں رپورٹنگ میں آیا تو مجھے یہ اندازہ ہوا کہ رپورٹنگ کے بغیر آدمی صحافی نہیں بن سکتا۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ رپورٹر کو سب ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کو رپورٹنگ کی تربیت ہونی چاہیے۔ کیونکہ اسکے بغیر آپ اچھے صحافی نہیں بن سکتے۔ میرا کالم ''راوی نامہ'' 1980ء سے چھپنا شروع ہوا۔ چنانچہ انصاری صاحب نے کہا کہ روزانہ صفحہ نمبر 2 پر راوی نامہ چھپنا چاہئے، ان دنوں انتظار حسین صاحب کا ''لاہور نامہ'' بھی مشرق میں چھپا کرتا تھا۔ اب میں یہاں بڑی اہم بات کرتا چلوں کہ اخبارات میں کالم نویس صرف ایک ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی تجزیہ نگار ہوتا ہے۔ مثلاً مشرق میں انتظار حسین کالم لکھتے تھے، نوائے وقت میں ''میم شین'' کی ڈائری چھپتی تھی یا عبدالقادر حسن کے مضامین چھپنے شروع ہوئے۔ اس سے پہلے عرفان چغتائی کا کالم شہر نامہ چھپا کرتا تھا۔ تاہم جو آج کل اخبارات میں ''کالم نویسوں'' کے جمعہ بازار اور اتوار بازار لگ گئے ہیں۔ ایک ایک اخبار میں دس دس کالم چھپنے لگے ہیں تو مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے بلکہ ''صحیح بات کہوں گا تو لوگ برا مان جائیں گے''۔

س: یہ کیا بات ہے کہ جتنے ادیب اور ادب نواز لوگ تھے وہ سب کالم نگاری کی طرف آ گئے، بقول اجمل نیازی کے ان کی یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اب ادب کا زمانہ نہیں رہا ؟

ج: ادب کے لوگ کالم نگاری کی طرف صرف اس لئے آئے کہ ایک تو یہاں سے پیسے ملتے تھے دوسرا جب نئے نئے اخبارات آئے تو انہوں نے خود ان لوگوں سے کالم لکھوانے شروع کئے اس طرح ان کی ایک مارکیٹ بنی۔ اگر ادیب یا شاعر کو کالم نگاری سے پیسے ملتے ہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے کیونکہ ان کو روزی کے لئے ایک اچھا سلسلہ چاہیے۔ یہاں میں کسی کا نام لینے سے گریز کروں گا مگر جب بڑے بڑے نامور ادیبوں سے کالم

Marfat.com

لکھوائے گئے تو وہ پاپولر نہیں ہوئے جوان کے افسانوں، کہانیوں اور شاعری میں بات تھی وہ ان کی کالم نگاری میں نظر نہ آئی، اس کے باوجود کچھ بڑے بڑے ادیبوں نے کالم لکھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر پڑھنا ہے تو ہمارا افسانہ پڑھو۔ کیونکہ تخلیق افسانے یا شاعری میں ہوتی ہے، کالم میں کبھی تخلیق نہیں ہوتی، بات صحافی کی ہو رہی ہے تو صحافی کو عوام کا ترجمان کہا جاتا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ صحافی عوام کا لیڈر رہوتا ہے، وہ رہنما کا درجہ رکھتا ہے۔ جو بات آپ کو اگلے دن پتہ چلنی ہے جو آرٹیکل آپ نے سنڈے میگزین میں سات دن پڑھنا ہے وہ اچھا کالم نگار سات دن پہلے لکھ چکا ہوتا ہے۔ کالم نویس عوام کو یہ بتاتا ہے کہ دیکھو! کل یہ ہوا تھا، آج یہ ہوا ہے اور جو باتیں میں آپ کو بتا رہا ہوں اس سے یہ اندازہ لگائیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ یہ ہے کالم نگاری کا فریضہ، کالم نگار کو بہت زیادہ مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے بہت سارا مشاہدہ اور تجربہ چاہیے۔ اچھے کالم نگار کی مثال یہ ہے کہ بھارت کے کالم نگار کلدیب نیئر کے کالم کے روزانہ 17 زبانوں میں ترجمے ہوتے ہیں، آخر ان میں کوئی بات ہے تو وہ چھپتے ہیں ناں؟

س: آپ کو جو آزادی مشرق کے دور میں تھی کیا وہ آزادی بحیثیت ایک کالم نگار آپ کو حاصل ہے، آپ نے خود کہا تھا کہ کئی مرتبہ آپ کے ایڈیٹر کالم رکوا دیتے تھے یا ان کے کہنے پر آپ کو فرمائشی کالم بھی لکھنے پڑتے تھے، سوال یہ ہے کہ کیا اس گھٹن میں کوئی کالم نگار اپنے ضمیر کی آواز پر لکھ سکتا ہے؟

ج: جیسا میں نے بتایا کہ ''مشرق'' میں تو سیاسی کالموں پر ایک طرح سے پابندی لگ گئی تھی، جب حکومت نے پریس ٹرسٹ بنایا اور اخبار کو اپنی تحویل میں لے لیا پھر پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس آ گیا۔ اس سے پہلے بھی سنسر شپ کا ایک ماحول تھا۔ لہٰذا مشرق کے عنایت اللہ نے پالیسی یہ بنائی کہ سیاست کو تو آپ ایک طرف علیحدہ رہنے دیں اور آپ صرف ماضی کے سیاسی واقعات لکھیں جیسے مارشل لاء سے مارشل لاء تک، سید نور کی ڈائری چھپنی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ایک محنت کش کی ڈائری اور ایک طالب علم کی ڈائری اور قانون دان کی ڈائری شائع ہونے لگی۔

میں اس سلسلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں، لاہور کے موچی گیٹ میں ایوب خان کے خلاف مادر ملت کا ایک جلسہ تھا، ایوب خان کا جلسہ چونکہ سرکاری ہوتا تھا، اس لئے وہ بھی بڑا جلسہ ہوتا تھا، تاہم مادر ملت کا جلسہ سرکاری تو نہیں تھا مگر اس میں ایوب خان کے جلسے کی نسبت زیادہ لوگ آئے، اتنا بڑا جلسہ تھا کہ اخبارات کے چیف ایڈیٹرز نے خود بیٹھ کر یہ جلسہ رپورٹ کیا، مشرق کے اقبال زبیری صاحب نے یہ جلسہ رپورٹ کیا مگر ہوا یہ کہ اس تقریر کی اشاعت پر پابندی کے آرڈر ہو گئے کہ جلسہ کے متعلق خبر سنگل کالم سے زیادہ

Marfat.com

نہیں جائے گی۔ اخبار والوں نے پوچھا اتنا بڑا جلسہ اور سنگل کالم کی خبر۔ لوگ تو آگ لگا دیں گے، اب آپ دیکھیں کہ ایسے موقع پر صحافت کی ذہانت کیا کہتی ہے، انہوں نے پورے صفحے پر جلسے کی تصاویر لگا دیں اور ساتھ سنگل کالم کی خبر لگا دی۔ اب تصویر کو سنسر کرنے کے لئے تو انہوں نے نہیں کہا تھا۔ اس صورت میں خبر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ جب پورا صفحہ بڑے جلسے کی گواہی پیش کر رہا تھا۔

س: یہ فرمائیں آج کے نوجوان صحافی جس انداز سے کام کر رہے ہیں یا جس ڈگر پر چل رہے ہیں کیا آپ کو امید ہے کہ مستقبل میں ان میں سے کوئی حمید نظامی، عنایت اللہ، اقبال زبیری اور آغا شورش کاشمیری بنے گا؟

ج: میں نے دو سال میں ایم۔ اے اردو کیا تھا، میرے بچے پوچھتے ہیں کہ ابو آپ نے دو سال لگائے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ اس وقت میرے پاس کوئی انٹرنیٹ تھا نہ ٹیلی ویژن اور دیگر سہولتیں تھیں، لائبریریاں بھی کم تھیں، مگر اب انفارمیشن کا دور ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی ہے اور میرا یہ بڑا خوشگوار تجربہ ہے۔ مثلاً پہلے زمانے کے لوگوں سے کہنا پڑتا تھا کہ جاؤ جا کر پڑھو، محنت کرو، مگر اب یہ کہنا نہیں پڑھتا بلکہ اب خود نوجوان اپنے شوق سے انفارمیشن ٹیکنالوجی سیکھ رہے ہیں، کوئی سی ایس اس اور کوئی ایم بی اے کی تیاری کر رہا ہے۔ اب طالب علموں میں مسابقت کا دور آ گیا ہے، اب وہ باہر کی دنیا کو بھی دیکھ رہے ہیں اور یہاں کی دنیا کا جائزہ بھی لے رہے ہیں۔ لہٰذا اب جو جرنلزم کا سٹوڈنٹ ہے، اس کا مطالعہ اور اس کا مشاہدہ زیادہ ہے، ہمارے زمانے میں تو یونیورسٹی میں جرنلزم کا شعبہ ہی نہیں تھا، مگر اب ہر یونیورسٹی میں جرنلزم کا شعبہ قائم ہے۔ البتہ ایک حرج ضرور ہو رہا ہے۔ مثلاً ہم اپنے نیوز ایڈیٹرز اور دوسروں سے سیکھا کرتے تھے، وہ ہمیں بتایا بھی کرتے تھے، وہ ہماری ایڈیٹنگ کرتے تھے مگر اب جو سٹوڈنٹ آتا ہے وہ پہلے سے ہی استاد بنا ہوتا ہے، اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ اسے بہت کچھ آتا ہے، میرے پاس ایسے نوجوان صحافی بھی ہیں جو آ کر کہتے ہیں کہ جی میری نیوز کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ میں ان سے کہتا ہوں بڑی اچھی بات ہے کہ کوئی چیلنج نہیں کر سکتا مگر یہ نہ کہا کریں کیونکہ اگر نوجوانی میں ہی اپنے نام کے آگے استاد لکھ دیا تو پھر ریاضت چھوٹ جائے گی۔

(نوٹ: سرفراز سیّد کا یہ انٹرویو تب ریکارڈ کیا گیا جب وہ روزنامہ ''خبریں'' سے وابستہ تھے۔)

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

Marfat.com

خبر قبیلہ

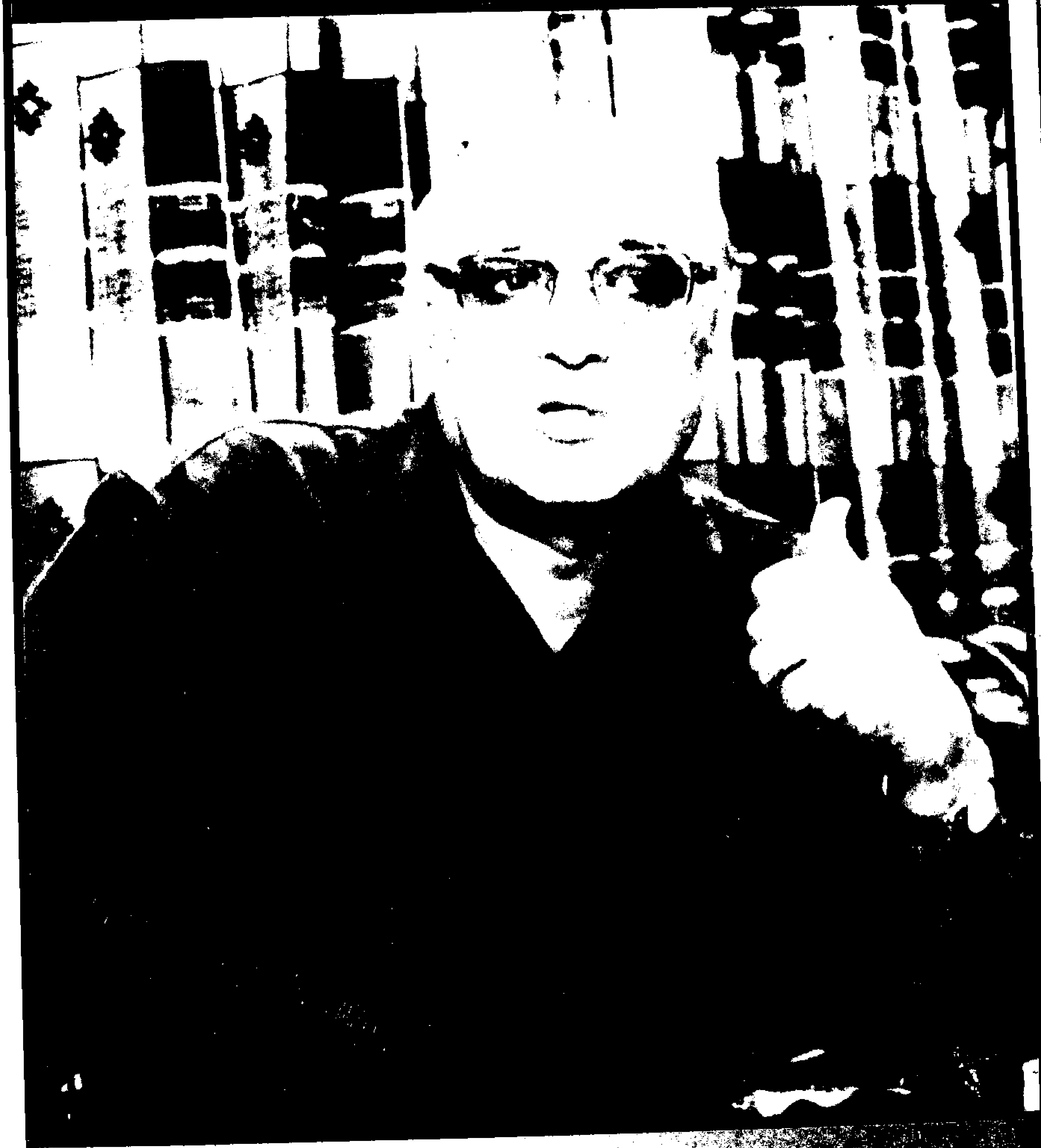

Marfat.com

Marfat.com

اپنے خاندان میں واحد پڑھا لکھا شخص ہوں

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد شعروادب کی دنیا کا ایک معتبر اور معروف نام ہے۔ وہ بیک وقت استاد، ادیب، شاعر، ڈرامہ نویس اور کالم نگار ہیں۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ شاعری میں ان کی اولین پہچان ہے۔ ایک معلم سے بیوروکریٹ کی ریٹائرمنٹ تک ان کی داستان حیات غیر معمولی محنت اور جدوجہد سے عبارت ہے، نظم لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ڈرامہ نگاری میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ بطور کالم نگار ان سے زیادہ کوئی شگفتہ بیان نہیں جبکہ لطیفہ گوئی میں عطاء الحق قاسمی سے بہت آگے ہونے کے باوجود کبھی مزاح نگار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، امجد اسلام امجد سے شعروادب کے موجودہ رجحانات کے موضوع پر ایک تفصیلی نشست ہوئی۔

سوال: آپ اس وقت جس مقام پر ہیں، کیا یہی آپ کا خواب تھا یا زمانہ طالب علمی میں آپ کی سوچ کچھ اور تھی مثلاً کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں یا حالات خود بخود آپ کے لئے راستہ صاف کرتے چلے گئے؟

ج: اصل بات یہ ہے کہ بچپن کی جو خواہش ہوتی ہے، اس کا کوئی سر پیر اس لئے نہیں ہوتا کہ خواہش کو تعبیر دینے کے لئے جو صلاحیتیں ضروری ہوتی ہیں، بچپن میں آدمی اس سے ماورا ہوتا ہے۔ اس کو پتہ نہیں ہوتا کہ جو میں بننا چاہتا ہوں مجھ میں وہ صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی جب سن شعور کو پہنچتا ہے اس وقت

Marfat.com

وہ اپنے بارے میں جو چیزیں سوچتا ہے وہ غالباً زیادہ Reliable ہوتی ہیں۔ میرا جو لڑکپن کا زمانہ تھا اس وقت جب میں ابھی کراس روڈ پر تھا کہ میں رائیٹر بنوں گا یا کرکٹر بنوں گا تب میری خواہش ہوتی تھی کہ میں کرکٹر بنوں۔ کرکٹ میں گزارے موافق کھیلتا تھا مگر آہستہ آہستہ آگے چل کر اندازہ ہوا کہ میں شاید کرکٹ کے لئے اتنا موزوں نہیں ہوں۔ لہٰذا میں اردو لٹریچر کی طرف آ گیا۔ اب میں زندگی کے اس موڑ پر بیٹھا ہوں میرا خیال ہے کہ اپنے بارے میں میرا یہ فیصلہ بہت اچھا تھا۔ اس میدان میں اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت اور شہرت دی، نام بھی دیا۔

س: آپ کے والد صاحب کیا بزنس مین تھے؟

ج: بزنس مین تو بہت بڑا لفظ ہے، وہ بنیادی طور پر ایک دستکار تھے، ہاتھ سے کام کرنے والے آدمی تھے، میرے نزدیک تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ میرا باپ ایک محنت کش آدمی تھا۔ اب تو ماشاءاللہ بزرگ ہو گئے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ہماری فیملی میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ میرے صرف ایک چچا تھے جو میٹرک سے آگے گئے، ان کے بعد میں دوسرا تھا، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ اس طرح کے خاندان میں کوئی لڑکا زیادہ آگے نہیں جا سکے گا۔

س: آپ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ آپ کے باپ اور دادا لوہے کا کاروبار کرتے تھے کیا اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سو سنار کی، ایک لوہار کی ؟

ج: نہیں جی یہ محاورے کی حد تک تو ٹھیک ہے، بہرحال ہر پیشہ قابل تعظیم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسلام اور مذہب کا ہی کمال ہے کہ جس نے دنیا میں پہلی بار اگر لوگوں کا جو عزت کا شرف ہے اس کو پیشوں سے الگ کیا اور انسان کی جو ذاتی خوبی ہے اس کو معیار بنایا ورنہ اس سے پہلے خاندان رنگ، نسل اور پیشے چھوٹائی اور بڑائی کی علامت ہوا کرتے تھے۔

س: آپ کے والدین آپ کو کیا بنانا چاہتے تھے؟

ج: جیسے میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ ان کی جو دنیا تھی وہ اتنی وسیع سوچوں کی حامل نہیں تھی مثلاً اسی زمانے میں برانڈرتھ روڈ میں 50 کے عشرے میں ہارڈ ویئر کا کاروبار شروع کیا تھا۔

پھر وہ دستکاری سے نکل کر اس طرف آ گئے، ان کا زیادہ سے زیادہ خواب تو یہی ہوگا کہ میں انہی کی دوکان پر جا کر بزنس کروں تاکہ وہ نسبتاً اچھی زندگی گزار سکیں۔ اس سے آگے انہوں نے تو کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس کے بعد جو سوچا میں نے ہی سوچا مگر اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے میری سوچ میں کوئی روڑے نہیں اٹکائے، اپنی

Marfat.com

مرضی مجھ پر نہیں ٹھونسی اور جو میں چاہتا تھا مجھے کرنے دیا، اس کے لئے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔

س: آپ کی تربیت میں والد اور والدہ دونوں میں سے کس کا زیادہ عمل دخل رہا؟

ج: یہ بڑی مشکل سی بات ہوتی ہے بہر حال ماں اور باپ کا اپنا اپنا رول ہوتا ہے۔ رشتہ داروں اور اساتذہ کا اپنا رول ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تو دونوں نے ہی اپنے اپنے حصے کا کام کیا ہوگا۔

س: زمانہ طالب علمی میں آپ کے کس قسم کے مشاغل تھے؟ ان مشاغل کا آج کل کے نوجوانوں کی تفریحات سے موازنہ کریں تو آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج: یہ تو میرے خیال میں موازنہ ہی غلط ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ وسائل نہیں تھے جو کہ آج کے بچے کے پاس ہیں۔ اس زمانے میں کمپیوٹر نہیں تھا بلکہ ٹیلی ویژن بھی اس زمانے میں شاید نیا نیا تھا۔ اس کے علاوہ جو ہوٹلنگ وغیرہ ہے یا گاڑیاں اس قدر آ گئیں کہ سفر اتنے آسان ہو گئے۔ یہ چیزیں تو اس وقت ہوا ہی نہیں کرتی تھیں لہٰذا آج کے بچوں سے اپنے زمانے کے بچوں کے مسائل کو کیسے Compare کر سکتے ہیں۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ آج کے بچوں کو اتنا برا نہیں سمجھنا چاہیے ظاہر ہے جو خرابیاں ہمیں ان میں نظر آتی ہیں۔ اس میں بہت سا حصہ زندگی کی تیز رفتاری اور وسائل کی بہتات کا بھی ہے۔ ہمارے زمانہ میں بھی جنہوں نے غلط کام کرنے ہوتے تھے وہ کوئی کم نہیں کرتے تھے۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آج کی نسل کے جو میڈیم کے اظہار ہیں وہ ذرا مختلف ہیں۔ مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ بچے اچھے ہی ہوتے ہیں مگر اتنا فرق پڑ گیا ہے کہ جو سوسائٹی کی تربیت تھی وہ آجکل بچوں کی کم ہوتی جا رہی ہے۔

س: جس طرح آپ کا مزاج ہے زمانہ طالب علمی میں فلمیں تو ضرور دیکھتے ہوں گے؟

ج: بہت فلمیں دیکھتا تھا، سینما بینی کا بہت شوق تھا، اس وقت اچھی کلاسیکل انگریزی فلمیں آتی تھیں۔ بی اے، تھرڈ ایئر یا فورتھ ایئر تک فلمیں دیکھیں پھر جب ٹیلی ویژن اور وی سی آر آیا تب سینما بینی بالکل ہی ترک کر دی اب تو مدت ہو جاتی ہے سینما کی شکل دیکھے ہوئے۔

س: آپ کے زمانے میں فیورٹ فلم سٹارز کون سے تھے؟

ج: یہ جو ہمارے لڑکپن کا دور تھا تو یہ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کا دور تھا۔ اس کے ساتھ نرگس، کامنی کوشل اور وحیدہ رحمٰن تھیں۔ ظاہر ہے ہم لوگ ان آرٹسٹوں کے بہت فین تھے، ان میں سے کئی کا تو میں اب بھی فین ہوں کیونکہ یہ بڑے گنی لوگ تھے۔ ہمارے زمانے میں نوشاد، ایس ڈی برمن، مدن موہن اور روشن تھے۔ پاکستان میں خواجہ خورشید، انور رشید، عطرے طفیل احمد اور بے شمار میوزک ڈائریکٹر تھے۔ میوزک تو خیر اب بھی

Marfat.com

ہمارا بہت اچھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فلمیں ہم بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ شروع میں مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا پھر سکول کی بزم ادب میں کہانیاں سنایا کرتا تھا۔

میں نویں جماعت میں سکول کے ''نشانِ منزل'' رسالے کا ایڈیٹر تھا دلچسپ بات یہ ہے کہ چھٹی جماعت میں ایک ٹیچر نے میرا نام کہانیوں کی مشین رکھا ہوا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے ہاں بھئی کہانیوں کی مشین ہمیں کہانیاں سناؤ۔ اس دور میں کہانی سناتے سناتے اور پھر شاعری کا شوق ہوا۔ میں نے بھی شروع میں الٹی پلٹی شاعری شروع کی۔ میں فرسٹ ائیر میں جب سولہ سترہ برس کا ہوں گا تب میری چیزیں چھپنا شروع ہو ئیں۔ پھر 1966ء کی بات ہے جب میں 22 سال کا تھا تو اس وقت کے جو بڑے ادبی رسائل تھے ان میں ''فنون'' اور ''نقوش'' شامل ہوتے، ان میں میری تخلیقات چھپنا شروع ہوئیں۔

س: سنا ہے ریڈیو اور ٹی وی نے ابتداء میں آپ کی بہت حوصلہ شکنی کی مگر آپ نے تہیہ کر رکھا تھا جب تک ڈرامہ پاس نہیں ہوگا آپ ہمت نہیں ہاریں گے؟

ج: خیر ریڈیو نے تو مجھے بہت سپورٹ کیا، کیونکہ اس وقت صرف ریڈیو تھا، ریڈیو پر تو مجھے اتنی دقت نہیں ہوئی مگر ٹیلی ویژن پر یقیناً مجھے بہت دقت ہوئی، لیکن اب بھی جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو کچھ قصور اپنا بھی نظر آتا ہے۔ مگر اس وقت ٹیلی ویژن چونکہ نیا نیا بنا تھا۔ اس کے پاس کوئی فارمولا یا طریقہ کار نہیں تھا، کوئی بنانے والا نہیں تھا۔ اس لئے سب لوگ کام کر کر کے سیکھ رہے تھے۔ ہم جب اس عمل سے گزرے تو کچھ زیادہ ٹائم لگ گیا۔

س: آپ کو زیادہ شہرت شاعری سے ملی یا ڈرامے سے؟

ج: شہرت دراصل بڑا عجیب لفظ ہے اگر تو آپ شہرت کو Volume کے حساب سے دیکھتے ہیں تو ظاہر ہے ٹی وی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ٹیلی ویژن دس کروڑ پاکستانی عوام ہی دیکھتے ہیں چنانچہ اس تعداد کے اعتبار سے تو شہرت مجھے ڈرامے سے ہی ملی مگر وہ جو شاعری کی شان ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ مخصوص کلاس سے ممکن ہے۔ ان کی تعداد ملک بھر میں خواہ چار پانچ لاکھ سے زیادہ نہ ہو مگر وہ لوگ شاعری شناس ہیں لہٰذا ٹی وی ڈرامے اور شاعری کو Compare کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بہرکیف اللہ کا شکر ہے کہ دونوں ہی اصناف میں مجھے بہت شہرت اور عزت ملی۔ جتنی تعداد میں میری کتابیں شائع ہوئیں۔ اتنی بہت کم لوگوں کی شائع ہوئیں۔ ہمارے ہاں کتاب عموماً بکتی نہیں ہے مگر میری ایک کتاب کے بیس یا بائیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ میری بنیادی پہچان شاعری ہی ہے ڈرامہ اس کے بعد ہے۔

Marfat.com

س: شعراء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں عشق اور محبت کے کسی جذبے میں جب ٹھوکر لگتی ہے تب وہ شعر کہنے لگتے ہیں، کیا یہ خیال درست ہے؟

ج: درست تو کیا یہ تو خیال ہی سرے سے غلط ہے، بات یہ ہے کہ شاعری صرف جذبات کا نام نہیں ہے، اس میں احساسات اور خیالات بھی ہوتے ہیں، اس میں تخیل اور خواہش بھی ہوتی ہے۔ اس میں آدرش بھی ہوتے ہیں، اس میں مشاہدہ اور تجربہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عشق ومحبت تو ان سارے جذبوں میں صرف ایک چیز ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ اس کا غلبہ بہت زیادہ رہا، شاعری میں بنیادی رنگ تو یقیناً عشق ومحبت اور ہجر ووصال کے مضامین ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اس تصویر میں بے شمار رنگ ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو شاعری ہوتی ہے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا۔

س: شاعری سے قطع نظر کوئی بھی شخص عشق ومحبت کے جذبے سے انکار نہیں کرسکتا۔ آپ جوانی کے دور میں کبھی کسی ایسے جذبے سے گزرے ہیں؟

ج: وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس طرح ہم عشق اور محبت کے جذبے کی بڑی توہین کرتے ہیں یعنی جب ہم اس جذبے کو ایک لڑکی یا عورت تک محدود کر لیتے ہیں تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ تو بڑا عظیم جذبہ ہے اسے کسی ایک فرد تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ مرد یقیناً اس میں ہوتا ہے مگر عشق کو مرد تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔ عشق بنیادی طور پر آپ کو قربانی اور سبق سکھاتا ہے، آپ کو برداشت سکھاتا ہے، جب اس سطح سے آگے جاتے ہیں تو یہ چیزیں آپ کے اردگرد کے لوگوں میں بٹ جاتی ہیں، آپ کے ملک وقوم اور معاشرے میں بٹ جاتی ہیں، نوجوانی میں یقیناً عشقیہ تجربات ہوتے ہیں، میرے بھی تھے جو میری کئی کتابوں اور نظموں میں نظر آتے ہیں اور میرا وہ بہت قیمتی سرمایہ ہیں، ان پر میں قطعی شرمندہ نہیں ہوں، میں ان کو بہت پسند کرتا ہوں مگر آدمی کو اس سے آگے بھی دیکھنا چاہیے یعنی عشق وہ شمع ہے جس سے آپ کو چراغ جلانے چاہئیں۔

س: میں آپ کی بات نہیں کر رہا مگر شاعروں پر ایک عام الزام یہ بھی ہے کہ انہیں پینے پلانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ کیا یہ الزام درست ہے؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے، ایک زمانہ وہ تھا جب شراب کو برا سمجھا ہی نہیں جاتا تھا لہٰذا ایسی سوسائٹی میں شراب پینے والے بندے کو آپ کیسے برا کہیں گے، کہ جہاں عام گھروں میں اٹھتے بیٹھتے شراب آفر کی جاتی ہے اور اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے وہ جو زمانہ تھا جب انگریزوں کی غلامی تھی، نوکریاں لوگوں کے پاس نہیں تھیں۔ فن اور آرٹ کے سرپرست مر گئے، بادشاہ اور نواب ختم ہو گئے،

Marfat.com

اس دور میں جب ریڈیو آ گیا تو تھوڑی بہت محفلیں ہونے لگیں، تب اس سے ان کا ایک سٹائل بن گیا ہے، یہ چیزیں وقت کے ساتھ ساتھ تھیں مگر جوں جوں آپ دیکھتے ہیں کہ وقت بدلتا گیا اور شاعروں نے بھی نارمل زندگی گزارنا شروع کر دی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کی ذمہ داریوں میں پھنس گئے، تب آہستہ آہستہ یہ چیزیں ختم ہوتی چلی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں جو پینے والے ہیں یہ بنیادی طور پر ان کا انفرادی فعل ہے۔ کوئی آدمی جس طرح بھی خوش رہتا ہے تو رہے، کیونکہ اس نے اپنی قبر میں جانا ہے، اسے اپنا حساب خود دینا ہے، اس لئے ہمیں ان کا چوکیدار نہیں بننا چاہیے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اب بھی ہمارے ساتھیوں میں سے جو اس قسم کا شوق رکھتے ہیں، میں انہیں اکثر کہتا ہوں کہ یار اگر تم اس کو انجوائے کرنے کے لئے پیتے ہو تو اس کا حساب اللہ تعالیٰ تم سے خود لے گا مگر اتنا پیار نہ کرو کہ لوگ تمہیں انجوائے کرنے لگیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں ہم لوگ جس نسل میں پیدا ہوئے ہیں اور جیسی ہمارے گھر کی اور خاندانی تربیت تھی، ماحول تھا، میں اس طرف نہیں گیا مگر بنیادی طور پر سمجھتا ہوں کہ پہلے وقت کے لوگوں کو یہ بات بطور الزام نہیں رکھنی چاہیے۔

س: کہا جاتا ہے کہ آپ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں؟

ج: یہ بالکل درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میری طبیعت میں ایک خاص قسم کا نظم ہے۔ میں چیزوں کو قریب سے دیکھتا ہوں، ایک چیز کی ابتداء، درمیان میں اس کے اختتام کو ملا دیتا ہوں، یعنی وہ چیزیں ہیں جس نے آگے چل کر مجھے کامیاب ڈرامہ نگار بنایا، اب بھی جب یہ چیزیں میں دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ سب چیزیں میرے مزاج کا حصہ تھا، اسی وجہ سے میں زیادہ نظم کی طرف مائل ہوا۔ کیونکہ نظم میں آپ ایک بات پھیلا کر کرتے ہیں، میں نے غزلیں بھی بہت لکھی ہیں مگر غزل میں ہم سے پہلے اتنے بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم غزل لکھ لیں تب اپنے عہد میں گزارا تو ہو جاتا ہے مگر جب بقول ناصر کاظمی آدمی میر کو پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ شاید ہم نے کوئی ایسا تیر نہیں مارا، مگر میں نظم کے میدان میں سمجھتا ہوں چونکہ یہ نئی صنف ہے اور دنیا جتنی تیزی سے بدل رہی ہے، ماحول بدلتا رہتا ہے اور اگر آپ اچھی نظم کہنے کا ہنر جانتے ہیں تو یقین جانئے نظم میں بڑا مارجن ہے۔

س: ہماری فلمی ایکٹرسوں میں اکثر نمبرون کی بحث اور دوڑ جاری رہتی ہے مگر یہ کیسا طبقہ ہے کہ جو پڑھے لکھے شاعر حضرات ہیں ان میں بھی نمبرون کی بحث جاری رہتی ہے، کوئی فیض کو بڑا کہتا ہے تو کوئی قاسمی صاحب کو بڑا کہتا ہے، آخر یہ کیا سلسلہ ہے؟

ج: یہ پڑھے لکھے کی بات نہیں ہے مگر جب ایک دوڑ ہوتی ہے تو اس میں آٹھ دس دوڑنے والے ضرور

Marfat.com

ہوتے ہیں ویسے ان کے ساتھ ہزاروں بھاگتے ہیں، آخر میں چند لوگ پہلی صف میں ہوتے ہیں، اسی طرح سارے ہی اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہوتے ہیں جیسے آپ نے احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کا نام لیا۔ اس کے بعد ناصر کاظمی آ گئے، فراق گورکھپوری اور ساحر لدھیانوی تھے، یہ سب ایک ہی زمانے کے شاعر تھے، جو اپنے زمانے سے فلٹر ہو کر آگے آ گئے، اسی طرح ''احسان دانش''، ''صوفی تبسم'' اور ''حفیظ جالندھری'' تھے، یہ ایک مکمل کہکشاں تھی، ان میں کچھ اپنے اپنے رنگ کے تھے کچھ کلاسیکل انداز کے شاعر تھے جو ایک طرف ہو گئے۔ ان میں سے لسٹیں بن گئیں کہ یہ پہلی صف میں ہیں، کچھ جو ماڈرن زمانے کے شاعر تھے جو آزاد نظم کہتے تھے جن میں ن۔م۔راشد، مجید امجد اور میراں جی تھے۔

چنانچہ ان لوگوں میں آگے جا کر گروپ بن گئے جیسے فلم میں دیکھتے ہیں، پانچ سات آٹھ بڑے ایکٹر ہوتے ہیں کوئی کسی کو زیادہ پسند کرتا ہے تو کوئی کسی کو مگر ہوتے وہ بھی بڑے ایکٹر ہیں۔

س: یہ کیا رجحان ہے کہ قاسمی گروپ، وزیر آغا گروپ کو گالیاں دیتا ہے اور وزیر آغا گروپ قاسمی گروپ کے خلاف دشنام طرازی کرتا ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

ج: کوئی کسی کو گالیاں نہیں دیتا، یہ تو چند بندے ہیں جو انفرادی طور پر ایسا کرتے ہیں آپ نے جن صاحب کا نام لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ساری صورتحال کو بگاڑنے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔

س: میں نے تو تین نام لئے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا اشارہ کن حضرات کی طرف ہے؟

ج: یہ میں آپ کو بتاتا ہوں، چونکہ میں نے فیض صاحب، ندیم صاحب اور وزیر آغا صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، آغا صاحب بڑے محترم آدمی ہیں، ان کی تنقید میں بڑا Contribution ہے۔ وہ ایک بہت بڑی ادبی شخصیت کے مالک ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ بڑی ادبی شخصیات کا آپس میں مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ''احمد ندیم قاسمی''، ''فیض صاحب'' یا ''فراق گورکھپوری'' سے مقابلہ کریں گے تو بات سمجھ میں آتی ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ ان کے جو حواری ہوتے ہیں، یہ اصل میں ان کی سیاست ہے جسے وہ اپنے بزرگوں کے نام لگا دیتے ہیں اور ان کا نام لے کر اپنی دوکانیں چمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب، ندیم صاحب کی عزت کرتے تھے اور اگر انور سدید صاحب قاسمی صاحب کے خلاف اتنا بڑا محاذ نہ کھولتے تو میرا نہیں خیال کہ بات آگے نہ بڑھتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارا قصور انہی کا ہے اور بھی لوگ ہوں گے، جنہوں نے اس بے معنی چیز کو آگے بڑھایا ہو گا مگر جو زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ بزرگوں کی عزت کریں اور بڑے لوگوں کے کام کو سراہیں۔

Marfat.com

س: اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ اس دور کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

ج: ہماری جو بڑی یعنی Major نسل ہے، اس میں تو میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا نام لوں گا مگر اب فراز بھی ندیم صاحب کی عمر میں اتنا چھوٹا شاعر نہیں ہے، وہ بھی ہمارے عہد کا بڑا شاعر ہے۔ منیر نیازی نے بھی اپنے رنگ میں بڑا اچھا کیا اس سے پہلے مجید امجد اور ناصر کاظمی کا زمانہ تھا۔

س: محسن نقوی کے ساتھ آپ کا کوئی تنازعہ تھا؟

ج: میرا نہیں خیال کہ ایسی کوئی بات تھی۔ محسن اتنا پیارا شخص تھا اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی وہ ہر وقت خوش دلی سے ہنس کر دوسروں سے ملتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بھی میری اتنی ہی عزت کرتا تھا جتنی میں اس کی عزت کرتا تھا۔ یہ ہمارا تہذیبی زوال ہے کہ اگر ہم خود بڑے نہیں ہو سکتے تو جو بھی ہمیں بڑا نظر آئے اس کو چھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جو آپ کے اخبارات اور رسائل کے ادبی ایڈیشن آ گئے ہیں جنہوں نے ادب کو ہی گلیمر دے دیا، چار کلر رنگین تصویریں آ گئیں، اس چیز نے بھی ادب کی بربادی کی ہے، اخبار والوں کا بھی اس لحاظ سے بڑا قصور ہے، انہوں نے ادبی ایڈیشن نکال کر غلط روش کو بڑا فروغ دیا کہ وہ لوگ جو اسے کلاس کے نہیں تھے، ان کو میڈیا کے ذریعے آگے لے آئے مگر بہت سے لوگوں نے صحیح کام بھی کیا۔ اب بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن میں اپنا ٹیلنٹ کم ہے وہ بھی ہر وقت اس انداز میں بے پر کی اڑاتے ہیں کہ فلاں فلاں کے خلاف ہے، یہ لوگ سینکڑوں باتیں اپنی طرف سے گھڑتے رہتے ہیں۔

س: مثلاً آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امجد صاحب جب مشاعرے کرواتے ہیں تو اپنے منظورِ نظر شعراء کو باہر لے جاتے ہیں، انہیں فائدے پہنچاتے ہیں، آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: اس میں بڑی سیدھی سی بات ہے ندیم جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں پاکستان کی بات نہیں کرتا مگر صرف لاہور میں کم از کم 70 یا 80 شعراء ایسے ہیں جنہیں ہم اچھے شاعر کہہ سکتے ہیں۔ جن میں بزرگ بھی ہیں، ہماری عمر کے بھی ہیں اور نئے گروپ بھی ہیں۔ بہرکیف ان چاروں گروپوں میں 80 کے قریب شعراء ہیں۔ اب آپ مجھے اے بی سی کہہ یا کسی کو بھی جو اعتراض کرنے والا ہے اس کو یہ ذمہ داری سونپ دیں کہ بھائی یہ 80 شعراء ہیں ان میں سے ہمیں تو کوئی 20 شاعر مشاعرے کے لئے دے دیں، کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کی بنائی ہوئی فہرست سے دوسرے لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔ اول تو اب اسی وجہ سے میں نے مشاعرے ہی چھوڑ دیئے ہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ مشاعروں کو پروموٹ کرنا چاہیے، ہمیں انہیں آگے بڑھانا چاہیے، مگر جب میں نے اتنی گندگی اور ذلت دیکھی تو میرا دل اس سے اکتا گیا کہ جو بھی کسی کے فائدے کی بات کرو، اس کا الٹا

Marfat.com

مطلب لیا جاتا ہے، میں نے ان کو بیٹھا کر سمجھایا کہ ہم کوئی طریقہ ایسا کریں کہ سال میں چار پانچ بڑے مشاعرے لاہور میں کروایا کریں اور ہر مشاعرے میں دس دس شاعر بدلتے جائیں۔ یہ واحد طریقہ ہے کہ جس سے آپ تمام اچھے شعراء کو موقع دے سکتے ہیں مگر ایک وقت میں 80 شعراء کیسے آ سکتے ہیں؟ جس کا نام شامل نہیں ہوتا وہی نکتہ چینی کرنے لگتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جو مشاعرے ہوتے ہیں اس میں ہماری بات زیادہ سن لیتے ہیں مگر عام طور پر یہ کمیٹیاں ہوتی ہیں، بہت سارے لوگ اپنی اپنی رائے دیتے ہیں، ان میں کچھ لوگ منتخب ہو جاتے ہیں اور کچھ رہ جاتے ہیں۔ مگر اب یہ کہنا کہ جو لوگ آئے ہیں وہ شاید میرے بڑے من پسند تھے میں تو دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن سے میری بول چال بھی بند ہے۔

س: پروین شاکر کے بعد ہم کوئی نئی پروین شاکر سامنے نہیں لا سکے، اس کا کیا سبب ہے؟

ج: اس بات کو بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ 1950ء سے پہلے 300 سال کی شاعری میں پروین شاکر کیا کوئی بھی شاعرہ نہیں آئی جو ادا جعفری، زہرہ نگار، خدیجہ وغیرہ ہیں یہ تو پچھلے پچاس سال میں آئی تھیں۔ اب ان پچاس سالوں میں پروین نے اس سطح سے اپنے آپ کو نکالا کہ وہ نمبر ون آ گئیں مگر یہ ظاہر ہے کہ نمبر ون والے روز روز تو نہیں آتے، پروین شاید ایک دم آگے نکل گئیں۔ جس قسم کی ان میں صلاحیتیں تھیں ایسی نئی شاعرہ پیدا ہونے میں ایک وقت لگتا ہے۔

س: معلمی ایک اچھا پیشہ ہے، آپ نے ابتداء بطور معلم کی حیثیت سے کی پھر یہ کیا ہوا کہ استاد سے بیوروکریٹ بن گئے؟

ج: میں نے اپنی مرضی سے کبھی بیوروکریٹ بننے کی کوشش نہیں کی زیادہ عمر میں نے پڑھایا ہے۔ میں نے پچیس برس پڑھایا ہے، مثلاً میں 1975ء میں آرٹس کونسل کا ڈائریکٹر رہا، چار سال میں اس عہدے پر رہا، پھر واپس آ کر بھی 17 سال تک پڑھاتا رہا ہوں، بعد میں مجھے ایک ایسا چانس دیا گیا جو میرے مزاج کا تھا۔ انہوں نے مجھے اردو سائنس بورڈ کا چیئرمین لگا دیا۔ اس کے بعد جب میں واپس آیا تو غالباً انہوں نے یہ محسوس کیا کیونکہ ہمارے تعلیم کے شعبہ میں پڑھانے والے پروفیسروں میں بہت کم لوگوں کو ایڈمنسٹریشن کا تجربہ ہے، وہ ساری عمر پڑھاتے ہی رہتے ہیں غالباً پنجاب گورنمنٹ یا محکمہ تعلیم نے محسوس کیا کہ یہ ایک آدمی ایسا ہے جس کا Exposure ہے اور چلڈرن کمپلیکس ایک ایسا ادارہ ہے تو شاید یہ شخص دوسروں کی نسبت یہاں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے لہٰذا یہ سمجھتے ہوئے انہوں نے مجھے یہاں پر لگا دیا، بیوروکریسی تو تب ہوتی جب آپ کسی اس طرح کی پوسٹ پر جائیں جہاں آپ کے پاس بیوروکریٹ پاور ہو مگر ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا میں انیسویں گریڈ

Marfat.com

میں پڑھاتا تھا، انیسویں گریڈ میں ہی میں یہاں پراجیکٹ ڈائریکٹر تھا، یہاں میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جتنی میری تنخواہ ایجوکیشن میں تھی، اتنی ہی تنخواہ یہاں ہے۔

س: کئی ادیب شاعر ایسے ہیں جنہوں نے جب دیکھا کہ ادب اور شاعری میں فائدہ نہیں ہے تو انہوں نے کالم نگاری شروع کردی ایسے بہت سے لکھنے والوں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ج: میرا ایسا خیال نہیں ہے، کالم نگار وہی چل سکتا ہے جسے کالم لکھنا آتا ہو، اخبار والے پاگل نہیں ہوتے یہ جو سیٹھ ہوتے ہیں وہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں، انہیں پتہ ہے کہ کس کا کالم پڑھا جائے گا، اور کون کالم لکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ سین سٹیم نے جو کم درجے کے اخبارات ہیں ان میں تو ایسے کالم نگار چل جاتے ہیں جو بہت تھوڑے پیسوں میں کالم لکھ دیتے ہیں یا مفت بھی عنایت کر دیتے ہیں مگر جو بڑے اخبارات ہیں، ان میں کالم نگار بننے کے لئے 80 فیصد کالم نگاروں کو کالم نگار ہونا پڑتا ہے۔

س: میں نے عطاء الحق قاسمی سے جب بھی سوال کیا تو انہوں نے کہا مجھے کالم نگاری میں پروفیسری کرنے سے زیادہ پیسہ ملتا ہے، لہٰذا اب مجھے پروفیسری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ج: مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اس نے تو ساری عمر پڑھایا ہے، وہ کالم نویس آج کا تو نہیں وہ جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو تب سے کالم نگاری کر رہا ہے۔ مگر اب جبکہ وہ ریٹائرمنٹ کے قریب ہے اس کے ایک یا دو سال رہتے تھے اس کے علاوہ تو اس نے کالم ہی لکھے۔

س: کہتے ہیں کہ آپ کی اور عطاء الحق قاسمی کی نواز شریف سے بڑی دوستی تھی، عطاء الحق قاسمی کو تو انہوں نے ناروے میں سفیر لگا دیا، آپ کو کیا انعام ملا؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ نواز شریف سے میری زندگی میں کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی، جس طرح میں آپ سے بات کر رہا ہوں اس طرح بھی کبھی اس سے میری بات تک نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ عطاء الحق قاسمی ان کے بہت زیادہ قریب تھا۔ اور انہیں بہت پسند تھا۔ آپ مجھے بتائیں کہ یہ جو آپ کے جرنیل ہیں ان کی Qualifiecation کیا ہوتی ہے۔ مگر ہر چوتھا جرنیل سفیر بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک پڑھا لکھا شخص سفیر بن گیا تو اس میں اعتراض والی کون سی بات ہے، ہم سب اس بات پر جلے ہوئے بیٹھے ہیں کہ ہم میں سے ایک آدمی آگے کیوں نکل گیا؟

س: یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ قاسمی صاحب اور امجد اسلام امجد کی بہت سی عادات آپس میں ملتی ہیں مثلاً کالم لکھ کر اپنے مقاصد حاصل کرنا، بیرون ملک کسی کا مہمان بن کر مفادات حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ میرا انہیں

Marfat.com

آپ ہی کے قبیلے کے بعض لوگوں کی سوچ ہے؟

ج: اول تو ان لوگوں کا اعتراض اس قابل ہی نہیں کہ اس پر کچھ Comment کیا جائے۔ پہلی بات میں آپ کی درست کردوں کہ میرا اور عطاء الحق قاسمی کا کالم نگاری کا کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔ وہ پینتیس چھتیس سال کا مانا ہوا کالم نگار ہے۔ میں نے جو کالم نگاری شروع کی اس کی میری اپنی ایک وجہ تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر میں شاعری کرتا ہوں یا ڈرامہ لکھتا ہوں تو وہ آتے آتے چھ مہینے لگ جاتے ہیں۔ نظم بنتے بنتے ہی بنتی ہے۔ پھر نظم کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ مگر میرے دل و دماغ میں بہت ساری باتیں ہوتی تھیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کا اظہار کروں، چنانچہ میں نے جب کالم نگاری کی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے قارئین کا بھی ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا ہے۔ میں یہی سوچ کر اب بھی کالم لکھ رہا ہوں، باقی رہی بات مفادات والی تو سوال یہ ہے کہ کس قسم کے مفادات، ایک بات تو طے ہے کہ میں نے نوکریاں اپنے نیچرل گریڈ میں ہی کیں۔ اب پرابلم یہ ہے بھائی کہ باہر لوگ جو بلاتے ہیں وہ ادب کے بڑے نقاد نہیں ہوتے وہ صرف اپنے ملک میں مقبول لوگوں کو ہی آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ ہمیں باہر بلاتے ہیں، یہ سوال تو ان سے کیا جانا چاہیے، جن کو بلوایا جاتا ہے۔ ان سے آپ کیوں سوال کرتے ہیں کتنے لوگ ہیں جو باہر گئے مگر ان کو تو دوبارہ کوئی نہیں بلاتا وہ باہر جا کر شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والوں کو ان کی توقعات کے مطابق متاثر نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ معاف کرے باہر ہمارے مفادات کیا ہیں، اس وقت آپ پاکستان میں رہ کر جتنا ایک مہینے میں کما کر سکتے ہیں اگر آپ وہ مہینہ پورے کا پورا امریکہ میں گزاریں تو آپ کو اس سے آدھے پیسے بھی نہیں ملیں گے، وہاں ایک مشاعرے کا زیادہ سے زیادہ دو سو ڈالر ملتا ہے، ان کی خاطر آپ کو کتنا سفر کرنا پڑتا ہے۔ دو دو راتیں جاگنا پڑتا ہے، مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ باہر کیسے مفادات ہیں؟

س: ''بے نیازیاں'' والے آپ کے بڑے مخالف ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ ''ڈیفنس'' میں رہنے والے Defencive ادیب ہیں، یہ پاکستان نہیں صرف اپنا ڈیفنس کرتے ہیں، میں ابھی تک ''سرکاری کوارٹر'' میں بیٹھا ہوں جبکہ انہوں نے اتنے بڑے بنگلے کیسے بنا لئے؟

ج: بات یہ ہے کہ جو لوگ محنت نہیں کر سکتے، جن کے پاس ٹیلنٹ نہیں ہے وہ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں، میں اب اس فضول آدمی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا مگر بات یہ ہے کہ جہاں وہ بک سکتا ہے وہاں تو وہ چونی میں بکتا ہے، کیا بات کرتے ہیں آپ؟ اگر اس کے پاس ہنر نہیں ہے اگر کوئی اس کی کتاب نہیں پڑھتا، شعر نہیں سنتا یا اس سے ڈرامہ نہیں لکھواتا تو کیا میں اس کا ذمہ دار ہوں؟ ندیم صاحب! بات یہ ہوتی ہے کہ آپ کوئی ایسا کام کر

Marfat.com

رہے ہوں جو آپ کی دسترس میں ہے وہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہاں کچھ بات بھی ہے۔ یہ بڑی گھٹیا بات لگتی ہے کہ انسان اپنے بارے میں کچھ کہے مگر جو ڈرامہ میں نے لکھا، کیا اس ڈرامے کی ڈیمانڈ اس ملک میں نہیں ہے؟ کیا لوگ وہی ڈرامہ نہیں دیکھنا چاہتے؟ اگر ٹی وی والے مجھ سے ڈرامہ لکھواتے ہیں تو کیا وہ میرے باپ پر احسان کرتے ہیں؟ ان کی ضرورت ہے مجھ سے لکھوانا، ان کی افسروں سے بڑی دوستیاں ہیں، ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مترادف ہے، بھئی اگر آپ لوگوں میں کوئی ہنر ہے تو بجائے اس کے آپ دوسروں پر نظر رکھیں آپ اپنے لئے جدوجہد کریں، بہرکیف وہ اچھے پڑھے لکھے معقول آدمی ہیں، پتہ نہیں ان کی کیا پرابلم ہے البتہ وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں، میں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ میرا اس کے ساتھ بڑا اچھا زمانہ گزرا ہے۔

س: آپ نے فرمایا آپ کی ریٹائرمنٹ ہونے والی ہے، اب مستقبل میں آپ کے کیا عزائم ہیں؟

ج: بات یہ ہے کہ چلڈرن کمپلیکس میں بطور پراجیکٹ ڈائریکٹر کام کر رہا ہوں، انہوں نے مزید دو سال توسیع دینے کی آفر کی۔ اس کا نوٹیفیکیشن بھی ہو چکا ہے، مگر میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ نوکری جاری رکھوں یا اپنا کوئی کام کروں، اللہ کا کرم ہے میں بہت سارے کام کر سکتا ہوں، 65 فیصد میرا ارادہ ہے کہ شاید اپنا کوئی کام کروں۔

س: آپ نے جس دور میں ''وارث'' لکھا اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے کسی کو انکار نہیں مگر آج جبکہ کیبل آ گئی ہے اور لوگ سٹار پلس کے ڈراموں کے شیدائی ہیں، کیا آپ کوئی وارث جیسا ڈرامہ لکھ کر سٹار پلس کے ڈراموں کی ہوا نکال سکتے ہیں؟

ج: بات یہ ہے کہ سٹار پلس کو تو ڈرامہ آتا ہی نہیں ہے، آدمی مقابلہ تو ڈرامے کا ڈرامے سے کرے، وہ ڈرامے کا ایک ریٹرن سٹائل ہے۔ جس میں 25 منٹ کا ایک پلاٹ ہوتا ہے جو کہ سکرین پر آپ کی آنکھوں کو چکا چوند کر دے، انہوں نے جو چیز بنائی ہے وہ پانچ یا دس فی صد ان کی فلم ہے، جبکہ 90 فیصد تو فلموں میں ساری بکواس ہی ہوتی ہے۔ پی ٹی وی کا تو سٹار پلس سے مقابلہ ہو یہ موازنہ ہی غلط ہے، سٹار پلس کا مقابلہ کرنے کے لئے تو ''جیو'' چاہیے یا ''اے آر وائی'' سے کرنا چاہیے کیونکہ یہ چینل سٹار پلس کے قبیل ہیں۔ جہاں تک پی ٹی وی کا تعلق ہے تو میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ تقریباً 1990ء تک پی ٹی وی نے جو کام کر دکھایا وہ قابل تحسین ہے، مگر اس کے بعد پی ٹی وی کو جو آگے بڑھنا چاہیے تھا وہ ان سے نہیں ہو سکا، ہمارے ہاں بار بار حکومتیں بدل رہی ہیں پالیسیاں بدل رہی ہیں، پھر ہم زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چلے، ہم نے پرانی مشینری نہیں بدلی،

Marfat.com

ہمارے پاس نئے آئیڈیاز نہیں آئے، سٹار پلس کی چکا چوند سے تو ہم پیچھے ہیں لیکن اگر میرٹ کے حساب سے پوچھیں تو میں نہیں سمجھتا کہ پی ٹی وی کوئی اتنا پیچھے ہے۔

س: آپ اپنے بچوں کے باپ تو ہیں، دوست بھی ہیں؟

ج: میں اپنے بچوں کا بڑا اچھا دوست ہوں، مگر تھوڑا سا رعب تو ہونا چاہیے، باپ بیٹے میں ایسا پیار، محبت اور بے تکلفی ہونی چاہیے مگر ایک احترام اور ادب کا عنصر بھی ضروری ہے۔ میرے والد محمد اسلام آجکل میرے پاس ہی سکونت پذیر ہیں میں اگرچہ بڑھاپے میں داخل ہو چکا ہوں۔ مگر بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میں ان سے نہیں کر سکتا۔ والد صاحب جب تقریباً 64,65 برس کے تھے اور نانا، دادا بن چکے تھے ان کا بڑا بھائی ان سے ایک سال بڑا تھا، یہ چین سموکر تھے مگر اپنے ایک سال بڑے بھائی کے سامنے سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ دونوں نانا، دادا بنے تھے مگر وہ ایک کلچر تھا، ایک تہذیب تھی کہ بچوں سے پیار، محبت اور بے تکلفی ساری چیزیں ہونی چاہئیں مگر یہ جو یورپین کلچر ہے کہ آنکھ کی حیا ہی ختم ہو جائے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

س: آپ کے صاحبزادے کی شکل میں کیا مستقبل میں ہم ایک اور امجد اسلام امجد کو دیکھ سکتے ہیں؟

ج: یہ اتفاق ہے کہ میرا بیٹا بہت اچھی شاعری کر لیتا ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ پہلے وہ اپنی تعلیم مکمل کرے، مستقبل بنالے، تاہم میرا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا شاعر بن سکتا ہے۔

س: گھر کی ایڈمنسٹریشن آپ کے پاس ہے؟

ج: جی نہیں، بیگم صاحبہ کے پاس ہے۔

س: جیون ساتھی نے آپ کے ادبی مزاج اور ضرورت کے مطابق آپ کو ماحول دیا؟

ج: اللہ کا بہت شکر ہے کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی مسئلہ نہیں، ایک تو وہ میری فرسٹ کزن ہیں ویسے بھی یہ میری پسند کی شادی تھی۔

س: اسے لومیرج کہہ سکتے ہیں؟

ج: نہیں خاندان والوں میں لومیرج کیا ہونا ہوتی ہے؟

س: اگر آپ کے علم میں آئے کہ آپ کے بیٹے کا ایسا کوئی جذباتی معاملہ یا پسند ہے تو کیا آپ اسے اجازت دے دیں گے؟

ج: میں تھوڑا سا اس کا فیصلہ دیکھوں گا کیونکہ اس جذباتی عمر میں کوئی غلط فیصلہ بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا اس معاملے کو بطور باپ مجھے دیکھنا چاہیے۔

Marfat.com

س: آپ کے بہت سے پرستار اور چاہنے والے ہیں۔ آپ سے اگر آپ کی آئیڈیل شخصیت کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

ج: میں چونکہ خود بہت سارے حصوں میں بٹا ہوا ہوں۔ لہٰذا ہر جگہ اور ہر حصے میں میرے اپنے آئیڈیل ہیں، ممکن ہے شاعری میں کوئی اور کالم نگاری میں کوئی اور ڈرامے میں کوئی اور ہو اور سیاست اور مذہب میں کوئی اور ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اتنی بڑی دنیا بنائی ہے، اس میں بہت سارے بندے ہیں جو آپ کے آئیڈیل ہو سکتے ہیں۔

س: آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی ہو؟

ج: غالب نے کہا تھا کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

خواہشات تو آتی جاتی رہتی ہیں، انسان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اگر انسان یہ سمجھے کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی چالاکیوں سے بنایا ہے، اگر چالاکیوں سے بن سکتا تو آج بہت سارے لوگ کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوتے۔

س: آپ اپنے کام اور جدوجہد کے اعتبار سے آج بھی ماشاءاللہ جوان ہیں، آپ کی کوئی نواسی یا نواسہ جب آپ کو نانا ابو کہتا ہے تو کیا بڑھاپے کا احساس نہیں ہوتا؟

ج: ایسی کوئی بات نہیں جب میں نے 60 برس میں اپنا کالم لکھا تھا تو لوگوں نے کہا کیوں اعتراف کیا، میں نے کہا جب ہو گیا ہوں تو اس سے مجھے چھپانے والی کون سی بات ہے۔ لہٰذا دنیا میں آپ کی نواسی یا نواسہ جب آپ کو Touch کرتا ہے یا آپ کا نام لیتا ہے، نانا کہتا ہے تو اس سے زیادہ خوبصورت زندگی میں اور کوئی تجربہ ہی نہیں۔

س: ریٹائرمنٹ کے بعد کیا آدمی ذہنی طور پر خود کو بے کار تصور کرنے لگتا ہے؟

ج: دیکھئے جو آدمی صرف اپنی تنخواہ پر بیٹھا ہوتا ہے، اس آدمی کے لئے ریٹائرمنٹ واقعی بڑی خوفناک بات ہوتی ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی میں لائف سٹائل Maintain کر سکتا ہوں۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

ڈاکٹر اجمل نیازی

Marfat.com

Marfat.com

اب ادب کا زمانہ نہیں رہا

ڈاکٹر اجمل نیازی

ڈاکٹر اجمل نیازی بیک وقت استاد، ادیب، شاعر، کمپیئر اور دانشور ہیں جبکہ سچ کو سچ کہنے کے عادی ہیں ،اس لئے ان کے دشمنوں کی تعداد ان کے دوستوں سے زیادہ ہے، جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بطور کالم نگار انہوں نے ایک کالم ایسا بھی لکھ ڈالا کہ ان کی نوکری خطرے میں پڑ گئی حتیٰ کہ انہیں معطل کر دیا گیا مگر اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے حق سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا، ڈاکٹر صاحب سے ہماری ایک طویل نشست ہوئی جس میں انہوں نے علم، ادب، شاعری اور سماجی وسیاسی رویوں کے بارے میں بہت اہم گفتگو کی جو نذرِ قارئین ہے:

س: ڈاکٹر صاحب وہ کیا قصہ تھا کہ ایک بار کوئی کالم لکھنے پر نہ صرف آپ کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی بلکہ اس معاملے میں بڑی بڑی انکوائریاں بھی بٹھادی گئی تھیں۔

ج: میں نے ایک کالم حکومت کے خلاف لکھا تھا جس کی پاداش میں میرے خلاف یہ ساری کارروائی ہوئی، حکومت کا خیال تھا کہ یہ معافی نامہ لکھے گا، میں نے لکھا تھا کہ ایک آدمی تیس برس سرکاری نوکری کرے اور 30 سال بعد اس کی تنخواہ 20 ہزار روپے بھی نہ ہو تو پوچھا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو آپ نے کیا دیا۔ ہم نے تو کتابیں لکھی ہیں، کالم لکھے ہیں مگر تم نے کیا کیا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ اگر میں ملازم ہوں تو ملازم بے نظیر بھی

Marfat.com

ہے، مشرف بھی ہے اور خالد مقبول بھی ملازم ہے میں تو حکومت پاکستان کا ملازم ہوں، بہر کیف میرے کیس کی 30 دن تک انکوائری ہوتی رہی۔ میں نے کہا تم نے میرا جو بگاڑنا ہے بگاڑ لو۔ میں آپ کی انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش نہیں ہوں گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیصلہ آخر کار میرے حق میں ہوا۔

س: آپ کا جو خاص پہناوا یا رکھ رکھاؤ ہے کیا اس کے پیچھے کوئی خاص کہانی ہے یا شوقیہ اس قسم کا صوفیانہ سٹائل اپنا رکھا ہے؟

ج: گزارش ہے کہ میں صوفی تو ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ کوئی بھی آدمی جو شاعر ادیب ہے، وہ اگر صوفی نہیں ہے تو سچا نہیں ہے، آدمی کچھ نہ کچھ صوفی ضرور ہوتا ہے خواہ تصوف کا ذوق ہی کیوں نہ ہو، اس کے بغیر تو بات نہیں بنتی، باقی دوسروں سے مختلف نظر آنے میں بھی ایک منطق ہے کہ دوسروں سے ہٹ کر کوئی بات ہو، میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ جو کام میں نے کیا ہے یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ داڑھی رکھنا، پگڑی پہننا یا اپنی شکل خاص بنانا کوئی آسان نہیں ہے۔ آجکل تو بڑی بڑی محفلوں میں اس حلیے کا واحد ایک میں ہوتا ہوں لیکن میرے لئے یہ افتخار ہے اور یہ میرے قبیلے کی پہچان بھی ہے۔ میرا تعلق نیازی قبیلے سے ہے، عبدالستار خان نیازی بھی پگڑی پہنا کرتے تھے، میں نے عمر بھر اپنے ابا کو بغیر پگڑی کے نہیں دیکھا۔ ہمارے زمانے میں جب ہم چھوٹے تھے اس وقت جس طرح عورتیں چادروں کے بغیر گھروں سے باہر نہیں آیا کرتی تھیں، اسی طرح کوئی آدمی پگڑی کے بغیر باہر نہیں آیا کرتا تھا۔ یہ بات شروع سے ہی میرے ذہن میں تھی چنانچہ جب کوئی ایسا موقع آیا تو میں نے بھی یہ انداز اپنانا نہ صرف شروع کر دیا بلکہ اس میں استقامت بھی رکھی اور اب میں جب گھر سے نکلتا ہوں تو میرا یہی پہناوا ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے کوئی کہانی نہیں ہے۔

س: آپ کا تعلق بنیادی طور پر تعلیم کے شعبہ سے ہے جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا تیس برس سے آپ درس و تدریس سے وابستہ ہیں جب اس ملک میں ایک یونیورسٹی تھی تو اس یونیورسٹی نے ہمیں ایسی ایسی نامور اور تاریخی شخصیات دیں جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں، آج پاکستان 74 یونیورسٹیز ہیں مگر تعلیم کا معیار بلند ہونے کی بجائے پہلے سے بھی زیادہ پست ہو گیا ہے۔ میں نے ماہر تعلیم ڈاکٹر وحید قریشی سے جب یہ سوال کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ آج کے استاد کی قیمت 10 اور 15 روپے ہے جو وہ خلاصے اور گائیڈ کی صورت میں بکتا ہے؟

ج: ندیم بھائی! یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کی، میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف تعلیمی زوال نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر زوال ہے جس نے ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، گویا زندگی ایک شرمندگی بن چکی ہے۔ اب کسی چیز کا کوئی معیار یا وقار نہیں رہا حتیٰ کہ کوئی اعتبار نہیں ہے آپ نے جو بات فرمائی میں اس میں

Marfat.com

اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جتنے بڑے لوگ تھے وہ قیام پاکستان سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والوں میں سے آپ کوئی ایک بھی نام نہیں لے سکتے۔ یعنی علامہ اقبالؒ سے لے کر فیض احمد فیض تک بلکہ اس سے بھی تھوڑا آگے جائیں تو پطرس بخاری ہیں ڈاکٹر نذیر احمد ہے اور جیسا کہ آپ نے ڈاکٹر وحید قریشی کا نام لیا، یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے کے لوگ ہیں، اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ مغربی نظام تعلیم کو فروغ دیتے ہیں بھئی مغربی نظام تعلیم نے تو سرسید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور مولانا شبلی نعمانی جیسے لوگ دیئے مگر ہمارا نظام تعلیم مغربی نہیں ہے۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مغربی نظام تعلیم نہیں ہے تو پھر کیا ہے یہ؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نظام نہیں ہے بلکہ بدنظمی کا بہت بڑا نمونہ ہے جس میں سے کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ تاہم قیام پاکستان کے آغاز سے کچھ ایسے لوگ ضرور نام والے بن گئے جو محنت کرنے والے تھے، جن کے ذہن میں کمرشل ضمیر نہیں تھا جو زندگی کو کاروبار نہیں سمجھتے تھے۔ جو مقصد حیات رکھتے تھے، جو یہ جانتے تھے کہ کار کا، پیجارو کا یا بڑی کوٹھی کا ہونا کوئی شان والی بات نہیں ہے مگر اب تو بڑا آدمی وہ ہے جس کے پاس پیسے ہیں، جس کے نوکر چاکر ہیں اور جو وزیر یا سیاستدان بن گیا ہے۔ اب تو بڑائی اور عظمت کا معیار ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹٹ پونجیوں کا دور ہے اس میں انسانوں کا قحط الرجال ہے، لہٰذا مجھے نہیں لگتا کہ اس صورتحال میں کوئی بڑا آدمی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ واقعی بڑی زیادتی کی بات ہے اس وقت ہمارے سامنے کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے جس کو ہم مثال کے طور پر پیش کر سکیں۔ ابھی آپ نے ملک معراج خالد کا نام لیا تو یہ بھی پہلے کا آدمی ہے۔

اُپل صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو آپ نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا، اس کے باوجود اگر آپ خود ستائی پسند ہیں تو ہم لوگ چونکہ غریب تھے، ہم لوگوں نے زیرو سے شروع کیا تو کچھ نہ کچھ ہم نے پروڈیوس کرنے کی کوشش کی مگر اب جو لوگ ہمارے بعد آئے ہیں جو کمپیوٹروں کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں ہے، جیسا کہ علم کے بارے میں بلھے شاہؒ نے کہا

علموں بس کریں او یار
تجھے ایک ہی الف درکار

مگر اسے تو پتہ ہی نہیں کہ الف کیا ہے، علم تو ایک راز ہے اور راز کسی کسی آدمی کے پاس ہوتا ہے۔

س: اب تو یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ ہمارا جو تعلیمی نصاب مرتب کرنے والے ہیں ان کی تو پاکستان سے وفاداریاں مشکوک ہیں، مثلاً ایک نصابی کتاب میں یہاں تک لکھا گیا کہ جس طرح پاکستان میں کرپشن لوٹ

Marfat.com

مار اور برائیاں ہیں اگر پاکستان نہ ہی بنتا تو اچھا تھا۔ اب خالی یہ جملہ کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو اچھا ہوتا۔ کس قدر خطرناک ہے اور یہ پاکستانی بچوں کے ذہنوں پر کتنے برے اثرات مرتب کرسکتا تھا؟

ج: ویسے ندیم صاحب! میں آپ سے عرض کروں گا کہ آخر اس جملے میں کیا قباحت ہے کہ اس وقت جو پاکستان ہے آخر یہ کس کا پاکستان ہے، یہ میرا پاکستان ہے نہ ندیم کا پاکستان ہے۔ یہ پاکستان تو حکمرانوں کا ہے۔ صرف چند لوگ ہیں جو 2 فیصد بھی نہیں ہیں، وہ اس ملک کو کھا رہے ہیں، اس ملک کو لوٹ رہے ہیں، یعنی آپ دیکھیں کہ اس ملک کا جو 95 فیصد بجٹ ہے وہ 5 فیصد پر خرچ ہوتا ہے اور جو 5 فیصد کا بجٹ ہے وہ 95 فیصد پر ان کی اجازت سے خرچ ہوتا ہے۔ پھر تو یہ نمبر 2 شہری ہیں جنہیں صاف پانی ملتا ہے، روٹی ملتی ہے اور نہ ہی مکان ملتا ہے۔ اب یہ کیا کہیں کہ پاکستان صحیح بنا تھا۔ یہ پاکستان ان غریب عوام کے لئے بنا تھا، ان معنوں میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان نہ ہی بنتا تو اچھا تھا۔ اب تو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے بارے میں بہت سے لوگوں کی باتیں بدل چکی ہیں اور اگر یہی صورت حال رہی تو لوگ اس ملک کے بارے میں ایسی باتیں سرعام کرنا شروع کردیں گے، یہ کس کی زمین ہے، کس کا زمانہ ہے اور اس ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے، یہ پاکستان جب بن رہا تھا تو مولانا ابوالخیر مودودی جو مولانا مودودیؒ کے بھائی تھے اور حقیقی دانشور تھے، انہوں نے کہا تھا کہ دو چیزیں اس ملک کو تباہ کردیں گی، ایک مولوی کی سیاست اور دوسرا ایک Easy Money۔ ایک تو مولویوں نے یہاں شیعہ، سنی، بریلوی اور نہ جانے کیا کچھ کردیا اور ایک وہ دولت ہے جو آسانی سے مل جاتی ہے اسے کرپشن اور بلیک منی ہی کہا جا سکتا ہے، جس نے ہمارے پورے معاشرے کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ آپ لوگوں نے پاکستان تو بنالیا اب ہوگا یہ کہ پاکستان میں اسلام نہیں رہے گا اور ہندوستان میں مسلمان نہیں رہیں گے۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ پاکستان میں کہاں ہے اسلام صرف اسلام کا نام ہے اور ہندوستان میں مسلمان نہیں ہیں۔ میں جب ہندوستان گیا تھا تو وہاں میں نے ایک ہندو سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے تو اس مجھے جواب دیا کہ محمد رام، یہ جو محمد رام ہے وہ نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں مسلمان ختم ہو گئے ہیں اور پاکستان میں اسلام ختم ہو گیا ہے۔

س: نیازی صاحب ہمارا موضوع شعر و ادب ہے عصر حاضر کے دانشور ہیں اور موجودہ ماحول ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اس ماحول میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے یا جو لکھا جا رہا ہے یا جو لوگ یہ سب لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں سے یا ان کے لکھے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں۔ آج کے ادب کو آپ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟

Marfat.com

ج: میری رائے تو بہت مختلف ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ اب ادب کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ ادب کا زمانہ ختم ہو گیا ہے یہ زمانہ ہے گیتوں کا یہ زمانہ ہے ناچوں کا یہ زمانہ ہے فیشن اور شو بز کا اب ادب کہاں ہے۔ آپ کسی لڑکے سے پوچھیں کہ سعادت حسن منٹو کون تھا۔ اس سے پوچھا جائے وہ بانو قدسیہ کے کسی افسانے کا نام بتائے۔ کیا وہ بتا سکے گا؟ اب تو یہ زمانہ ہے کالم نگاری کا۔

پہلے جتنے ادیب تھے اب وہ کالم نگار بن گئے ہیں اس طرح ایک کتاب جو شاعری کی ہے۔ تو یہاں معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ شاعر تو برساتی مینڈکوں سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ ایک ایک محلے میں دس دس شاعر نکلتے ہیں۔ ہر مہینے شاعری کی چار کتابیں آجاتی ہیں، دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ شاعری کی ایک کتاب جو پانچ سو چھپتی ہے وہ سال پڑی رہتی ہے مگر اسے کوئی پڑھنے والا نہیں ہوتا۔ کالم کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک اخبار ایک لاکھ سے زیادہ شائع ہوتا ہے۔ آپ کالم کے ذریعے لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے مسائل سے روشناس کرتے ہیں۔

س: کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب کالم نویسی میں تبدیل ہو گیا ہے؟

ج: دراصل ادب کو لوگوں نے اب کاروبار کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، ادبی ایوارڈ جاری کر دیئے گئے ہیں مگر ہر ایوارڈ متنازعہ قرار دیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے ادبی مافیا بنا لیا، ادبی قبضہ گروپ بن گئے کہ فلاں کتاب پر بھی انعام ملے، فلاں کتاب پر بھی ایوارڈ ملے، باہر کے سفر بھی میں ہی کروں، مشاعرے بھی میں ہی پڑھوں، لہٰذا وہ لوگ جو اصل لوگ تھے وہ بیچارے اداس ہو کر بیٹھ گئے کیونکہ وہ اس راستے پر نہیں چلتے جس پر یہ ادبی مافیا چل رہا ہے تو وہ اپنے مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔

س: ایک زمانے میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اور یجنل شاعروں کے مشاعروں کی روایت تھی۔ موسم بہار کی آمد پر پارکوں اور تاریخی عمارات میں مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر اب تو یہ روایات ہی ختم ہو گئی ہیں، میڈیا نے تو مشاعروں کی روایت کو ہی ختم کر دیا ہے ؟

ج: اب مشاعرے کیا ہیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ شاعری ایک کاروبار بن گیا ہے، اس سے اچھا ہوتا ہے کہ آپ مجرا کروالیں۔ اب دیکھئے ایک شاعر اور ایک رقاصہ ہے ریما، ان دونوں میں کیا فرق ہے، لفافہ شاعر کو بھی ملتا ہے لفافہ ریما کو بھی ملتا ہے۔ ان لوگوں نے تو مشاعرے کی روایت کو ہی برباد کر دیا ہے۔ اب آپ بتائیں کہ امریکہ میں جو مشاعرے ہوتے ہیں وہ Preplaned ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ مشاعرہ ہو گا اور وہاں سے اتنے روپے کمائے جائیں گے اور اس میں سے اتنے روپے شاعر کو ملیں گے۔ اب شاعر ہے کہاں ٹیلی ویژن پر

Marfat.com

پچھلے 20 برس سے وہی چند مخصوص چہرے نظر آ رہے ہیں۔ وہی احمد ندیم قاسمی، وہی خالد احمد اور وہی امجد اسلام امجد صاحب، وہی نجیب احمد اور وہی یاسمین احمد۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ کسی نئے آدمی کو تو آنے ہی نہیں دیتے۔ میں نے ایک تجویز دی تھی کہ ایک مشاعرہ کروائیں، اس میں ایسے شاعر شامل کئے جائیں جو پہلے ایک بار بھی کسی مشاعرے میں نہ آئے ہوں۔ میں ایک اور بات بتاؤں دور آباد بستیوں میں، دور کے گاؤں میں بہت اچھے اچھے شاعر ہیں، مجید امجد نے ساہیوال میں ایک کمرے میں زندگی گزار دی اور ایک کمرے میں پوری کائنات اس کے سامنے تھے۔ وہ مجید امجد تو ایک کمرے میں مرگیا تو پھر یہ کون ہیں جنہوں نے ڈیفنس میں محل بنا لئے، یعنی جس ملک میں ادب کے نام پر سارے لوٹ مار کے ادارے ہوں تو وہاں آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

ہمارے ہاں علمی ادارے نہیں ہیں بلکہ یہ لاعلمی ادارے ہیں یہ لاکھوں روپے کی گرانٹ کھا جاتے ہیں، صرف یہ جو ڈی جی صاحبان ہیں ان پر جو خرچ ہوتا ہے وہ ایک طرف اور جو پورے ادارے پر خرچ ہوتا ہے وہ ایک طرف، یہ تو ساری Obliging پوسٹس ہیں جو چند لوگوں کو خوش کرنے کے لئے نکالی جاتی ہیں، کسی کو سیف بورڈ کا ممبر بنا دیا کسی کو اقبال اکیڈیمی کا ڈی جی بنا دیا تو کسی کو چلڈرن کمپلیکس کا بنا دیا یا کسی کو تحریک پاکستان کا بڑا لگا دیا، لہٰذا یہ معاشرہ تو بالکل کرپٹ ہو چکا ہے۔

س: آپ نے ادب اور ادیب کے بارے میں جتنی مایوس کن صورتحال بیان کی ہے تو کیا اس کے بعد عوام کو مایوس ہو جانا چاہیے؟

ج: ندیم صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ میں مایوس آدمی نہیں ہوں، میں Depress ہوں، میں امید کا دامن تو بالکل نہیں چھوڑ سکتا مگر آپ مجھے بتائیں ناں کہ کوئی امید کی بات ہے، کوئی روشنی کی کرن اس معاشرے میں ہے، اس معاشرے میں جو ظلم ہو رہا ہے، جو قانون کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، جو امیر و غریب کی تقسیم سے جو فرقہ واریت ہے جو معاشی فرقہ واریت ہے۔

س: آج کا طالب علم اس قدر ناراض اور ٹینس ہے کہ اس کے اس رویے سے پورا معاشرہ ڈسٹرب ہو گیا ہے، وہ اگلا پہیہ اٹھا کر مال پر چلتا ہے، اس قسم کی حرکتوں سے موت کو بھی گلے لگا لیتا ہے مگر اس کے باوجود اس میں مثبت تبدیلی دیکھنے میں نہیں آتی، آپ کے نزدیک نوجوانوں کا مسئلہ کیا ہے، وہ چاہتے کیا ہیں؟

ج: میرے خیال میں تو نوجوانوں کا کوئی مستقبل ہی نہیں ہے، جب میں نے ایم۔اے کیا تھا اور میری جوانی کا عالم تھا، میرے سامنے زندگی تھی، میرے سامنے ایک میدان تھا اور میں چل سکتا تھا، مگر ان بیچاروں کے سامنے کیا ہے' ان کے پاس تو سوائے فرسٹریشن کے کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی تو یہ نوجوان اس قوم کے ساتھ کچھ بھی

Marfat.com

نہیں کر رہے اور جو یہ کرنے والے ہیں وہ الامان الحفیظ ،قوم کو پتہ چل جائے گا کہ اس کا مستقبل کیا ہے، میں معافی چاہتا ہوں کہ جس قوم کے نوجوانوں کو روٹی ملی نہ ان کو ریلیکس اور آزادی ملی، ان کو جب کچھ بھی نہیں ملے گا تو کیا وہ زندگی کو آگ لگائیں گے، وہ زندگی کو کہاں لے کر جائیں، اس طرح تو وہ زندگی کا کتھارسس کرتے ہیں وہ اس طرح کی حرکات کر کے اپنی Satisfaction کرتے ہیں، میں اس طرح کی حرکتیں اسی لئے نہیں کرتا تھا کہ میرے کتھارسز کسی اور طرح کے تھے، بہرحال جب آپ ان نوجوانوں کو اچھی تفریح اچھا ماحول دیں گے ان کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھیں گے تو وہ بالکل ایسی حرکتیں نہیں کریں گے۔

س: لوگوں کا خیال ہے کہ آپ پر صوفی ازم کی کافی چھاپ ہے، آپ کے نزدیک صوفی کیا ہے ؟

ج: صوفی وہ ہے جو منع نہیں کرتا جو جمع نہیں کرتا، جو طمع نہیں کرتا، یہ تو منع کرنے والے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے پنجاب یونیورسٹی کو طلباء کی سیاست کا گڑھ بنا دیا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں پر لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے دیں جو کہ وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کو آپ سیاستدان بنا رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جب تعلیم کو سیاسی طور پر استعمال کریں گے پھر تو حالات ایسے ہی ہوں گے۔اگر آپ پنجاب یونیورسٹی میں ایک لڑکے کو ایک لڑکی سے مارنے سے روک دیتے ہیں تو بات ٹھیک ہے مگر باقی آپ کہاں کہاں روکیں گے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام صرف پنجاب یونیورسٹی میں نافذ کیا ہوا ہے۔

س: آپ کالم لکھتے ہیں، دیکھا یہ گیا ہے کہ کالم نگار بھی اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کے حاشیہ بردار بن کر رہ گئے ہیں، کوئی کسی کے نام کی ڈفلی بجا رہا ہے تو کوئی کسی اور کے نام کی مالا جاپ رہا ہے، ہر کالم سے مفادات کی بو آتی ہے، قومی مسائل کے حل کے لئے مثبت اور ٹھوس تجویز کہیں سے بھی نہیں آ رہی۔

ج: یہ تو سب دوکانداریاں لگی ہوئی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کالم نگاری ایک زمانے میں کالم نگاری ہوا کرتی تھی اور کالم نگار پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے دل کی گواہی سے لکھے مگر اب تو لوگوں نے اپنے آپ کو ہی بیچ ڈالا ہے، مثلاً سیاستدان کرپشن کرتا ہے تو پھر کالم نگار کیوں نہ کرے، جب سیاستدان کما رہا ہے تو کالم نگار اس کی تعریف کرے گا اور اس کے بدلے میں پیسہ مانگے گا، اب تو میڈیا کو خرید لیا گیا ہے، اس میں اب لفافہ ازم کی اصطلاح عام ہو چکی ہے، لہٰذا ان حالات میں آپ محض کالم نگاری ہی کی کیوں بات کرتے ہیں، آپ دیکھیں کہ اخباری مالکان ارب پتی بن چکے ہیں اور دوسرے لوگ بھی کروڑ پتی بن چکے ہیں، اب تو صحافت نہیں رہی بلکہ یہ سیاست کا ایک حصہ بن چکی ہے۔صحافت اور سیاست کی سرحدیں مل گئی ہیں اور وہاں پر ڈفلیاں بجانے والے کھڑے ہیں، ایک طرف سے سیاست کی ڈفلی بجتی ہے، دوسری طرف سے صحافت کا قلم بجتا ہے، مثلاً اخبار میں

Marfat.com

اگر ایک ہیڈ لائن لگ رہی ہے تو ڈی جی پی آر کا فون آ جاتا ہے کہ یہ اخبار میں نہیں لگ سکتی پھر اس کے بعد بات مان لی جاتی ہے، وہ صرف اسی لئے کہ وہاں سے اشتہار آتے ہیں۔ اب تو ندیم صاحب! سب کچھ کمرشل ہو چکا ہے۔ صحافت کاروبار بن چکا ہے۔

س: ایک تاثر یہ ہے کہ بعض کالم نگاروں کو کچھ اداروں یا ایجنسیوں نے خرید رکھا ہے، وہ پہلے بہت اچھا لکھتے تھے مگر اب ان کے کالموں میں ویسی بات نظر نہیں آتی ؟

ج: میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک عبدالقادر حسن، عطاء الحق قاسمی اور دیگر لوگ نوائے وقت میں تھے تو ان کی کالم نگاری عوامی سطح پر پڑھی جاتی تھی مگر جونہی یہ لوگ نوائے وقت سے گئے تو خالصتاً کمرشل ہو گئے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ہنر ہے اور اس ہنر کو اگر آپ بیچ دیتے ہیں تو پھر اس کی کیا وقعت رہے گی۔ ہنر تو تب تک ہے جب تک آپ کے پاس ہے مگر جب آپ نے اسے فروخت کر دیا تو پھر معاملہ ختم ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔ سب کچھ سارے فوائد اخباری مالکان کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ٹھیک ٹھیک یا سچائی پر کالم لکھتا ہوں مگر میرا مالک اسے چھاپنے کی اجازت نہیں دیتا تو میں کیا کرلوں گا۔ جہاں تک میری ذات کا معاملہ ہے تو میں نے کئی بار کالم لکھنا بند بھی کر دیا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اگر آپ نہیں چھاپتے تو میں نہیں لکھتا، اگر آپ میرا کالم چھاپیں گے تو پھر وہ کالم چھاپیں گے جو میں لکھتا ہوں۔

س: آپ نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں، ''جنگ اور محبت'' شائد آپ کے کالموں کی کتاب بھی مارکیٹ میں آ چکی ہے ؟

ج: جی ہاں ''جنگ اور محبت'' میرے کالموں کا مجموعہ ہے۔ فنون نمبر میں بھی میرا ایک سفرنامہ چھپا تھا۔ بہت سے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوئے۔

س: آپ کے خیال میں اپنے کام کے حوالے سے کوئی ادیب یا شاعر سب سے بڑا ہے؟

ج: دراصل یہ بڑا مشکل سوال ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کوئی اچھا شاعر یا ادیب ہے، مثلاً ایک خاتون ہیں بانو قدسیہ، وہ بہت اچھی خاتون ہیں، بہت اچھا لکھتی ہیں، خیالات اور الفاظ پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ مرد ادیبوں میں مستنصر حسین تارڑ مجھے بہت پسند ہیں، ان کے سفرنامے کمال کے ہیں، شاعروں میں منیر نیازی میرے قبیلے کے ہیں، وہ بہت اچھے شاعر ہیں، اگرچہ میں انہیں ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا مگر شاعری میں اپنے فن میں یکتا ہیں۔

س: آخر میں سوال یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے بہت سے چاہنے والے بلکہ پرستار ہیں، آپ کس کو چاہتے ہیں، آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

Marfat.com

ج: آپ نے پھر ایک مشکل بات کر دی، جہاں تک میری پسند کے آدمی کا تعلق ہے تو میں اس کا نام نہیں لے سکتا تاہم میں بہت سے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، مثلاً علامہ اقبال کو میں بڑا شاعر تو مانتا ہوں مگر میں ان کا فین نہیں ہوں، اگر آپ پسند کی بات کریں تو مجھے بھٹو صاحب پسند ہیں، میں نے انہیں سیاسی اعتبار سے اور ذہانت کے اعتبار سے بہت اچھا پایا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اگر بھٹو صاحب کو پھانسی پر نہ لگایا جاتا تو آج پاکستان یہ نہ ہوتا جو اس وقت ہے۔ ان کے دور میں ایٹمی پلانٹ پاکستان آیا۔ انہوں نے پاکستان میں اسلامی کانفرنس منعقد کروائی، اسلامی بینک کا قیام ان کے دورِ حکومت میں وجود میں آیا۔ جو خوبیاں اور صلاحتیں بھٹو صاحب میں تھیں وہ کسی دوسرے میں نہیں تھیں اور ان لوگوں نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے اور میں اکثر بھٹو صاحب کو یاد کرتا ہوں، مجھے بھٹو سے اس قدر محبت ہے کہ میں ان کی بیٹی سے بھی پیار کرتا ہوں۔ بے نظیر مجھے محض اس حوالے سے اچھی لگتی ہے کہ وہ بھٹو کی بیٹی ہے۔ بھٹو صاحب نے بھی بے نظیر کے اوپر اعتماد کیا تھا، بے نظیر بھٹو سے میری یہ بھی درخواست ہے کہ ان کے والد کے جو جانثار لوگ ہیں، جو غریب لوگ ہیں وہ ان کے اعتماد پر پورا اتریں، میں نے اس پر ایک کالم بھی لکھا تھا، کہ ''بی بی! تم آ ؤ اپنے وطن میں، نئے سرے سے آ ؤ اور نئے زمانے کی بنیاد رکھو''۔

دیکھو ناں ندیم اُپل! اس ملک کے جو غریب ہیں ان کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ ان کا اس ملک پر کوئی حق نہیں ہے آخر وہ بھی انسان ہیں، اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں، یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے، میں سمجھتا ہوں کہ ان غریبوں کو آپ کی شاعری بہلا سکتی ہے نہ آپ کے کالم ان کا مقدر سنوار سکتے ہیں کیونکہ وہ تو اخبار بھی نہیں پڑھتے، مگر بھٹو نے غریب لوگوں کو ان کے ہونے کا احساس دلایا، مثلاً ایک لفظ ہے: بھٹو ازم ...... لہٰذا بھٹو ازم تو بھٹو کے نام سے ہی چلتا ہے، ہم کبھی اقبال ازم یا مودودی ازم نہیں کہتے، میرے خیال میں تو بھٹو کے بغیر پاکستان کی سیاسی تاریخ نامکمل رہتی ہے، قائداعظمؒ کے بعد ایک شخص تھا جس نے اس ملک کے عوام کے دلوں میں گھر کیا اور وہ ذوالفقار علی بھٹو تھا جیسا کہ فیض احمد فیض نے کہا ہے کہ:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے

یا پھر بقول فیض صاحب:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

Marfat.com

میں تو سمجھتا ہوں کہ بھٹو نے اس قوم کی عزت رکھ لی، کیسنجر نے اس شہر لاہور میں تقریر کی تھی اور بھٹو صاحب نے ہنری کیسنجر کے سامنے کہا تھا کہ مسٹر سیکرٹری ہم نے سیاست اپنے شرارتی دریاؤں سے سیکھی ہے اور شرارتی دریاؤں سے سیاست سیکھنے والی بات پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ صدر نکسن نے بھٹو سے کہا تھا کہ تم اگر امریکہ میں ہوتے تو میرے وزیر خارجہ ہوتے، جس پر بھٹو صاحب نے برملا کہا نو......نو ...... میں وہاں ہوتا جہاں تم ہو۔ افضل رندھاوا صاحب ہمارے ایک شاعر ہیں، انہوں نے ایک شعر کہا اور مجھے انہوں نے بتایا کہ یہ شعر انہوں نے بھٹو صاحب پر لکھا تھا۔ کیونکہ بھٹو صاحب جتنے بڑے آدمی تھے اتنی بڑی انہیں قوم نہیں ملی، قوم نے اس آدمی کو پہچانا نہیں اور وہ بھی بیچارہ گھل گھل کر چلا گیا، کیونکہ بھٹو جو کچھ کرنا چاہتا تھا وہ میدان اسے نہیں ملا، بہر حال رندھاوا صاحب کا شعر کچھ یوں ہے :

میں دریاواں دا ہانی ساں
ترنے پے گئے کھال نی مائے

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اسی اعتبار سے بدقسمت ملک ہے کہ انہوں نے بھٹو صاحب جیسے ایک عظیم شخص کو ضائع کر دیا۔

س: آپ کی لکھی کتابوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے ؟

ج: میرا ایک سفرنامہ ہے ''مندر میں محراب'' ہلکے پھلکے مضامین ہیں، تخلیقی مضامین، ''تشخص اور تخلص'' میری ایک تحقیقی کتاب ہے جو میرے پیر جی کا مقالہ ہے۔ ایک میانوالی کا تذکرہ ہے ''بازگشت''۔ اسی طرح کالموں کی ایک کتاب ''بے نیازیاں'' جبکہ دوسری کتاب ''جنگ اور محبت'' ہے مگر اب میں جو کتاب لکھ رہا ہوں مجھے تو لگتا ہے کہ اس کتاب کے آنے کے بعد لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ میں نے اس میں ایک تو اپنے دل کی بات کی ہے، اس کتاب میں میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی، میں نے اس کتاب میں پچاس آدمیوں کے بارے میں لکھا ہے، ان کے میرٹ بھی ڈی میرٹ، ان کے بارے میں ہر طرح کے لطائف بھی۔ میں نے اس کتاب میں وہ باتیں بھی شامل کی ہیں جو آپ کسی نجی محفل میں صرف دوستوں کے ساتھ کر سکتے ہیں، جب ہم یہ باتیں کر سکتے ہیں تو لکھ کیوں نہیں سکتے۔

میرا ایک سیرت کی کتاب لکھنے کا بھی خیال ہے کیونکہ جتنی بڑی شخصیت اور ہستی سرکارِ دوعالم ﷺ کی تھی وہ جتنے بڑے انسان تھے وہ چیزیں بھی سامنے لائی جاتیں، ان بندوں نے پتہ نہیں مذہب کو کیا بنا دیا۔

☆......☆......☆......☆......☆

Marfat.com

خبر قبیلہ

عارف محمود اُبل

Marfat.com

Marfat.com

سیاحتی مقامات کے باسیوں کی حالتِ زار خوبصورت وادیوں پر بدنما دھبہ ہے

عارف محمود اُپل

کچھ لوگ اپنے نام سے اور کچھ کام سے پہچانے جاتے ہیں، عارف محمود اُپل بھی ایک ایسا ہی نام ہے، صحافتی برادری میں جو اپنے کام کی وجہ سے معروف ہے، پاکستان کے کسی بھی بڑے اخبار یا جریدے میں اگر آپ کو پاکستان کے سیاحتی مقامات سرسبز وادیوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے بارے میں کوئی مضمون نظر آئے تو سمجھ جایئے کہ عارف محمود اُپل نے لکھا ہے، یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے سیاحتی مقامات کو عارف محمود اُپل نے گذشتہ چوتھائی صدی کے طویل عرصہ میں جس طرح سے پروموٹ کیا، شاید ویسا کام ٹورزم کارپوریشن اور آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ نے بھی نہ کیا ہو۔

عارف محمود اُپل کا خاندانی پس منظر یہ ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے مذہبی گھرانے سے ہے جنہوں نے دین کی خدمت اور اسلام کی اشاعت میں تاریخ ساز رول ادا کیا، ان کے دادا محمد اسماعیل اُپل جامع حنفیہ قاسمیہ میں 40 برس تک خطابت اور امامت کے فرائض بلا معاوضہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے

Marfat.com

لئے انجام دیتے رہے۔ نارووال میں اٹھنے والی تمام مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں اپل خاندان کے بزرگوں کا ایک تاریخی اور جامع رول ہے۔ عارف محمود اُپل کے والد جناب رفیق اُپل نے علاقہ میں تعلیم کے فروغ اور ناخواندگی کے خاتمے کے لئے تاریخ ساز لیڈنگ رول ادا کیا، چونکہ مذہبی خاندان سے تعلق تھا، اس لئے آپ کے والد رفیق اُپل نے جماعت اسلامی میں شمولیت کر کے اپنی سیاسی، مذہبی اور ملی خدمات کا آغاز کیا اور اپنی دینی سرگرمیوں کی بدولت جماعت اسلامی ضلع نارووال کے امیر مقرر ہوئے، اس کے علاوہ جماعت اسلامی کی صوبائی شوریٰ کے بھی رکن رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی تمام کتب کا مطالعہ کر ڈالا۔ آپ کی سیاست سے ہٹ کر مولانا مودودیؒ سے اس قدر روحانی و قلبی وابستگی تھی کہ اپنی جیب سے مولانا کے لٹریچر کو لوگوں تک عام کیا کرتے تھے۔ رفیق اُپل کو مولانا مودودی کے زیر سرپرستی جماعت میں کام کرنے کا بھی موقع ملا۔

اس کے علاوہ بعد میں انہوں نے جماعت کے سابق امیر میاں طفیل محمد اور قاضی حسین احمد کی سیاسی رفاقت میں بھی خاصا وقت گزارا، آپ نے 1953ء میں شروع ہونے والی تحریک ختم نبوت میں بھرپور عملی حصہ لیا، اس کے علاوہ 1974ء میں تحریک ختم نبوت میں جو تاریخ ساز رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ علاوہ ازیں جناب رفیق اُپل نے 1977ء میں بھٹو کے خلاف چلنے والی تحریک نظام مصطفیٰ میں بھی قابل ذکر رول ادا کیا۔

جہاں تک جماعت سے جذباتی اور روحانی وابستگی کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ ذاتی مفاد پر جماعت کے کاموں کو ترجیح دیا کرتے تھے، ضلع بھر میں تعلیم کو عام کرنے میں ان کا نمایاں رول ہے، آج کے ایسے بے شمار ڈاکٹر، انجینئر اور فوجی افسران ہیں جنہیں ان کی تعلیم میں مالی سپورٹ دی اور جو اس وقت وطن عزیز کی خدمت کر رہے ہیں۔ ضلع میں رفیق اُپل کو قافلہ حریت کے نڈر سپاہی کا مقام حاصل ہے، جماعت کے علاوہ جو لوگ دین کی خدمت کرتے تھے، رفیق اُپل ان کی بھرپور مالی معاونت کرتے تھے، اور آج بھی وہ اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹاتے ہیں، پچھلے دنوں جب وہ علیل ہوئے تو جماعت اسلامی کے مرکزی اکابرین خود تشریف لا کر ان کی عیادت کی اور ان کی صحت یابی کے لئے دعا کرتے رہے۔ یہ انہی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آج رفیق اُپل بزرگی کے اس عالم میں بھی دین کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔

عارف محمود اُپل اسی ممتاز روحانی، مذہبی، سماجی اور فلاحی ہستی کے چشم و چراغ ہیں، جن کا ایمان ہے کہ سفر کرنا بھی ایک عبادت ہے اور اب تو سیاحت کو ہی انہوں نے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ان کا کہنا

Marfat.com

ہے کہ سفر بھی ایک عبادت ہے۔

عارف محمود اُپل کی یہ انفرادیت ہے کہ اس نے جب بھی قلم اٹھایا ہے پاکستان سے اپنی محبت، اس کے فطری حسن اور اس کے شاد و آباد سبزہ زاروں کی بات کی ہے۔ آج تک اس نے کسی شخصیت کو، کسی فرد کو یا کسی ادارے کو پروموٹ کرنے کے لئے کچھ نہیں لکھا بلکہ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ صحیح معنوں میں پاکستان کا سچا اور کھرا صحافی بیٹا ہے، جس کے الفاظ سے سوھنی دھرتی کی خوشبو آتی ہے، زیر نظر انٹرویو سے پہلے ان سے محض میری دو ایک اور وہ بھی مختصری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔

پہلا رابطہ انہوں نے خود مجھ سے ٹیلی فون پر کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ سیر و سیاحت کے بارے میں ان کے چند ایک مضامین نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں میرے یعنی ندیم اُپل کے نام سے شائع ہو گئے ہیں جبکہ یہ ان کے یعنی عارف محمود اُپل کے تحریر کردہ تھے۔

یہ دلچسپ حادثہ یا واقعہ کیسے رونما ہوا، ذرا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے، یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے بارے میں چار پانچ مضامین راقم کے نام شائع ہوئے، جو بعد میں ''پاک جمہوریت'' میں بھی لفٹ کئے گئے۔ اس امر کا انکشاف تب ہوا جب میرے کچھ اخباری دوستوں نے میرے ان آرٹیکلز کی تعریف کی اور کہا کہ ندیم اُپل صاحب آپ تو ماشاء اللہ سیر و سیاحت پر بھی بہت اچھے اور معلومات افزا مضامین لکھ لیتے ہیں، میں نے ان دوستوں کی تعریف و توصیف تو قبول کر لی مگر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ابھی باقی تھا کہ میرے نام سے یہ مضامین کس نے لکھے، آخر کافی عرصہ بعد جب ایک روز مجھے نوائے وقت سنڈے میگزین کے ایک دوست ملے تو انہوں نے باتوں باتوں میں انکشاف کیا کہ بطور انچارج یہ مضامین انہوں نے چھاپے تھے اور اس خیال سے میرے کھاتے میں ڈال دیئے تھے کہ یہ مضامین ندیم اُپل نے اپنے کسی بیٹے کے نام سے لکھے ہوں گے کیونکہ ندیم اُپل سنڈے میگزین میں بیک وقت ایک سے زیادہ بلکہ تین چار آرٹیکلز لکھتے ہیں، کسی مضمون پر ان کے بیٹے ثاقب ندیم اور کسی پر ان کی بیٹی ثنا ورندیم کا نام درج ہوتا ہے، اس لئے میں نے سمجھا ممکن ہے عارف محمود اُپل بھی ان کے بھائی وغیرہ ہوں، جن کے نام سے انہوں نے یہ مضامین بھجوائے تو کیوں نہ اس کو مضامین کے اصل خالق ندیم اُپل کے نام سے ہی شائع کیا جائے۔

یہ وضاحت میرے اس دوست نے کی تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور انہیں بتایا کہ بھئی عارف محمود اُپل کا نام تو میں خود پچھلے پندرہ بیس برس سے پڑھ رہا ہوں اگر انہوں نے اپنے مضامین کے ساتھ میرا

Marfat.com

نام دیکھا تو وہ کیا سوچیں گے۔ ''کوئی بات نہیں'' اس دوست نے کہا، جب عارف محمود اپل صاحب بات کریں گے تو انہیں مطمئن کر دیا جائے گا۔

عارف محمود اُپل کو میں نے کیسے مطمئن کیا، یہ ایک الگ داستان ہے جو پھر کسی وقت بیان کروں گا، فی الحال آپ کی ملاقات ''خبر قبیلہ'' کے آخری مہمان سے کرواتے ہیں۔

س: یوں تو عارف اُپل کی ذات اور شخصیت کے کئی حوالے ہیں، وہ بیک وقت ایک سیاح، کالم نگار، فیچر رائیٹر اور سماجی کارکن ہیں لیکن اگر آپ سے پوچھا جائے کہ عارف محمود اُپل کو اپنی شخصیت اور ذات کے کس حوالے پر زیادہ ناز ہے یا کس حوالے کو آپ اپنی مضبوط شناخت تصور کرتے ہیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟

ج: پہلے تو میں آپ کا شکر گزار ہوں اُپل صاحب! کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں بھی آپ کی نگاہِ انتخاب کا اعزاز حاصل کروں، آپ لاہور سے چل کر میرے پاس تشریف لائے اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنی کتاب ''خبر قبیلہ'' کے حوالے سے ''ذرہ سے آفتاب'' بنانے چلے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں قطعی اس لائق نہیں ہوں۔ جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ مجھے سیاحت کا غیر معمولی شوق کیوں ہوا؟ ویسے تو یہ ایک لمبی اور عجیب و غریب داستان ہے مگر مختصراً صرف اتنا عرض کروں گا کہ میرا یہ شوق کم و بیش ایک چوتھائی صدی پر محیط ہے۔ کوئی اپنی اولاد سے پیار کرتا ہے، کسی کو زر اور زن سے پیار ہوتا ہے، کسی کو اپنے پروفیشن سے جنون کی حد تک لگاؤ ہوتا ہے، کوئی مجنوں کی طرح تیشہ لے کر پہاڑوں سے دودھ کی نہریں نکالنے نکل پڑتا ہے۔ عاشق تو سبھی بنتے ہیں مگر میری نظر میں سچا عاشق وہ ہے جسے اپنے وطن اور اپنی دھرتی سے پیار ہے۔ مجھے فخر ہے کہ الحمدللہ میں وہ پاکستانی ہوں جس نے ماں کی گود میں آنکھ کھولی اور سوہنی دھرتی کی گود میں پل کر جوان ہوا۔ مجھے بچپن سے ہی بڑے بڑے سبزہ زاروں، کھیتوں، کھلیانوں، باغوں، بہتے ہوئے دریاؤں اور خوبصورت آبشاروں سے پیار تھا۔ مجھے یاد ہے سات برس کی عمر میں جب میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ دور دراز کے سفر پر گیا تو ٹرین کی کھڑکی سے باہر نظر آنے والے قدرت کے حسین نظاروں اور مناظر کو دیکھ کر میرے اندر اس جذبے نے انگڑائی لی کہ کاش مجھے اپنی سوہنی دھرتی کا چپہ چپہ دیکھنے کا موقع ملے، اس کی وادی وادی کے خوبصورت نظاروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھ کے کیمرے میں محفوظ کر سکوں۔ والد صاحب کے ساتھ بچپن کے اس پہلے سفر نے میرے دل میں سیر و سیاحت کی ایک ایسی لگن پیدا کی، میں نے تہیہ کر لیا ہے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بعد صرف اور صرف اپنی سوہنی دھرتی کا رانجھا بن کر جیوں گا۔ یہ میری عمر کا وہ حصہ تھا جب بچے کھلونوں کی نئے کپڑوں کی اور کھانے پینے کی چیزوں کی ضد کرتے ہیں مگر میری خواہش میری تمنا اور

Marfat.com

آرزو یہی تھی کہ میں پیارے وطن کی خوبصورتی کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھوں بلکہ دوسرے ہم وطنوں تک بھی الفاظ کی صورت میں ملک کے خوبصورت سیاحتی مقامات کا احوال پہنچاؤں۔

س: آپ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب آپ ابھی بچے تھے، اپنے طور پر شوق کی تکمیل کرنا یقیناً آپ کے اختیار سے باہر ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ کہ سیر و سیاحت دنیا کا سب سے مہنگا شوق ہے، ہر آدمی خواہش کے باوجود اس کی تکمیل نہیں کرسکتا پھر آپ اس میں کیسے کامیاب ہوئے؟

ج: آپ کے اس سوال کا جواب بقول شاعر اس طرح سے دے سکتا ہوں:

اے جذبہ دل گر تو چاہے ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور منزل سامنے آجائے

بات یہ ہے ندیم صاحب ! انسان کا جذبہ، نیت اور شوق ہی اس کے وسائل ہوتے ہیں اور الحمد للہ یہ سب چیزیں میرے پاس وافر موجود ہیں، جب چھوٹا تھا تو بڑے بڑے سفید کاغذ لے کر ان پر رنگین کتابوں سے پہاڑوں، دریاؤں کی تصاویر کاٹ کر چسپاں کیا کرتا تھا اور محلے کے بچوں اور دوستوں کو بتایا کرتا تھا کہ یہ دریائے ہنزہ کی تصویر ہے، یہ کے ٹو کی چوٹی ہے۔ یہ ہمالیہ پہاڑ ہے، یہ برف پوش چوٹیاں ہیں اور یہ درّہ خیبر ہے۔ ان چوٹیوں کے بارے میں معلومات میں اپنے اساتذہ اور والد صاحب سے حاصل کیا کرتا تھا اور اپنے ہم عمر بچوں تک تصاویر کی صورت میں ان تک پہنچایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایسا ہوا جب میں اپنی گلی کی ایک دیوار پر بڑا سا سفید چارٹ آویزاں کر کے ان پر چسپاں خوبصورت وادیوں کی تصاویر کے بارے میں اپنے ننھے دوستوں کو بتا رہا تھا، ایک شریر بچہ کہیں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس چارٹ کو بری طرح سے پھاڑ کر دوسری طرف نکل گیا، اس شریر لڑکے نے یہ سب کچھ اتنا اچانک اور خلاف توقع کیا کہ میں اور میرے سمیت گلی میں موجود بچے اسکا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے، مگر میں مسلسل کئی روز تک گم صم رہا حتیٰ کہ دو روز تک کھانا بھی نہ کھایا۔ مجھے یہ رنج نہیں تھا کہ وہ بچہ میرا بنایا ہوا خوبصورت وادیوں والا چارٹ پھاڑ کر کیوں چلا گیا بلکہ دکھ یہ تھا کہ اس بچے نے میرے وطن کے خوبصورت نظاروں والی تصاویر پھاڑ ڈالی تھی۔ اگرچہ میرے والد صاحب نے مجھے اس کے بدلے میں بازار میں شائع ہونے والی ایسی بہت سی رنگین کتابیں چارٹ و رسائل لا کر دیئے جس میں شمالی علاقہ جات، گلگت، سوات، مری، ایوبیہ، چترال اور دیگر سرسبز وادیوں کی بے شمار تصاویر تھیں، بلاشبہ والد صاحب کی لائی ان چیزوں سے مجھے بے حد خوشی ہوئی مگر اس کے باوجود ان تصاویر کے ضائع ہونے کا صدمہ میرے دل سے نہ گیا جو میں نے خود مختلف جگہوں سے تلاش کر کے سفید چارٹ پر چسپاں کی تھیں۔

Marfat.com

س: گویا آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی سیاحت کا شوق اپنا لیا تھا؟

ج: سیاحت کا شوق شاید بعد میں تھا مگر وطن کی محبت کا جذبہ پہلے کارفرما تھا، بات بھی سیدھی سی ہے اپل صاحب! کہ جس شخص کو وطن سے پیار نہیں ہوگا وہ اس کی وادیوں اور نظاروں سے پیار کیونکر کرے گا۔ میں پہلے محب وطن شہری ہوں اور بعد میں کچھ اور ہوں۔ میں ایک بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ کچھ لوگوں کو قلم صحافی بناتا ہے مگر میں اس ملک کے طفیل ایک معمولی سا مضمون نگار، فیچر رائیٹرز اور صحافی ہوں۔ میں نے کبھی کسی شخص یا شخصیت کی تعریف و توصیف میں کالم یا مضمون نہیں لکھا، میں نے جب بھی لکھا اپنے وطن کے خوبصورت نظاروں، سرسبز وادیوں، فلک بوس پہاڑوں، بہتے ہوئے دریاؤں اور آبشاروں پر لکھا، ذاتی طور پر میں پاکستان کے فطری حسن کا ترجمان ہوں اور جب تک میری زندگی ہے میں وطن کی وادیوں اور پربتوں کی شہزادیوں پر لکھتا رہوں گا۔

س: عارف محمود اپل صاحب! آپ نے اپنے جس جذبے کا اظہار کیا ہے، اس پر اسی نشست میں آگے چل کر بات ہوگی، پہلے آپ یہ بتایئے کہ باقاعدہ ذاتی طور پر Independent طریقے سے آپ نے کب قومی سیاحت کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں آپ کے تجربات و مشاہدات کیا رہے؟

ج: 1980ء سے میں نے باقاعدہ سیاحت کی ابتداء کی، جبکہ صحافت کو میں نے صرف سیر و سیاحت بارے لکھنے کی غرض سے اپنایا، کیونکہ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ یہ خطہ زمین جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے معدنی دولت کے ساتھ ساتھ اس قدر خوبصورت اور جنت نظیر نظاروں سے نوازا ہے کہ پوری دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے خود اس چیز کو پروموٹ نہیں کیا حالانکہ ٹورازم انڈسٹری سے ہم بھارت سے کہیں زیادہ زرمبادلہ کما سکتے ہیں، میرا تجزیہ ہے کہ اگر ہم شمالی علاقہ جات اور آزاد جموں و کشمیر کو باقاعدہ ٹورازم انڈسٹری کے طور پر پروموٹ کریں ان علاقوں میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کو جدید رہائشی اور سفری سہولتیں فراہم کرنے کے لئے سرمایہ کاری کریں تو یہ چیز کسی طرح بھی تیل کی دولت سے کم نہیں ہے۔ سعودی عرب، ایران اور عراق میں تیل کے کنوؤں کے ذخائر تو ممکن ہے کبھی ختم ہو جائیں مگر ہمارے شمالی علاقوں کی خوبصورتی میں ہر آنے والے دن میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں بڑی بات نہیں کر رہا آپ اسے لطیفہ بھی کہہ سکتے ہیں اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے بعض جاننے والے اور دوست احباب مجھے چلتی پھرتی ٹورازم کارپوریشن کہتے ہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ اپنے ملک کے سیاحتی مقامات کو پروموٹ کرنے کے لئے سرکاری اداروں کی نگرانی میں جو کام ہونا چاہیے وہ تعاون نہیں ہوا اور تو اور کبھی ٹورازم والوں

Marfat.com

نے قومی سطح کے صحافیوں کو ان علاقوں کا مطالعاتی ٹور کروانے کا اہتمام بھی نہیں کیا کیونکہ ذاتی طور پر یہ اس قدر مہنگا شوق ہے کہ عام آدمی خواہش کے باوجود اس کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ہمت کے ساتھ ساتھ مالی استعداد بھی دی، میں پاکستان کا واحد شخص ہوں جس نے ان علاقوں اور یہاں کے باسیوں کے مسائل اور مشکلات جاننے کے لئے اب تک اس مقصد کے لئے بہت سارو پیہ اور وقت کی قربانی دی ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ میں صرف اپنے مضامین میں ان وادیوں کے فطری حسن بارے میں نہیں لکھتا بلکہ ان علاقوں کے مکینوں کی تہذیب و ثقافت اور دلچسپ رسوم ورواج پر بھی قلم اٹھاتا ہوں اور اکثر اپنے مضامین اور کالموں میں حکومت کو تجاویز بھی پیش کرتا رہتا ہوں کہ وہ ان علاقوں کے مکینوں کی معاشی اور اقتصادی حالت میں سدھار لانے، انہیں روزگار کے ساتھ ساتھ صحت، تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے اقدامات کرے جو کہ ہمارے فطری نظاروں کے امین ہیں، شمالی علاقوں کی خوبصورتی میں جن کا خون شامل ہے۔

س: آپ نے ان علاقوں اور وہاں کے مکینوں کو بڑے قریب سے دیکھا اور مشاہدہ بھی کیا، یقیناً آپ ان سے ملے بھی ہوں گے، ان کی مشکلات اور مسائل بارے بھی آگاہی حاصل کی ہوگی؟

ج: جی ہاں! اس سلسلے میں میرے بڑے دلچسپ مشاہدات و واقعات ہیں، جب میں نے اس کام کی ابتداء کی تو آتش جواں تھا، میں خود بھی سیاحتی مقامات کا ایک منظر بن جایا کرتا تھا مثلاً میں اکثر بغیر سوچے سمجھے دریا کے وسط میں اندر تک چلا جایا کرتا تھا ایک بار تو ڈوبتے ڈوبتے بچا تھا، جھیل سیف الملوک میں جتنی بار دیکھتا ہوں مجھے پہلے سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان علاقوں میں جب بھی اپنی ذاتی گاڑی یا ٹیکسی پر جایا کرتا تھا تو راستے میں اپنے ساتھ بیٹھے ڈرائیور کو ان علاقوں کی خوبصورتی اور جغرافیائی حدود واربعہ کے طور پر بتاتا جاتا تھا۔ خاص طور پر بالاکوٹ، کیوائی، شوگراں اور کاغان میرے بہت ہی پسندیدہ مقامات ہیں، اسی طرح ان علاقوں میں جب مجھے پہاڑی مقامات پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہاں کے مکینوں کو اپنا دوست بنا لیا کرتا تھا ، اسی طرح مجھے ان سے ان کے رہن سہن اور طرز زندگی کے بارے میں وافر معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔

س: سیاحتی مقامات دیکھنے کی حد تک تو درست ہیں مگر سیاحت کو صحافت کا روپ دینا ایک نیا پہلو ہے۔ دنیا میں لاکھوں سیاح ہیں مگر ہر سیاح مضمون نگار نہیں جبکہ صحافت اور سیاحت کو آپ نے ایک ساتھ رکھا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ سب سے پہلے آپ کو اس بارے میں کب اور کیسے لکھنے کا خیال آیا اور آپ نے کیا لکھا؟

ج: ہوا یوں کہ ایک روز ہفتہ وار چھٹی تھی، میں بازار گیا تو پرانی کتابوں کی دکان پر اچانک پی آئی اے کے زیر اہتمام چھپنے والا میگزین ''ہمسفر'' میرے ہاتھ لگا، میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں کسی کا

Marfat.com

لکھا ہوا ایک مضمون ''چترال'' کے بارے میں تھا۔ میں نے جب اس مضمون کا مطالعہ کیا تو مجھے اس مضمون نے کوئی خاص متاثر نہ کیا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ ان علاقوں کا میں جس قدر وسیع مشاہدہ کر چکا ہوں اگر میں ''وادی چترال'' پر مضمون لکھنے بیٹھتا تو اس مضمون سے کہیں اچھا لکھ سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں کراچی سے اخبار ''جسارت'' نکلا کرتا تھا، جس پر میں ہر منگل کے روز ''منظر پاکستان'' کے نام سے ایک صفحہ شائع ہوا کرتا تھا، میں نے بھی ''منظر پاکستان'' ایڈیشن کے لئے ''چترال'' کے بارے میں مضمون لکھ کر بھجوا دیا۔ اس کے بعد تو میرے مضامین باقاعدگی سے روزنامہ جسارت کے منظر پاکستان ایڈیشن میں شائع ہونے لگے۔ یہ سلسلہ تقریباً 6 ماہ تک جاری رہا۔ ان مضامین کی اشاعت سے میری اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں نے دوسرے قومی اخبارات میں بھی سیر و سیاحت کے بارے میں اپنے مضامین بھجوانے کا سلسلہ شروع کیا، چونکہ لکھنے کی مشق نہیں تھی اس لئے اکثر اخبارات میں جب میرے بھجوائے ہوئے مضامین شائع نہ ہوتے تو اس قدر غصہ آتا جی چاہتا کہ میں خودکشی کرلوں یہ جو بیان سے باہر ہے، میں سوچتا ہوں بڑی عجیب بات ہے کہ وطن عزیز کی خوبصورتی بیان کرنے کے لئے اخبارات کے پاس جگہ نہیں ہے۔ مگر چونکہ سچی لگن، شوق اور جذبہ ٹھیک تھا لہٰذا صحافتی دنیا میں کچھ ایسے دوست بھی ملے جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور میرا قلم تیزی سے چلنے لگا۔

س: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گزشتہ بیس سالوں میں آپ پاکستان کے سیاحتی مقامات پر کتنے مضامین اور فیچرز وغیرہ لکھ چکے ہیں؟

ج: مجھے صحیح تعداد یاد نہیں مگر یہ 4800 سے کہیں زیادہ ہیں، زیادہ تر مضامین جن اخبارات میں شائع ہوئے ان میں روزنامہ نوائے وقت، خبریں، پاکستان، دن، انصاف، ایکسپریس، جرأت، اذکار، ہفت روزہ فیملی میگزین، ہفت روزہ ایشیا، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکستان ٹائمز، پندرہ روزہ سائبان، ماہنامہ پاک جمہوریت شامل ہیں۔ مجھے گھر والوں نے اکثر کہا کہ عارف یہ کوئی شوق نہیں ہے، تم محض پیسے ضائع کر رہے ہو مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں مگر سیاحت کرنا اور سیاحت پر لکھنا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کام سے مجھے قلبی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسکردو، سوات، کیلاش اور ناران بھی فطری حسن کے حوالے سے میرے پسندیدہ مقامات ہیں، میں سال میں اب بھی کم از کم تین مرتبہ ان جگہوں پر ضرور جاتا ہوں اور جب بھی جاتا ہوں وہاں مجھے قدرت کے نئے نظارے اور نئے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرے پاس سیاحتی مقامات کی 30 ہزار سے زائد تصاویر ہیں، میں آپ کو دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ ان علاقوں میں سیاحت کے دوران میری ملاقاتیں غیر ملکی سیاحوں سے بھی ہوئیں جن میں جاپان اور ویسٹ جرمنی کے سیاح بھی

Marfat.com

شامل تھے۔ سیاحوں میں غیر ملکی خواتین بھی تھیں، خاص طور پر ایک جاپانی ڈائریکٹر تو میرا قریبی دوست بن گیا تھا، اس نے میرے بہت سے مضامین لئے اور مجھے کہا کہ وہ اپنے ملک جا کر ان مضامین کا ترجمہ شائع کرے گا ، اسی نے مجھے بتایا کہ میرے مضامین اسے اسی لئے اچھے لگے ہیں میں نے ان میں قدرتی حسن کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

س: اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ بڑی خوبصورت وادیاں ہیں مگر ان خوبصورت وادیوں کے پیچھے وہاں کے مکینوں کے بڑے گھمبیر مسائل ہیں، وہاں بھوک، غربت، افلاس اور بیماری ہے، کیا آپ نے ان مسائل کی طرف حکومتوں کی توجہ دلائی ہے ؟

ج: آپ کا سوال واقعی بڑا اہم اور غور طلب ہے۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ ان علاقوں میں انسانی مسائل کے انبار ہیں، خاص طور پر کالام، گبرال، اوشو اور دیگر علاقوں میں جب کوئی مریض بیمار ہو جائے یا اسے ہسپتال لے جانا مقصود ہو تو بڑی دردناک صورتحال سامنے آتی ہے۔ اکثر ایسے مریض یا ڈلیوری کے کیس کی صورت میں بعض اوقات اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا انسانی مسئلہ یہاں پر میٹرنٹی ہومز کا ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے ناتجربہ کار دائیاں بچہ جنتی ہیں اور اکثر اوقات زچہ و بچہ دونوں ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح غربت و افلاس کا یہ عالم ہے کہ قدرتی اور معدنی دولت سے مالا مال ان علاقوں کے مکین آج بھی گڑ اور پیاز سے روٹی کھانے پر مجبور ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہاں کی ثقافت امیر ہے اور لوگ غریب ہیں، میں نے اکثر اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ خوبصورت وادیوں کے خوبصورت لوگوں کی زندگی کی ترقی اور خوشحالی کے لئے حکومت کو خاطر خواہ انتظامات کرنے چاہیے۔ غیر ملکی سیاح جب ان جنت نظیر وادیوں کے مکینوں کی زندگی دوزخ سے بھی بدتر دیکھتے ہیں تو وہ بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا حکومت وقت ان لوگوں کی ترقی و خوشحالی کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ اسی طرح سے غیر ملکی سیاح جہاں ایک طرف پاکستان کے خوبصورت اور فطری حسن کے نظاروں اور دلکش مناظر کی یادیں اپنے نظر و قلب میں محفوظ کر کے جاتے ہیں، وہاں وہ ان علاقوں کے باسیوں کی حالت زار کی تصویر بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں جس کے باعث بیرونی دنیا میں ہماری بدنامی ہوتی ہے۔

یہاں میں ایک دردناک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا کہ ایسی ہی ایک خوبصورت وادی میں صبح کے وقت گھر کے آٹھ، دس افراد اپنی جھونپڑی کے باہر ایک رکابی میں صرف ایک عدد روٹی لے کر بیٹھے تھے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان بیچاروں نے صرف ایک روٹی سے ناشتہ کرنا تھا، اگرچہ روٹی عام روٹیوں سے ذرا

Marfat.com

بڑی تھی مگر پھر بھی ان افرادِ خانہ کے حصے میں ایک یا دو نوالے آنے تھے۔ یہ منظر ایک غیر ملکی سیاح بھی دیکھ رہا تھا اور اپنے کیمرے کی آنکھ میں اسے محفوظ کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا مگر اس سے پیشتر کہ وہ اپنی کاروائی کرتا میں نے اسے بڑے احترام کے ساتھ بڑے مہذب طریقے سے تصویر بنانے سے روک دیا، کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ تصویر بیرونی دنیا میں پاکستان کے عوام کی غربت اور مفلسی کا اشتہار بن جاتی۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ عام آدمی ان علاقوں میں جانے سے گھبراتا ہے، اتنی بڑی کھائیاں ہوتی ہیں کہ بس میں بیٹھے آدمی کا انہیں دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔ آپ کے کیا تجربات و مشاہدات ہیں؟

ج: آپ نے بالکل درست کہا، وہاں تو واقعی قدم قدم پر موت کی صورت نظر آتی ہے۔ میری بڑی بیٹی اقراء اکثر کہتی ہے کہ پاپا! آپ یہاں انجوائے کرتے ہیں مگر ہماری گاڑی جب چھوٹی سی پگڈنڈی سے گزرتی ہے تو دائیں بائیں گہری کھائیاں دیکھ کر ہماری نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔

ایک بار جب میں اسے اپنے ساتھ قراقرم لے گیا تو وہ باقاعدہ رونے لگی اور اس نے تہیہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی ادھر نہیں آئے گی، ایک اور دلچسپ واقعہ سناتا چلوں کہ ایوبیا اور نتھیا گلی میں بندر بہت زیادہ ہوتے ہیں، وہاں آنے والے لوگ ان بندروں کو پھل اور بھٹے وغیرہ کھلاتے ہیں، یہ بندر اس قدر مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر عام آدمی کو خوف آتا ہے۔ میرے بیٹے ارسلان نے ضد کی کہ وہ بندر کے ساتھ تصویر بنوائے گا۔ میں نے ارسلان کو ایک بھٹہ دیا کہ تم بندر کی طرف اسے بڑھانا میں تمہاری تصویر اتارلوں گا مگر جب بندر نے ارسلان کے ہاتھ سے چھلی لینا چاہی تو ارسلان نے چھلی ہاتھ سے نہ چھوڑی جس کی وجہ سے بندر اس قدر طیش میں آ گیا کہ وہ میرے بیٹے کو اٹھا کر پندرہ بیس فٹ گہری کھائی میں لے گیا۔ اس نے اسے تھوڑا بہت زخمی بھی کیا تاہم میں نے بڑی مشکل سے اس بندر سے اپنے بیٹے کی جان بچائی۔ سو! کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سیرو سیاحت میں اس قسم کے واقعات تو ایک معمول کی بات ہے۔

س: کچھ لوگ آپ کو صحافی، فیچر نگار اور بعض آپ کو قومی سیاح کا درجہ دیتے ہیں، آپ کیا کہلوانا پسند کرتے ہیں ؟

ج: میں بنیادی طور پر ایک صحافی اور قلمکار ہوں، دنیا میں سیاح تو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے ہیں جو مسلسل سیاحت کرتے ہیں مگر اپنی یادداشتوں اور مشاہدات کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھتے، جبکہ میرے قومی اخبارات میں ہزاروں کی تعداد میں مضامین، فیچر اور رپورٹس شائع ہو چکی ہیں

Marfat.com

Marfat.com

کتاب میں پاکستان کی صحافتی تاریخ کے سوالوں کا مدلل جواب موجود ہے

خبر قبیلہ

حصہ اول

دنیائے صحافت کے 20 شہسوار اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں

ناشر سکندر بلوچ القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

Marfat.com